کلیات آثار فرزاد

کُلیاتِ احمد فراز

کُلیاتِ احمد فراز

احمد فراز

ماورا پبلشرز۔ ۳ بہاولپور روڈ۔ لاہور

باذوق لوگوں کے لیے

ھماری کتابیں

خوبصورت کتابیں

تزئین واہتمام اشاعت

خالد شریف

ماورا

ضابطہ

ناشر : خالد شریف

مطبع : امپریس — لاہور

قیمت : -/۲۵۰ روپے

MASOOD FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 027837
★ MAILSI ★

TECHNICAL SUPPORT BY
CHUGHTAI
PUBLIC LIBRARY

تنہا تنہا

احمد فراز

ماورا پبلشرز
۳ بہاولپور روڈ
لاہور

تنہا تنہا

احمد فراز

ضیاءُ الدّین ضیاء

کے نام

ہاں۔ مگر کوئی تمنّا، پسِ داماں وفا

مجھ سے پوشیدہ، مرے پیشِ نظر ہوتی ہے

(ضیاء)

ولسة في الأولية
[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

به زیرِ شاخِ گُل اُفعی گزیده بُلبل را
نواگران نه خورده گزند را چه خبر

(نظیری)

جب روح کسی بوجھ سے تھک جاتی ہے
احساس کی لَو اور بھڑک جاتی ہے
میں بڑھتا ہوں زندگی کی جانب لیکن
زنجیر سی پاؤں میں چھنک جاتی ہے

ترتیب

شاعر

جس آگ سے جی آج جل اُٹھا ہے اچانک
پہلے بھی مرے سینے میں بیدار ہُوئی تھی
جس کرب کی شدّت سے مری رُوح ہے بے کل
پہلے بھی مرے ذہن سے دوچار ہُوئی تھی
جس سوچ سے ہیں آج لہو تھوک رہا ہوں
پہلے بھی مرے حق میں یہ تلوار ہُوئی تھی

وہ غم — غمِ دنیا جسے کہتا ہے زمانہ
وہ غم مجھے جس غم سے سروکار نہیں تھا
وہ درد کہ ہر دَور کے انسان نے جھیلا
وہ درد مرے عشق کا معیارؔ نہیں تھا
وہ زخم کہ ہر سینے کا ناسُور بنا ہے
وہ زخم مجھے باعثِ آزار نہیں تھا

دُنیا نے تڑپ کر مرے شانوں کو جھنجھوڑا
لیکن مرا احساس غمِ ذات میں گم تھا
آتی رہیں کانوں میں المناک پکاریں
لیکن مرا دل اپنے ہی حالات میں گم تھا
میں وقت سے بیگانہ زمانے سے بہت دور
جام و مے و مینا و خرابات میں گم تھا

دربار کی تفریح کا ساماں تھا مرا فن
ہاتھوں میں مرے ظرفِ گدا لب پہ غزل تھی
شاہوں کی ہوا خواہی مرا ذوقِ سخن تھا
ایوانوں کی توصیف و ثنا اوجِ عمل تھی
اور اس کے عوض لعل و جواہر مجھے ملتے
ورنہ مرا انعام فقط تیغِ اجل تھی

2015

چھیڑے کبھی میں نے لب و رخسار کے قصّے
گاہے گل و بلبل کی حکایت کو نکھارا
گاہے کسی شہزادے کے افسانے سُنائے
گاہے کیا دنیائے پرستاں کا نظارا
میں کھویا رہا جنّ و ملائک کے جہاں میں
ہر لحظہ اگرچہ مجھے آدم نے پکارا

برسوں یونہی دلجمعیٔ اورنگ کی خاطر
سو پھول کھلائے کبھی سو زخم خریدے
میں لکھتا رہا ہجو بغاوت منشوں کی
میں پڑھتا رہا قصر نشینوں کے قصیدے
اُبھرا بھی اگر دل میں کوئی جذبۂ سرکش
اس خوف سے چپ تھا کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے

لیکن یہ طلسمات بھی تا دیر نہ رہ پائے
آخر مے و مینا و دف و چنگ بھی ٹوٹے

یوں دست و گریباں ہُوئے انسان و خداوند
نخچیر تو تڑپے قفسِ رنگ بھی ٹوٹے

اس کشمکشِ ذرّہ و انجم کی فضا میں
کشکول تو کیا افسر و اورنگ بھی ٹوٹے

میں دیکھ رہا تھا کہ مرے یاروں نے بڑھ کر
قاتل کو پکارا کبھی مقتل میں صدا دی

گاہے رسن و دار کے آغوش میں جھُولے
گاہے حرم و دیر کی بُنیاد ہلا دی

جس آگ سے بھرپُور تھا ماحول کا سینہ
وہ آگ مرے لوح و قلم کو بھی پلا دی

اور آج شکستہ ہُوا ہر طوقِ طلائی
اب فن مرا دربار کی جاگیر نہیں ہے
اب میرا ہُنر ہے مرے جمہور کی دولت
اب میرا جنوں خائفِ تعزیر نہیں ہے
اب دل پہ جو گزرے گی وہ بے ٹوک کہوں گا
اب میرے قلم میں کوئی زنجیر نہیں ہے

رباعی

لفظوں میں فسانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
لمحوں میں زمانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
تو زہر ہی دے شراب کہہ کر ساقی
جینے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ

غزل

تیری باتیں ہی سنانے آئے
دوست بھی دل ہی دکھانے آئے

پھول کھلتے ہیں تو ہم سوچتے ہیں
تیرے آنے کے زمانے آئے

ایسی کچھ چپ سی لگی ہے جیسے
ہم تجھے حال سنانے آئے

عشق تنہا ہے سرِ منزلِ غم
کون یہ بوجھ اُٹھانے آئے

اجنبی دوست ہمیں دیکھ کہ ہم
کچھ تجھے یاد دلانے آئے

دل دھڑکتا ہے سفر کے ہنگام
کاش پھر کوئی بُلانے آئے

اب تو رونے سے بھی دل دکھتا ہے
شاید اب ہوش ٹھکانے آئے

کیا کہیں پھر کوئی بستی اُجڑی
لوگ کیوں جشن منانے آئے

سو رہو موت کے پہلو میں فراز
نیند کس وقت نہ جانے آئے

غزل

جن کے دم سے تھیں بستیاں آباد
آج وہ لوگ ہیں کہاں آباد

جل رہے ہیں ہرے بھرے گلزار
غم ہُوا ہے کہاں کہاں آباد

کہہ رہی ہے شکستگی دل کی
تھا مکینوں سے یہ مکاں آباد

ہم نے دیکھی ہے گوشۂ دل میں
ایک دنیائے بے کراں آباد

چند منظر اُجاڑنے والو
ہو رہے ہیں کئی جہاں آباد

گھر جلا کر نہ رو محبّت میں
یہ تو ہوتا ہے خانماں آباد

کتنے تارے فرازؔ ٹوٹ چکے
ہے ابھی تک یہ خاکداں آباد

کھنڈر

عبث کیوں اُلٹتے پلٹتے ہو جھوٹی روایات کی عظمتوں کے کھنڈر
یہاں کچھ نہیں ہے
یہاں تم نہ پاؤ گے کوئی خزانہ
نہ شداد کی جنّت گمشدہ کا کوئی لعل و در سے جڑا آستانہ
نہ فرعون کا کوئی خفیہ خزینہ
نہ قاروں کا کوئی دفینہ
نہ جمشید کے جام و مینا
نہ نمرود کے باغ آغوش کی چہچہاتی ہوئی کوئی الھڑ حسینہ
یہاں کچھ نہ ڈھونڈو
یہاں کچھ نہیں ہے

یہاں خشک و ویران خطّوں میں
مدّت سے خانہ بر انداز عفریت چاروں طرف خیمہ زن ہیں
یہاں سالہا سال سے قرن ہا قرن سے
وحشت انگیز اوہام سایہ فگن ہیں

یہاں بے شمار اُلّوؤں کے بسیرے ہیں چمگادڑوں کے ٹھکانے ہیں اور
گیدڑوں نے کئی غار کھودے ہُوئے ہیں
جو دن کے دھندلکوں میں شب کی سیاہی میں آسیب صورت
کبھی ایک اک اور کبھی سب کے سب مل کے یوں چیختے ہیں
کہ جیسے بنی نوعِ انساں کی تخریب پر نوحہ گر ہوں

یہاں کوئی تپتی ہُوئی دوپہر ہو کہ سرما کی تاریک و مفلوج شب ہو
کبھی کوئی ابرِ خراماں نہ برسا نہ چھایا
یہاں کوئی شعلہ نہ بھڑکا نہ کوئی چراغِ سحر ٹمٹمایا
کہ جیسے ہمیشہ پرافشاں رہا ہو یہاں اجنبیت کا گھمبیر سایہ
کہ اس سرزمیں کی فضا میں خلا میں کبھی بھی کوئی بھی تغیّر نہ آیا
مگر یہ کھنڈر

روزِ اوّل سے ہی
پتھّروں اور اینٹوں کے انبار ہائے پریشاں نہیں تھے
فقط ادھ کٹے بُت شکستہ ستوں ٹوٹے پھوٹے ظروف
اور جھکے بام و در یونہی سر در گریباں نہیں تھے
یہاں صرف ویرانیوں کے مناظر ہی تاریخ ماضی کے عنواں نہیں تھے

یہ وہ سرزمیں ہے
کہ جس پر زمرّد کے یاقوت کے تخت جلوہ فگن تھے
یہاں سنگِ سرخ اور مرمر کے بے مثل و نادر محلّات
گلکاریوں سے مرصع تھے معراجِ فن تھے
یہاں بے بہا اور نایاب قالین فرشِ رہِ کاخِ فرمانروائے زمن تھے
یہاں ریشم و اطلس و پرنیاں اور دیبا و زربفت و سنجاب و کمخواب
کے بے نظیر اور عریاں ذخیرے شکن در شکن تھے
یہاں لہلہاتے ہوئے گلستاں رشکِ باغِ عدن تھے
یہاں سونے چاندی کے ڈھیروں میں لعل و جواہر ہیں
تلتی کنیزوں کے گلرنگ چہرے فضا تاب سینے سنہرے بدن تھے
اور ان کی حفاظت کو چوبی صلیبیں تھیں زندانِ آہن تھے دار و رسن تھے

یہاں کاس و قیتار کی گرم تانوں سے جام و سبو کے فسانوں سے
عیش و نشاط و مسرّت کے جشنِ چراغاں منائے گئے ہیں
یہاں خوش گلو اپسراؤں کے ہر تارِ گیسو سے تزئین بربط روا تھی
یہاں زندگی صرف زخمِ نوا تھی!!
یہاں با ادب باسلیقہ غلاموں نے سجدے کیے اور ثبوتِ وفا کے لیے
گردنیں تک کٹا دیں
مگر رحم دل اور کشادہ دل آقاؤں کی عدل و انصاف سے
جگمگاتی جبینوں پہ کوئی شکن تک نہ آئی

بہ ایں حال بھی مطمئن تھی خدائی
مگر وقت کی پے بہ پے کروٹوں نے کئی گُل کھلائے
کبھی تو ہلاکو و چنگیز و تیمور نے بربریّت کے پرچم اُٹھائے
کبھی تو رماں اور نادر کی جرّار فوجوں نے یلغار کی شہر لوٹے جلائے
تباہی کے دف صورِ محشر کی صورت ہر اک سمت بھونچال لائے
بگولوں کے دامن میں امن وسکوں کے درخشندہ فانوس جلنے نہ پائے
اور اپنی روایات کے تلخ و تیرہ دھوئیں چھوڑ کر بجھ گئے مرٹ گئے ہیں
یہ کہنہ روایات جن کی گھنی ظلمتوں میں نہ جادہ نہ منزل
غبارِ رواں کی طرح چھا رہی ہیں
دلوں کو دماغوں کو نظروں کو بھٹکا رہی ہیں
اور ان کی جلو میں نہ لیلا نہ محمل
نہ جذبِ تجسّس کا حاصل
یہاں کچھ نہیں کچھ نہیں ہے
فقط کچھ کھنڈر ابنِ آدم کی تاریخ پر منفعل ہیں

غزل

کچھ ایسے ہم نے خرابے بسائے شہروں میں
جو دشت والے تھے وہ بھی اُٹھ آئے شہروں میں

ہماری سادہ دلی دیکھیے کہ ڈھونڈتے ہیں
ہم اپنے دیس کی باتیں پُرانے شہروں میں

کچھ اس طرح سے ہر اک بام و در کو دیکھتے ہیں
زمانے بعد کوئی جیسے آئے شہروں میں

سُنا ہے جب بھی لُٹی ہے بہارِ ویرانہ
تو چند اور چمن مسکرائے شہروں میں

قدم قدم پہ ہوئے تلخ تجربے پھر بھی
ہمیں حیات کے غم کھینچ لائے شہروں میں

ہوا نہ دو کہ یہ جنگل کی آگ ہے یارو
عجب نہیں ہے اگر پھیل جائے شہروں میں

فرازؔ ہم وہ غزالانِ دشت و صحرا ہیں
اسیر کر کے جنھیں لوگ لائے شہروں میں

بھُول

افق پر دھندلکے، شفق میں الاؤ، گھٹاؤں میں شعلے، چمن میں ببول
بہاروں پہ صرصر کے گھمبیر سائے
نظاروں کے دامن میں نکہت بسائے
دلوں پر اُداسی دماغوں میں الجھن خیالوں میں تلخی نگاہیں ملول
ہر اک سمت ویرانیوں کا نزول

جلاتا رہا میں اندھیروں میں شمعیں کھلاتا رہا خارزاروں میں پھول
شعاعوں سے تاریکیوں کو اُجالے
خرابوں پہ تعمیر کا عکس ڈالے
بڑے زخم کھا کر مگر مسکرا کر کیے زندگی نے حوادث قبول
اڑاتی پھری دشت و صحرا کی دھول

وہی وقت کی سست رفتار گردش وہی مدت کی رہگزاروں کا طول
وہی چار سو دہکے دہکے الاؤ
وہی گلستاں میں خزاں کا رچاؤ
وہی چاند تاروں پہ کہنہ دھندلکے وہی ظلمتوں کا پرانا اصول
مگر کون سمجھے یہ کس کی تھی بھُول؟

رباعی

اک راہِ طویل اک کڑی ہے یارو
افتاد عجیب آ پڑی ہے یارو
کس سمت چلیں کدھر نہ جائیں آخر
دوراہے پہ زندگی کھڑی ہے یارو

———— ⁂ ————

غنچے کی چٹک سنائی دے گی یارو
ساغر کی کھنک سنائی دے گی یارو
زنداں کا سکوت گونج اُٹھے گا جس سے
ایسی دستک سُنائی دے گی یارو

فرار

کئی ایاغ دل میں آنسوؤں کے بیج بو گئے
شرابِ لالہ گوں کے عکس عکس میں
جہانِ رنگ و بوُ لیے
فریبِ آرزو دیے
گھنیری آندھیوں کے رقص رقص میں
کئی چراغ ظلمتوں کی وادیوں میں کھو گئے

بچھے رہے سراب گام گام پہ
جمالِ ضو فشاں لیے
مآلِ خونچکاں لیے
حیات کے ہر اک نئے مقام پر
ہزاروں داغ مسکرا دیے چراغ ہو گئے

مگر چلے ہو کس کی جستجو میں تم
وفا کی روشنی سے لیے
ہر ایک چاک دل سیئے
تصوّرِ حصولِ آرزو میں تم
کئی دماغ موت کی کمیں گہوں میں سو گئے

غزل

دوست جب ٹھہرے چمن کے دشمنِ جانِ بہار
زخم دکھلائیں کسے پھر سینہ چاکانِ بہار

نشۂ احساسِ خوش وقتی نے اندھا کر دیا
برق بھی چمکی تو ہم سمجھے چراغانِ بہار

خون رلواتے ہیں سب کو اپنے اپنے تجربے
وہ پشیمانِ خزاں ہوں یا پشیمانِ بہار

اب کے کچھ ایسی ہی بن آئی کہ ہم معذور ہیں
ورنہ کب پھیرا تھا ہم نے کوئی فرمانِ بہار

اے خوشا عہدِ خزاں جب نغمہ پیرائی تو تھی
اب تو سرمہ در گلو ہیں خوشنوایانِ بہار

گر یونہی بادِ صبا اٹھکیلیاں کرتی پھری
شعلۂ گل سے بھڑک اُٹھے گا دامانِ بہار

کب ہوئے دل تنگ ہم زنداں میں گو ہو کر فراز
ہاں مگر جب آ گئی ہے یادِ یارانِ بہار

تنہا تنہا
۳۱

احتساب

سوچ مفلوج ہے حالات کے زندانوں میں
عقل پر تلخ حوادث کے گراں تالے ہیں
آگہی سرد و خموش
منجمد شعلۂ ہوش
ذہن پر بھولے فسانوں کے گھنے جالے ہیں
کوئی آہٹ بھی نہیں دل کے سیہ خانوں میں
قہقہے وقت کے خوش رنگ شبستانوں میں
کتنی دلدوز و غمیں آہوں کے رکھوالے ہیں
آرزو جام طرب
آبرو زہر بلب

کتنے ہی ناگ خزانوں نے یہاں پالے ہیں
کتنے پیکر ہیں جو ڈھل جاتے ہیں ایوانوں میں
زندگی رینگتی ہے موت کے ویرانوں میں
انقلابات نے انداز بدل ڈالے ہیں

رات دن شام و سحر
کس کو جرأت ہو مگر

ناگ خود ہی تو خزانوں نے یہاں پالے ہیں
آگ پھولوں نے بکھیری ہے گلستانوں میں

غزل

ہر ایک دل کو طلب ہر نظر سوالی ہے
کہ شہرِ حسن میں جلووں کی قحط سالی ہے

کہاں ہے دوست کہ آشوبِ دہر سے میں نے
ترے خیال کی آسودگی بچالی ہے

بتا رہا ہے فضا کا اٹوٹ سنّاٹا
افق سے پھر کوئی آندھی اُترنے والی ہے

لرز رہے ہیں شگوفے چمن میں کھلتے ہُوئے
حنائے دستِ صبا میں لہو کی لالی ہے

پیئو شراب کہ ناصح نے زہر بھی دے کر
ہماری جرأتِ رندانہ آزما لی ہے

پھر آج دانۂ گندم کے سلسلے میں فراز
کسی خدا نے میری خلد بیچ ڈالی ہے

غزل

ہر شاخ چمن کی جل رہی ہے
کیا بادِ مراد چل رہی ہے

ہم ہیں کہ فریب کھا رہے ہیں
دنیا ہے کہ چال چل رہی ہے

یوں دل میں ہے تیری یاد جیسے
ویرانے میں آگ جل رہی ہے

رُخ پھیر لیا ہے جب سے تُو نے
دنیا کی نظر بدل رہی ہے

درپیش ہے آج بھی وہ صورت
جو صورتِ حال کل رہی ہے

اتنی بھی فراز بددلی کیا
سنبھلو! کہ فضا بدل رہی ہے

آگ

مفلسو! اپنے مقدر سے شکایت نہ کرو
اس سے انسان کے ایمان میں فرق آتا ہے
ہم تو ناچیز سے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے
کتنے گمراہ و گنہگار ہوئے جاتے ہو

کیا کہا؟ "خانماں برباد ہوتے جاتے ہیں
دمبدم آگ کے بے رحم لپکتے شعلے
اپنے بوسیدہ مکاں راکھ کیے دیتے ہیں
خاک ہی خاک ہوئی جاتی ہے دنیا اپنی
اور اس آتش و ظلمات کے سیلاب میں بھی
مرمر و آہن و سیماں کی عماراتِ بلند
اسی پندار اسی شان سے استادہ ہیں
کیا خدا صرف غریبوں پہ ستم ڈھاتا ہے"

ٹھیک کہتے ہو مگر خام عقائد والو
ہم تو تقدیر کے بندے ہیں ہمیں کیا معلوم
کونسی بات میں کیا مصلحتِ یزداں ہے
اور پھر اپنی شکایت سے بھی کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

رباعی

پھولوں کی جبیں جھلس گئی ہے یارو
گلزار میں آگ بس گئی ہے یارو
گزرے ہیں کہاں سے رنگ و بُو کے طوفاں
شبنم کو فضا ترس گئی ہے یارو

اُڑتے پنچھی شکار کرنے والو
گلزار میں گیر و دار کرنے والو
کتنی کلیاں مَسل کے رکھ دیں تم نے
تزئینِ گل و بہار کرنے والو

بانوؔ کے نام ٭

ملوکیّت کے محل کی گناہگار کنیز

وہ جرم کیا تھا کہ تجھ کو سزائے مرگ ملی

وہ راز کیا تھا کہ تعزیرِ ناروا کے خلاف

تیری نگاہ نہ بھڑکی تری زباں نہ ہلی

وہ کونسا تھا گناہِ عظیم جس کے سبب

ہر ایک جبر کو تُو سہہ گئی بطیبِ دلی

یہی سُنا ہے بس اتنا قصور تھا تیرا

کہ تُو نے قصر کے کچھ تلخ بھید جانے تھے

تری نظر نے وہ خلوتکدوں کے داغ گنے

جو خواجگی کو زر و سیم میں چھپانے تھے

تجھے یہ علم نہیں تھا کہ اس خطا کی سزا

ہزار طوق و سلاسل تھے تازیانے تھے

٭ وہ کمسن کنیز جسے بیگم جوناگڑھ نے قتل کروایا

یہ رسم تازہ نہیں ہے اگر تری لغزش
مزاجِ قصر نشیناں کو ناگوار ہوئی
ہمیشہ اونچے محلات کے بھرم کے لیے
ہر ایک دَور میں تزئینِ طوق و دار ہوئی
کبھی چُنی گئی دیوار میں انار کلی
کبھی شکنتلا پتھراؤ کا شکار ہوئی

مگر یہ تخت یہ سلطاں یہ بیگمات یہ قصر
مؤرخین کی نظروں میں بیگناہ رہے
بغیضِ وقت اگر کوئی راز کھُل بھی گیا
زمانے والے طرفدارِ کج کلاہ رہے
ستم کی آگ میں جلتے رہے عوام مگر
جہاں پناہ ہمیشہ جہاں پناہ رہے

مجسّمہ

اے سیہ فام حسینہ ترا عریاں پیکر
کتنی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں غلطیدہ ہے
جانے کس دورِ المناک سے لے کر اب تک
تو کڑے وقت کے زندانوں میں خوابیدہ ہے

تیرے شب رنگ ہیولے کے یہ بے جان نقوش
جیسے مربوط خیالات کے تانے بانے
یہ تری سانولی رنگت یہ پریشان خطوط
بارہا جیسے مٹایا ہو انھیں دنیا نے

ریشۂ سنگ سے کھینچی ہوئی زلفیں جیسے
راستے سینۂ کہسار پہ بل کھاتے ہیں
ابروؤں کی جھکی محرابوں میں جامد پلکیں
جس طرح تیر کمانوں میں الجھ جاتے ہیں

منجمد ہونٹوں پہ سنّاٹوں کا سنگین طلسم
جیسے نایاب خزانوں پہ کڑے پہرے ہوں
تند جذبات سے بھرپور برہنہ سینہ
جیسے سستانے کو طوفان ذرا ٹھہرے ہوں

جیسے یونان کے مغرور خداوندوں نے
ریگزارانِ حبش کی کسی شہزادی کو
تشنہ روحوں کے ہوسناک تعیّش کے لیے
حجلۂ سنگ میں پابند بنا رکھا ہو

غزل

نشۂ گیسوئے شب تاب کہاں
آنکھ کھل جائے تو پھر خواب کہاں

جی جلاتے ہیں سحر کے جھونکے
کھو گیا چشمۂ مہتاب کہاں

شہر سنسان ہے صحرا کی طرح
اب وہ ہنگامۂ احباب کہاں

سطحِ دریا تو ہے ہموار مگر
بستیاں ہو گئیں غرقاب کہاں

تلخئ سم ہے لبوں کے مَس تک
کوئی پی جائے تو زہراب کہاں

عشق اک کوہِ گراں تھا پہلے
اب محبّت کے وہ آداب کہاں

اب کہاں اہلِ وفا ملتے ہیں
پہلے ہم لوگ بھی تھے نایاب کہاں
اب تو دھڑکن سے بھی جی رُکتا ہے
اب یہ دل پارۂ سیماب کہاں

ق

ہم بھی کرتے تھے چراغانِ بہار
لیکن اب آنکھوں میں خوناب کہاں

ہم کو بھی لذّتِ غم تھی پیاری
لیکن اب جی میں تب و تاب کہاں

اب بھی پایاب نہیں موجۂ غم
پھر بھی اندیشۂ سیلاب کہاں

غزل

کیا رخصتِ یار کی گھڑی تھی
ہنستی ہوئی رات رو پڑی تھی

ہم خود ہی ہوئے تباہ ورنہ
دنیا کو ہماری کیا پڑی تھی

یہ زخم ہیں اُن دنوں کی یادیں
جب آپ سے دوستی بڑی تھی

جاتے تو کدھر کو تیرے وحشی
زنجیرِ جنوں کڑی پڑی تھی

دریوزہ گرِ حیات بن کر
دنیا تری راہ میں کھڑی تھی

غم تھے کہ فراز آندھیاں تھیں
دل تھا کہ فراز پنکھڑی تھی

مسیحا

میری افسردگی سے پریشان نہ ہو
تو مری تلخیوں کا سبب تو نہیں
تیری آنکھیں تو میری ہی دمساز ہیں
تھیں کبھی اجنبی لیکن اب تو نہیں
تجھ کو میری مسرت مقدم سہی
تیرا غم مجھ کو وجہِ طرب تو نہیں

تیرا احسان ہے تو نے میرے لیے
اپنی پلکوں سے راہوں کے کانٹے چُنے
خود کڑی دھوپ میں رہ کے میرے لیے
تُو نے زلفوں کے شاداب سائے بُنے
میری خاطر زمانے کو پاگل کہا
میری خاطر زمانے کے طعنے سُنے

تو مری زندگی ہے مگر جانِ من!
اب وہ عشق و محبّت کی رسمیں نہیں
میرے دل میں کئی گھاؤ ایسے بھی ہیں
جن کا درماں تری دسترس میں نہیں
ایک غم جس کی شدّت ہمہ گیر ہے
تیرے بس میں نہیں میرے بس میں نہیں

تشنگی

دیکھو پگھلا پگھلا سونا بہہ نکلا کہساروں سے
دیکھو نازک نازک کرنیں ٹوٹ رہی ہیں ٹیلوں پر
دیکھو بھینی بھینی خوشبو آتی ہے گلزاروں سے
دیکھو نیلے نیلے بادل جھول رہے ہیں جھیلوں پر
تم بھی سندر سندر سپنوں کی لہروں پر بہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو — اور ذرا رہ جاؤ

سلگا سلگا موسم ہے شعلوں کی دہکتی حدت سے
چڑھتے سورج کے سائے میں ساری دنیا جلتی ہے
دہک دہک اُٹھی ہیں سڑکیں تپتی دھوپ کی شدّت سے
ابھی نہ جاؤ دیکھو کتنی تیزی سے لُو چلتی ہے
اس کو بھی اک جبرِ مشیّت سمجھو اور سہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو — اور ذرا رہ جاؤ

دیکھو چار طرف ٹھنڈے ٹھنڈے سائے لہرائے ہیں
تارے نکھرے موتی بکھرے شام کا جادو قائم ہے
غنک غنک پھولوں کے جھونکے خوشبوئیں برساتے ہیں
ٹھیک ہے تم کو جانا ہے پر ایسا بھی کیا لازم ہے
ٹھہرو کچھ باتیں ہم سے سُن لو کچھ تم کہہ جاؤ
اور ذرا کچھ لمحے ٹھہرو — اور ذرا رہ جاؤ

غزل

گوارا ابھی سہی جو دکھ ترے ہیں
مگر ہم کو کئی غم دوسرے ہیں

عجب اہلِ چمن کے دن پھرے ہیں
بہاروں کے بگولوں میں گھرے ہیں

وطن میں وضعداری نے نہ چھوڑا
پرائے شہر ہم در در پھرے ہیں

سمائے پھر نہ دنیا کی نظر میں
نہ جانے کس بلندی سے گرے ہیں

غنیمت ہے جو ہنس کر بات کر لیں
ہمیں مت چھیڑیے ہم سر پھرے ہیں

جو دنیا کے ہوئے وہ سخت روئے
خوشا وہ لوگ جو اب تک ترے ہیں

ابھی سے کیا حدیثِ قعرِ دریا
ابھی تو موجِ ساحل میں گھرے ہیں

فرازؔ آج اتفاقاً مل گئے تھے
یہ صاحب بھی تو دیوانے ترے ہیں

غزل

اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں
ترے فراق کے دُکھ یاد آنے لگتے ہیں

ہمیں ستم کا گلہ کیا، کہ یہ جہاں والے
کبھی کبھی ترا دل بھی دکھانے لگتے ہیں

سفینے چھوڑ کے ساحل چلے تو ہیں لیکن
یہ دیکھنا ہے کہ اب کس ٹھکانے لگتے ہیں

پلک جھپکتے ہی دنیا اُجاڑ دیتی ہے
وہ بستیاں جنھیں بستے زمانے لگتے ہیں

فرازؔ ملتے ہیں غم بھی نصیب والوں کو
ہر اک کے ہاتھ کہاں یہ خزانے لگتے ہیں

غزل

کس کو گماں ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے
ہائے وہ روز و شب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

یادش بخیر عہدِ گزشتہ کی صحبتیں
اک دور تھا عجب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

بے مہریٔ حیات کی شدت کے باوجود
دل مطمئن تھا جب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

میں اور تقابلِ غمِ دوراں کا حوصلہ
کچھ بن گیا سبب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

اک خواب ہو گئی ہے رہ و رسمِ دوستی
اک وہم سا ہے اب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

وہ بزمِ دوست یاد تو ہو گی تمہیں فراز
وہ محفلِ طرب کہ مرے ساتھ تم بھی تھے

رباعی

یہ دَورِ مے و جام چلے یا نہ چلے
نشّے سے بھی پھر کام چلے یا نہ چلے
ہم اہلِ خرابات سے یوں بَیر نہ رکھ
ساقی ترا کل نام چلے یا نہ چلے

یہ پھیلی ہوئی رات ڈھلے یا نہ ڈھلے
یہ یورشِ حالات ٹلے یا نہ ٹلے
روشن کر چراغِ دیر و کعبہ
پھر شمعِ خرابات جلے یا نہ جلے

غزل

رات کے پچھلے پہر رونے کے عادی روئے
آپ آئے بھی مگر رونے کے عادی روئے

اُن کے آجانے سے کچھ تھم سے گئے تھے آنسو
اُن کے جاتے ہی مگر رونے کے عادی روئے

ہائے پابندیٔ آداب تری محفل کی
کہ سرِ راہگزر رونے کے عادی روئے

ایک تقریبِ تبسّم تھی بہاراں لیکن
پھر بھی آنکھیں ہوئیں تر رونے کے عادی روئے

درد مندوں کو کہیں بھی تو قرار آ نہ سکا
کوئی صحرا ہو کہ گھر رونے کے عادی روئے

اے فراز ایسے میں برسات کٹے گی کیونکر
گر یونہی شام و سحر رونے کے عادی روئے

غزل

ان کے وعدوں پہ یقیں، لوگ بھی دیوانے ہیں
اک فقط میں ہی نہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

میری وحشت ہی سہی موردِ الزام مگر
اے مری زہرہ جبیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

گردشِ جام کہاں، گردشِ ایّام کہاں
یہ خرابات نشیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

آپ تو حاصلِ ایمانِ دو عالم ہیں حضور
آپ اور دشمنِ دیں لوگ بھی دیوانے ہیں

اک ملاقات سرِ رہ بھی سہی جرم مگر
ہم کہیں آپ کہیں، لوگ بھی دیوانے ہیں

دردمندانِ محبّت تو ہیں بدنام فراز
ورنہ کچھ کچھ یہ حسیں لوگ بھی دیوانے ہیں

ایبٹ آباد

ابھی تلک ہے نظر میں وہ شہر سبزہ و گل
جہاں گھٹائیں سرِ رہگزار جھومتی ہیں
جہاں ستارے اُترتے ہیں جگنوؤں کی طرح
جہاں پہاڑوں کی قوسین فلک کو چومتی ہیں
تمام رات جہاں چاندنی کی خوشبوئیں
چنار و سرو کی پرچھائیوں میں گھومتی ہیں

ابھی تلک ہیں نظر کے نگار خانے میں
وہ برگِ گل سے تراشے ہوئے بہشت سے جسم
وہ بولتے ہوئے افسانے الف لیلیٰ کے
وہ رنگ و نور کے پیکر وہ زندگی کے طلسم
اور ایسی کتنی ہی رعنائیاں ہیں جن کے لیے
خیال و فکر کی دنیا میں کوئی نام نہ اِسم

ابھی تلک ہیں تصوّر میں وہ در و دیوار
بسیط دامنِ کہسار میں چناروں تلے
جہاں کسی کی جواں زلف بار ہا بکھری
جہاں دھڑکتے ہوئے دل محبّتوں میں ڈھلے
عجیب تھی وہ جھروکوں کی نیم تاریکی
جہاں نظر سے نظر جب ملی چراغ جلے

میں لوٹ آیا ہوں اس شہرِ سبزہ و گل سے
مگر حیات انھیں ساعتوں پہ مرتی ہے
مجھے یقیں ہے گھنے بادلوں کے سائے میں
وہ زلف اب بھی مری یاد میں بکھرتی ہے
چراغ بجھ بھی چکے ہیں مگر پسِ چلمن
وہ آنکھ اب بھی مرا انتظار کرتی ہے

غزل

تم زمانہ آشنا تم سے زمانہ آشنا
اور ہم اپنے لیے بھی اجنبی نا آشنا

راستے بھر کی رفاقت بھی بہت ہے جانِ من
ورنہ منزل پر پہنچ کر کون کس کا آشنا

اب کے ایسی آندھیاں اُٹھیں کہ سورج بجھ گئے
ہائے وہ شمعیں کہ جھونکوں سے بھی تھیں نا آشنا

مدّتیں گزریں اسی بستی میں لیکن اب تلک
لوگ نا واقف، فضا بیگانہ، ہم نا آشنا

ہم بھرے شہروں میں بھی تنہا ہیں جانے کس طرح
لوگ ویرانوں میں کر لیتے ہیں پیدا آشنا

خلق شبنم کے لیے دامن کشا صحراؤں میں
کیا خبر ابرِ کرم ہے صرف دریا آشنا

اپنی بربادی پہ کتنے خوش تھے ہم لیکن فرازؔ
دوست دشمن کا نکل آیا ہے اپنا آشنا

غزل

ہم بھی خود دشمنِ جاں تھے پہلے
تم مگر دوست کہاں تھے پہلے

اب وہاں خاک اُڑاتی ہے خزاں
پھول ہی پھول جہاں تھے پہلے

اب جو دیوار بنے بیٹھے ہیں
صورتِ موجِ رواں تھے پہلے

کچھ شرابی کہ ہیں اب راہ نشیں
رونقِ بزمِ مغاں تھے پہلے

ہم کہ ہیں آج غبارِ پسِ رو
منزل ہم سفراں تھے پہلے

اب کسے وضعِ محبّت کا خیال
اور ہی لوگ یہاں تھے پہلے

اب تو خود پر بھی نہیں زعمِ وفا
تجھ سے ہم شکوہ کناں تھے پہلے

بن گیا قافلہ چلتے چلتے
ورنہ تنہا ہی رواں تھے پہلے

دولتِ غم تو میسّر تھی فراز
اتنے مفلس بھی کہاں تھے پہلے

طلسمِ ہوش ربا

ابھی اک پھول کے دامن سے کوئی بھنورا اُڑا
اور اُڑتے ہی اُجالے میں کہیں ڈوب گیا
ابھی اک شاخ کے سائے سے سرکتا ہُوا سانپ
پاس بہتے ہُوے نالے میں کہیں ڈوب گیا

گنگناتے ہُوے نالے کا سنہرا پانی
دیکھتے دیکھتے اک جھیل بنا نہر بنا
یوں اُبھر آئے کناروں پہ دمکتے ایواں
ایک اُجڑے ہُوے خطے میں نیا شہر بنا

یہ نیلوں میں گھرا راج محل کس کا ہے
یہ پُر اسرار در و بام انوکھے فانوس
بربط و چنگ و خم و جام لیے دست بدست
منتظر کس کا ہے یہ زہرہ جبینوں کا جلوس

میں شہنشاہِ زمن ہوں کسے معلوم نہیں
ہر طرف موجبِ تعمیل ہیں فرمان مرے
میرے ادنیٰ سے اشارے پہ ہیں سب رقص کناں
یہ سپاہی - یہ حسینائیں - یہ دربان مرے

کوئی ہے! کون؟ زرینہ فطر افروز کنیز
جیسے مینائے مے ناب دھری ہو کوئی
یہ پریشان سی زلفیں یہ برہنہ سینہ
جس طرح قاف کی آوارہ پری ہو کوئی

خادمہ! آج سے اس قصر کی تو ملکہ ہے
آ مجھے اپنی گرہ گیر لٹوں میں کس لے
آ مرے جسم سے اک سانپ کی مانند لپٹ
اور تڑپ کر مرے بیتاب لبوں کو ڈس لے

غزل

سکوتِ شب ہی ستم ہو تو ہم اٹھائیں بھی
وہ یاد آئے تو چلنے لگیں ہوائیں بھی

یہ شہر میرے لیے اجنبی نہ تھا لیکن
تمہارے ساتھ بدلتی گئیں فضائیں بھی

جو بزمِ دوست سے اُٹھ کر چلے بزعمِ تمام
کوئی پکارے تو شاید وہ لوٹ آئیں بھی

دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مٹتا ہے
یہ خود فریب ترا شہر چھوڑ جائیں بھی

ہم ایسے لوگ جو آشوبِ دہر میں بھی ہیں خوش
عجب نہیں ہے اگر تجھ کو بھول جائیں بھی

سحر گزیدہ ستاروں کا نور بجھنے لگا
فرازؔ اُٹھو اب اس کی گلی سے جائیں بھی

غزل

وہ قول وہ سب قرار ٹوٹے
دل جن سے مآلِ کار ٹوٹے

ہو ختم کشاکشِ زمانہ
یا دامِ خیالِ یار ٹوٹے

پھر تجھ پہ یقین کر رہے ہیں
وہ دل جو ہزار بار ٹوٹے

کھائیں گے فریب ہم خوشی سے
پر یوں کہ نہ اعتبار ٹوٹے

وہ پچھلا پہر شبِ الم کا
آنسو بھی ستارہ وار ٹوٹے

کیا چھوڑتے یاد دوستوں کی
وہ تیر، جو دل کے پار ٹوٹے

کانپ اُٹھے فرازؔ دونوں عالم
جب سازِ وفا کے تار ٹوٹے

غزل

انکار نہ اقرار بڑی دیر سے چپ ہیں
کیا بات ہے سرکار بڑی دیر سے چپ ہیں

آسان نہ کر دی ہو کہیں موت نے مشکل
روتے ہوئے بیمار بڑی دیر سے چپ ہیں

اب کوئی اشارہ ہے نہ پیغام نہ آہٹ
بام و در و دیوار بڑی دیر سے چپ ہیں

ساقی یہ خموشی بھی تو کچھ غور طلب ہے
ساقی ترے میخوار بڑی دیر سے چپ ہیں

یہ برق نشیمن پہ گری تھی کہ قفس پر
مرغانِ گرفتار بڑی دیر سے چپ ہیں

اس شہر میں ہر جنس بنی یوسفِ کنعاں
بازار کے بازار بڑی دیر سے چپ ہیں

پھر نعرۂ مستانہ فراز آؤ لگائیں
اہلِ رسن و دار بڑی دیر سے چُپ ہیں

خریدار

دلِ بیتاب کی موہوم سی تسکیں کے لیے
اک نظر دیکھنے آیا تھا تجھے دیکھ لیا
آج کی رات بھی تو اپنے دریچے کے قریب
حسبِ معمول نئی شان سے استادہ ہے
"تیرتے ہیں تری آنکھوں میں اشارے کیا کیا"
دیدنی ہے ترے جلووں کی نمائش لیکن
اب یہ عالم ہے کہ احساسِ تہی دستی سے
تیرے زینے کی طرف تیرے دریچے کی طرف
پاؤں تو کیا مری نظریں بھی نہیں اُٹھ سکتیں!

رباعی

خوابوں میں خیال کھو رہے ہوں جیسے
نشے میں زمانے سو رہے ہوں جیسے
سینے سے ڈھلک گیا ہے کس کا آنچل
خورشید طلوع ہو رہے ہوں جیسے

ساغر میں ستارے گھل رہے ہوں جیسے
کرنوں کے دریچے کھل رہے ہوں جیسے
مستی میں وہ اُٹھتی ہوئی نظریں توبہ
پلکوں پہ زمانے تُل رہے ہوں جیسے

خیر مقدم

قصیدہ نویسوں نے مل کر یہ سوچا
کہ پھر آج وہ ساعتِ جانستاں آگئی ہے
جب ان سے کوئی ان کا آقا جُدا ہو رہا ہے
وہ آقا؟
کہ جس کی مسلسل کرم گستری سے
کوئی خادم خاص ہو یا کہ ادنیٰ ملازم
کسی کے لبوں پر کبھی کوئی حرفِ شکایت نہ آیا
وہ آقا کہ جس کی کشادہ دلی نے خزانے لٹائے
وہ آقا کہ جس کی سخاوت نے سب کے دلوں اور دماغوں
سے حاتم کے مفروضہ قصّے بھلائے
اگرچہ وہ نوشیرواں کی طرح شہر میں کو بکو
بھیس بدلے نہیں گھومتا تھا

مگر پھر بھی ہر سمت امن و اماں تھا
اگرچہ جہانگیر کی طرح اس نے
کوئی ایسی زنجیرِ زر قصرِ شاہی کے باہر نہ لٹکائی تھی
جس کی ہلکی سی جنبش بھی انصافِ شاہی میں طوفاں اُٹھاتی
مگر پھر بھی ہر گھر پہ عدل و مساوات کا سائباں تھا
اگرچہ کبھی وہ جھروکے میں بیٹھے
رعایا کو رُوئے مبارک کے درشن سے مجبور سجدہ نہ کرتا
مگر پھر بھی ہر دل پہ وہ حکمراں تھا
وہ جانِ جہاں تھا
بڑا مہرباں تھا
قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ آخر وہ لمحات بھی آ گئے ہیں
جب اُن سے بچھڑنے کو ہے ان کا دیرینہ آقا
تو وہ آج اسے کونسا ایسا نایاب تحفہ کریں پیش جس سے
رہیں تا ابد یاد آقائے عالی کو
اپنے وفادار رو پا پوش بردار خادم

قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ یوں تو عہد سے میں ہیں
قصرِ شاہی کے جاروب کش سے بھی کہتر
مگر عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں
وہ چاہیں تو اپنے قلم کے اشارے سے
ذرّوں کو ہم رتبۂ مہر و ماہتاب کر دیں
وہ چاہیں تو ا تخیّل کے جادو سے
صحراؤں کے خشک سینوں کو پھولوں سے بھر دیں
وہ چاہیں تو اپنے تخیّل کے جادو سے
فقیروں کو اورنگ و افسر کا مالک بنا دیں
وہ چاہیں تو اپنے فسونِ زباں سے
محلّات کے بام و دیوار ڈھا دیں
وہ چاہیں تو خسرو کا سر تیشۂ کوہکن سے کچل دیں
وہ چاہیں تو یکسر نظامِ زمانہ بدل دیں
کہ وہ عالمِ کلک و قرطاس کے بادشہ ہیں
یہی ہے وہ ساعت کہ وہ اپنے

محبوب آقا کی تعریف و توصیف میں
آسماں و زمیں کو رلائیں !
کہ وہ اپنی اپنی طبیعت کے جوہر دکھائیں
کہ وہ اپنے آقا سے بس آخری مرتبہ داد پائیں
مگر پھر قصیدہ نویسوں نے سوچا
کہ وہ تو ہیں عہدے ہیں ایوانِ شاہی
کے جاروب کش سے بھی کہتر
انھیں کیا کوئی آئے یا کوئی جائے
کہ ان کا فریضہ تو ہے صرف
آقائے حاضر کی خدمت گزاری
کہ ان کا فریضہ فقط تاج اور تخت کی ہے پرستش
تو پھر مصلحت ہے اسی میں
کہ اپنے قصیدوں سے آقائے نو کا کریں خیر مقدم !

اے بھوکی مخلوق

(چودہ اگست ۱۹۵۴ء)

آج تری آزادی کی ہے ساتویں سالگرہ
چار طرف جگمگ جگمگ کرتی ہے شہر پٹنہ
پھر بھی تیری روح بجھی ہے اور تقدیر سیہ

پھر بھی ہیں پاؤں میں زنجیریں ہاتھوں میں کشکول
کل بھی تجھ کو حکم تھا آزادی کے بول نہ بول
آج بھی تیرے سینے پر ہے غیروں کی بندوق
اے بھوکی مخلوق

بیس نہ سو نہ ہزار نہ لاکھ ہیں پورے آٹھ کروڑ
اتنے انسانوں پر لیکن چند افراد کا زور
مزدور اور کسان کے حق پر جھپٹیں کالے چور
کھیت تو سونا اُگلیں پھر بھی ہے ناپید اناج
تیرے دیس میں سب کچھ اور تو غیروں کی محتاج
گوداموں کے پیٹ بھرے ہیں بوجھل ہیں صندوق
اے بھوکی مخلوق

آج گرفتہ دل تو کیوں ہے تو بھی جشن منا
آنسو گر نایاب ہیں اپنے لہو کے دیے جلا
پیٹ پہ پتّھر باندھ کے امشب ننگا ناچ دکھا
آج تو ہنسی خوشی کا دن ہے آج یہ کیسا سوگ
تیری بہاریں دیکھنے آئیں دور دور کے لوگ
تیرے خزانے پل پل لوٹیں کتنے ہی فاروق
اے بھوکی مخلوق

غزل

قافلے گزرے ہیں زنجیر بہ پا
دائم آباد رہے شہر ترا

دل ہے یا شہرِ خموشاں کوئی
نہ کوئی چاپ نہ دھڑکن نہ صدا

آخرِ عشق کی رسوائی ہے
اب ہُوا چرچا تو گھر گھر ہو گا

تجھ کو دیکھا ہے تو اب سوچتے ہیں
تجھ سے ملنے کا سبب کیا ہو گا

وہم تھا قافلۂ ہمسفراں!
مڑ کے دیکھا تو کوئی ساتھ نہ تھا

شبِ تیرہ ہی غنیمت تھی فرازؔ
چاند نکلا ہے تو دل ڈوب چلا

رباعی

ہر غم کو دلآویز کیے دیتا ہوں
احساس کی لو تیز کیے دیتا ہوں
تو زلف کو کچھ اور پریشاں کر دے
میں جام کو لبریز کیے دیتا ہوں

دل گرمیٔ احساس سے پھک جائیں گے
قدموں میں ترے زمانے جھک جائیں گے
اے حسن فقط جنبشِ ابرو کی ہے دیر
دنیا کے کاروبار رک جائیں گے

غزل

قاتل کے قصّے مقتل کی باتیں ہیں
آج کی محفل میں بھی کل کی باتیں ہیں

دیوانوں پر اک اک لمحہ بھاری ہے
ہوش کی باتیں کتنی ہلکی باتیں ہیں

تنگ قبائے، کج کلہے، زرّیں کمرے
اس کافر میں ساری غزل کی باتیں ہیں

اپنی تہی دستی پر میں شرمندہ ہوں
تیرے لبوں پر تاج محل کی باتیں ہیں

عقل کے اندھوں کی محفل میں چپ ہے فراز
کتنی سیانی اس پاگل کی باتیں ہیں

چند نادان چند دیوانے

رات کی جانگداز ظلمت میں
عزم کی مشعلیں جلائے ہُوئے
دل میں لے کر بغاوتوں کے شرار
وحشتوں کے مہیب سائے میں
سر بکف، جاں بلب، نگاہ بہ قصر
سرخ و خونیں علم اٹھائے ہُوئے
بڑھ رہے ہیں جنوں کے عالم میں
چند نادان چند دیوانے

قصرِ شاہی کے اے نگہبانو!
تلخ لمحوں سے ہوشیار رہو
اپنے پہروں پہ جم* کے ڈٹ جاؤ
اپنے آقاؤں کی بقا کے لیے
فرض کے تند و تیز دھارے پر
تم وفادار ہو تو کٹ جاؤ

اس سے پہلے کہ مہرباں آقا
تند شعلوں کی زد میں آ جائیں
اس سے پہلے کہ قصر جل اٹھے
خاک پر لوٹتے نظر آئیں
چند نادان، چند دیوانے

غزل

کس قدر آگ برستی ہے یہاں
خلق شبنم کو ترستی ہے یہاں

صرف اندیشۂ افعی ہی نہیں
پھول کی شاخ بھی ڈستی ہے یہاں

رُخ کدھر موڑ گیا ہے دریا
اب نہ وہ لوگ نہ بستی ہے یہاں

زندہ در گور ہوئے اہلِ نظر
کس قدر مردہ پرستی ہے یہاں

زیست وہ جنسِ گراں ہے کہ فراز
موت کے دام بھی سستی ہے یہاں

غزل

ہر ہمسفر ہے آبلہ پا دیکھتے رہو
یارو پلٹ پلٹ کے ذرا دیکھتے رہو

کس کس کو اپنی اپنی رفاقت پہ زعم ہے
ہوتا ہے کون کون جدا دیکھتے رہو

ہر فصلِ گُل ہے غیر یقینی سی ان دنوں
صرصر چلے کہ بادِ صبا دیکھتے رہو

سنتے رہو کہ وقت نے بدلی ہے راگنی
دم بھر میں انقلاب ہوا دیکھتے رہو

تھا کل تو ایک نعرۂ منصور بھی گراں
اور اب کہ سینکڑوں ہیں خدا دیکھتے رہو

یا رو پلک جھپکتے ہی لٹتے ہیں قافلے
یاں خودکشی ہے لغزشِ پا دیکھتے رہو

احباب کوئے دار و رسن تک پہنچ گئے
اور تم فرازؔ دستِ صبا دیکھتے رہو

غزل

کٹھن ہے راہگزر تھوڑی دور ساتھ چلو
بہت کڑا ہے سفر تھوڑی دور ساتھ چلو

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے
یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ چلو

نشے میں چور ہوں میں بھی تمھیں بھی ہوش نہیں
بڑا مزہ ہو اگر تھوڑی دور ساتھ چلو

یہ ایک شب کی ملاقات بھی غنیمت ہے
کسے ہے کل کی خبر تھوڑی دور ساتھ چلو

ابھی تو جاگ رہے ہیں چراغ راہوں کے
ابھی ہے دور سحر تھوڑی دور ساتھ چلو

طوافِ منزلِ جاناں ہمیں بھی کرنا ہے
فرازؔ تم بھی اگر تھوڑی دور ساتھ چلو

لختئی*

ادھ کٹے بالوں پہ افشاں کے ستارے لرزاں
کھردرے گالوں پہ غازے کی تہیں ہانپتی ہیں
سرد و بے جان سے چہرے پہ بھٹکتی آنکھیں
جیسے مرگھٹ میں چراغوں کی لویں کانپتی ہیں

ٹوٹتے جسم میں لہرانے کی ناکام اُمنگ
کسی سُوکھی ہُوئی ٹہنی کا جھکاؤ جیسے
لڑکھڑاتے ہُوئے قدموں کی گراں رفتاری
خشک ہوتی ہُوئی ندی کا بہاؤ جیسے

---

* سرحد کے وہ رقاص لڑکے جو بیاہ شادیوں اور خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر عورتوں کا روپ بنا کر ناچتے ہیں۔

رقص کرتی ہوُئی پشواز پہ باہوں کی اُڑان
بادباں جس طرح گرداب میں چکراتے ہیں
یا کسی جھیل میں کنکر کے گرا دینے سے
چند لمحوں کے لیے دائرے بن جاتے ہیں

گرد آلود سے ماتھے پہ پسینے کی نمی
ریگزاروں سے عرق پھوٹ رہا ہو جیسے
جھنجھناتے ہوُئے ہر گام پہ پیلے گھنگرو
دور اک شیش محل ٹوٹ رہا ہو جیسے

زندگی بال فشاں، خاک بہ رُخ، نالہ بلب
منجمد، ساکن و حیران ہیولے کی طرح
چند تانبے کے تراشے ہوُئے سکوں کے عوض
ڈھول کی تھاپ پہ رقصاں ہے بگولے کی طرح

ایک منظر

دور کچھ ماتمی نعروں سے فضا گونج اٹھی
چند مجذوب سے لوگوں کا الم کوش گروہ
(کچھ سیہ پوش تماشائی بہ اندازِ جلوس)
چادرِ گل سے سجائے ہوئے اعلام لیے!
دمبدم نیند میں ڈوبے ہوئے کوچوں کی طرف
چیختا پیٹتا بڑھتا ہی چلا جاتا ہے

یک بیک کھلنے لگے بند دریچوں کے کواڑ
چلمنیں کانپتی باہوں کے سہارے اٹھیں
جیسے دم توڑتے بیمار کی بوجھل پلکیں
اور کئی مضطر و بے تاب دمکتے چہرے
ایک دلچسپ و المناک تماشے کے لیے
تنگ و تاریک جھروکوں کے گھنے پردوں سے
نور کے چشموں کی مانند اُبل آئے ہیں

رباعی

ظلمات کو موجِ نور کیسے سمجھیں
پھر برق کو برقِ طور کیسے سمجھیں
مانا کہ یہی مصلحت اندیشی ہے
ہم لوگ مگر حضور کیسے سمجھیں

آشوب گہہِ دہر کے سوداگر ہیں
مغرب کے کسی شہر کے سوداگر ہیں
تم آبِ حیات مانگتے ہو ان سے
جو لوگ فقط زہر کے سوداگر ہیں

غزل

اس ادا سے کبھی آ کر گزرو
دل کے صحرا کو بسا کر گزرو

سنگِ خارا ہے زمانے کی نظر
دل کے آئینے بچا کر گزرو

روشنی رہبرِ رہزن بھی تو ہے
راہیو! شمعیں بجھا کر گزرو

کون جانے کہ یہ پتھّر ہیں کہ لوگ
دشتِ غربت میں صدا کر گزرو

کوئی کانٹا ہو کہ شبنم ہو کہ پھول
سب کو آنکھوں سے لگا کر گزرو

سفرِ شوق ہو یا منزلِ غم
کوئی ہنگامہ اُٹھا کر گزرو

چڑھتے سورج کے پجاری نہ بنو
اپنے سائے میں سما کر گزرو

وقت نے ساتھ دیا ہے کس کا
جی میں جو آئے سدا کر گزرو

پہلے دیوانوں کی رسمیں تھیں یہی
خون کانٹوں کو پلا کر گزرو

ایک پل ٹھہرو بگولوں کی طرح
اور پھر خاک اُڑا کر گزرو

یا تو موجوں کے شناسا نہ بنو
یا کناروں کو بہا کر گزرو

دل عجب شہر ہے ہنگاموں کا
کبھی اس سمت بھی آ کر گزرو

توسنِ وقت کی رفتار کے ساتھ
برق کے پنکھ لگا کر گزرو

فکر و ادراک کے درّوں میں فرازؔ
مشعلِ طبع جلا کر گزرو

غزل

دل جو کہتا ہے چلو کر دیکھو
کسی بے درد کے ہو کر دیکھو

لذّتِ غم بھی عجب نشّہ ہے
دوست کی یاد میں رو کر دیکھو

زندگی سلسلۂ خوابِ طرب
سایۂ زلف میں سو کر دیکھو

کتنی تسکین ہے احساس کی موت
کبھی دیوانہ تو ہو کر دیکھو

کتنا دلکش ہے جہانِ گزراں
دل کے آئینے کو دھو کر دیکھو

ماہ و انجم بھی تھے آباد کبھی
ان خرابوں سے بھی ہو کر دیکھو

ریشۂ گل میں بھی ہے موجۂ خوں
خار کی نوک چبھو کر دیکھو

اوس کی بوند بھی ہے شیش نگر
آنکھ اشکوں سے بھگو کر دیکھو

ذرّے ذرّے میں ہے آباد جہاں
خود کو ہر شے میں سمو کر دیکھو

شب کے سنّاٹوں میں وہ بات کہاں
دن کے ہنگاموں میں کھو کر دیکھو

تم بگولوں کے خداوند سہی
آتشِ گل تو فرو کر دیکھو

جو دیے لے کے نکلتے ہیں فراز
وہ بھی کھا جاتے ہیں ٹھوکر دیکھو

منسوبہ سے

تو نے دیکھا ہی نہیں مجھ کو تجھے کیا معلوم
وقت نے آج کسے سونپ دیا ہے تجھ کو
کس کے دامن سے ہے باندھا گیا پلّو تیرا
کس سے تقدیر نے وابستہ کیا ہے تجھ کو

تیرے ہونٹوں پہ تو ہیں شرم و حیا کی مہریں
تیرے ماں باپ نے کیوں نرخ ترا بول دیا
کالے بازار میں نیلام اٹھا کر تیرا
سبز باغوں کے تصوّر پہ تجھے تول دیا

جو سجائی گئی فردوس نمائش کے لیے
وہ کسی اور کی تعمیر ہے میری تو نہیں
یہ مکانات، یہ جندرے، یہ دکانیں، یہ زمیں
میرے اجداد کی جاگیر ہے میری تو نہیں

میں تو آوارہ سا شاعر ہوں مری کیا وقعت
ایک دو گیت پریشان سے گا لیتا ہوں
گاہے گاہے کسی ناکام شرابی کی طرح
ایک دو زہر کے ساغر بھی چڑھا لیتا ہوں

تو کہ اک وادیٔ گلرنگ کی شہزادی ہے
دیکھ بے کار سے انساں کے لیے وقف نہ ہو
تیرے خوابوں کے جزیروں میں بڑی رونق ہے
ایک انجان سے طوفاں کے لیے وقف نہ ہو

سوچ ابھی وقت ہے حالات بدل سکتے ہیں
ورنہ اس رشتۂ بے ربط پہ پچھتائے گی
توڑ ان کہنہ رسومات کے بندھن ورنہ
جیتے جی موت کے زنداں میں اتر جائے گی

غزل

جب بھی دل کھول کے روئے ہوں گے
لوگ آرام سے سوئے ہوں گے

بعض اوقات بہ مجبوریٔ دل
ہم تو کیا آپ بھی روئے ہوں گے

صبح تک دستِ صبا نے کیا کیا
پھول کانٹوں میں پروئے ہوں گے

وہ سفینے جنھیں طوفاں نہ ملے
ناخداؤں نے ڈبوئے ہوں گے

رات بھر ہنستے ہوئے تاروں نے
ان کے عارض بھی بھگوئے ہوں گے

کیا عجب ہے وہ ملے بھی ہوں فراز
ہم کسی دھیان میں کھوئے ہوں گے

معذرت

(ایک دوست کی شادی پر)

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی نظم لکھوں
جس کے الفاظ میں پازیب کی جھنکاریں ہوں
جس کے ہر بند میں رقصاں ہوں بہاریں نغمے
جس کے شعروں میں خیابانوں کی مہکاریں ہیں

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی گیت کہوں
جس کی تشبیہوں میں ہنستے ہوئے پیمانے ہوں
جس کے انداز پہ طاری ہو شرابوں کا نشہ
جس کے مفہوم میں افسانے ہی افسانے ہوں

میں نے چاہا تری شادی پہ کوئی سہرا لکھوں
جس کی ہر لے سے کسی گیت ہم آہنگ رہیں
جس سے جاگ اُٹھیں مغنّی کی سُریلی تانیں
جس میں افکار کی ترتیب کے سب رنگ رہیں

لیکن اس وقت مرے ذہن کے ہر پردے میں
چند سلگی ہوئی آہوں کے سوا کچھ بھی نہیں
میری سانسوں میں ہیں مغموم دلوں کی چیخیں
جن کی قسمت میں کراہوں کے سوا کچھ بھی نہیں

جن کی شادی بھی غم و رنج کا مجموعہ ہے
جن کو حاصل نہیں ہوتا کسی لمحہ بھی فراغ
جن کو ماں باپ سے ملتے ہیں مصائب کے جہیز
جن کی باراتوں میں جل اُٹھتے ہیں اشکوں کے چراغ

ایسے حالات میں کیا چیز تجھے نذر کروں
یہ حقائق مجھے مجبور کیے دیتے ہیں
میرے شاہد* مرے اخلاص سے مایوس نہ ہو
چند صدمے مجھے معذور کیے دیتے ہیں

* دولہا دوست

رباعی

یا اپنے رفیقانِ سفر سے کٹ جاؤ
یا سیلِ حوادث کے مقابل ڈٹ جاؤ
رستے کا غبار کیوں بنے ہو چھٹ جاؤ
جب بڑھ نہیں سکتے تو پرے ہٹ جاؤ

ہر زخم کو سینے پہ سجا لیتے ہیں
ہر درد کو ہم دل میں بسا لیتے ہیں
تم پھولوں پہ سوتے ہو تو دکھتا ہے بدن
ہم کانٹوں کو آنکھوں سے لگا لیتے ہیں

غزل

اُداس اور زیادہ کہیں نہ ہو جائیں
فرازؔ انجمنِ دوست سے چلو جائیں

نہ اجنبی نہ مسافر نہ شہر والے ہیں
کوئی پکارو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں

جو صدمے ہم پہ گزرنے ہیں وہ تو گزریں گے
مگر یہ آپ کو غم کیوں ہے آپ تو جائیں

اُلجھتے ہیں ترے سودائیوں سے اہلِ خرد
یہ سادہ لوح بھی پاگل کہیں نہ ہو جائیں

زمانہ اپنی پریشانیوں میں کھویا ہے
چلو کہ منزلِ جاناں کو دوستو جائیں

شبِ فراق تو کٹتی نظر نہیں آتی
خیالِ یار میں آؤ فرازؔ سو جائیں

غزل

کچھ نہ کسی سے بولیں گے
تنہائی میں رو لیں گے

ہم بے راہ رؤوں کا کیا
ساتھ کسی کے ہو لیں گے

خود تو ہوُئے رسوا لیکن
تیرے بھید نہ کھولیں گے

جیون زہر بھرا ساگر
کب تک امرت گھولیں گے

ہجر کی شب سونے والے
حشر کو آنکھیں کھولیں گے

پھر کوئی آندھی اُٹھے گی
پنچھی جب پر تولیں گے

نیند تو کیا آئے گی فرازؔ
موت آئی تو سو لیں گے

غزل

سکوت بن کے جو نغمے دلوں میں پلتے ہیں
وہ زخمۂ رگِ جاں توڑ کر نکلتے ہیں

حضور آپ شب آرائیاں کریں لیکن
فقط نمودِ سحر تک چراغ جلتے ہیں

اگر فضا ہے مخالف تو زلف لہراؤ
کہ بادبان ہواؤں کا رُخ بدلتے ہیں

کوئی بھی فیصلہ دینا ابھی درست نہیں
کہ واقعات ابھی کروٹیں بدلتے ہیں

یہ پاسِ پیرِ مغاں ہے کہ ضعفِ تشنہ لبی
نشہ نہیں ہے مگر لڑکھڑا کے چلتے ہیں

خدا کا نام جہاں بیچتے ہیں لوگ فراز
بصد وثوق وہاں کاروبار چلتے ہیں

صرّاف

ساٹھ کے نیس، نہیں یہ تو نہیں ہو سکتا
زرِ خالص کی انگوٹھی ہے ذرا غور سے دیکھ
کسی پتھّر پہ رگڑ اس کو کسوٹی پہ پرکھ
ہر طرح جانچ ہر انداز ہر اک طور سے دیکھ

مجھ پہ روشن ہے کہ اس جنسِ گراں مایہ کو
میرے افلاس نے کم نرخ بنا رکھا ہے
دیکھ کر میری نگاہوں میں طلب کی شدّت
تو نے انصاف کو نیلام چڑھا رکھا ہے

جانتا ہوں تری دوکاں کے یہ زرّیں زیور
یہ گلوبند یہ کنگن یہ طلائی پیسے
یہ زر و سیم کی اینٹوں سے لدی الماری
کسی شدّاد کا تابوت دھرا ہو جیسے

کتنے مجبوروں نے بڑھتی ہوئی حاجت کے لیے
کیسے حالات میں کس نرخ یہاں بیچ دیے
کتنے ناداروں نے افلاس کے چکراؤ میں
پہلے تو رہن کیے بعد ازاں بیچ دیے

تیری میزاں کے یہ بے رحم سنہرے پلڑے
ایک جلّاد کی تلوار رہے ہیں اب تک
گرسنہ آنکھوں کے کشکول، ہوس کے مقتل
ہر نئے خوں کے خریدار رہے ہیں اب تک

ساٹھ کے تیس نہیں، تیس کے پندرہ دے دے
اپنی مجبوری کا اظہار نہیں کر سکتا
آج اک تلخ ضرورت ہے مرے پیشِ نظر
میں کسی رنگ سے انکار نہیں کر سکتا

منصور

وہ کیا خطا تھی؟
کہ جس کی پاداشں میں ابھی تک
میں قرن ہا قرن سے شکارِ عبودیت
طوق در گلو — پا بہ گل رہا ہوں
وہ جرم کیا تھا؟
کہ زندگی بھر تو میں
ترے آستاں پہ سجدوں کی نذر گزرانتا رہوں
اور اس کا ثمرہ ملے
تو بس کاسۂ گدائی — عذابِ عالم
تو کیا مری بے طلب ریاضت ۔ مجاہدت کا یہی صلہ ہے
مجھے گلہ ہے

خدائے تنور و آب و بادہ مجھے گلہ ہے
مجھے تری بندگی کے صدقے میں کیا ملا ہے؟
کہاں ہے وہ تیرا دستِ فیاض
جس کے جود و سخا کے قصے
سنہرے حرفوں میں ہر صحیفے کے
حاشیے بن کے رہ گئے ہیں
کہاں ہیں وہ تیری جنتیں جن کی داستانیں
بڑے تکلف سے عرش سے فرش پر اتاریں
کہاں ہیں وہ تیرے شیر و شہد و شکر کے بے انتہا ذخیرے
کہ جن کی کاذب جھلک سے تو نے
گرسنہ مخلوق کو ازل سے غلام رکھا
کہاں ہیں ان واہمی کھلونوں کے
اونچے بازار کس طرف ہیں
میں ان روایات کی حقیقت سے باخبر ہوں
یہ سب وہ رنگین دام تھے جن کے بل پہ تو نے
زمیں پہ بغض و عناد و ظلم و فساد و حرص و ہوس کے ایسے دھوئیں اڑائے

کہ نسلِ آدم کروڑ فرقوں میں بٹ گئی ہے
یہ وحدۂ لاشریک دنیا ہزار خطوں میں کٹ گئی ہے

اگرچہ روزِ الست سے لے کے اب تلک
بے شمار صدیوں کے فاصلے ہیں
مگر یہ تاریخ کی کہن سال راہبہ، جو
ترے کلیساؤں تبکدوں اور حرم سراؤں کے مجرمانہ
رموز سے آشنا رہی ہے
ہر اک خرابے کی خاک اُڑانے کے بعد آئی
تو کہہ رہی ہے
"سنو نشیبوں کے باسیو!
یہ جہاں تمھارا ہے
یہ زمیں یہ فلک یہ خورشید و ماہ و انجم فقط تمھارے ہیں
دوسرا ماسوا تمھارے کوئی نہیں ہے
خدا و بندہ کی تلخ تفریق بے حقیقت ہے بے سبب ہے
الوہیت کا وجود تم میں سے ہی کسی خود فریب انساں کا واہمہ تھا

یہ واہمہ اس قدر بڑھا پھر
کہ رفتہ رفتہ تمام کونین کا خداوند بن گیا ہے
اور اس خداوند
اس تصوّر کے آسرے پر
تمھارے کچھ ہمنفس رفیقوں نے
تم کو محکوم و پا بہ زنجیر کر دیا ہے
یہی وہ پہلا گناہ پہلا فریب پہلا فسوں ہے جس نے
مزاجِ انساں کو غاصبانہ شعور بخشا"
اگر یہ سچ ہے!
اگر یہ سچ ہے خدائے تنور و آبِ سادہ
تو یہ من و تو کی پست و بالا فصیلِ مسمار کیوں نہ کر دوں
کہ ان مراتب کی کشمکش سے ہی
آج میں اور میرے ہم جنس
اس طرح ایک دوسرے کے غنیم ہیں
جس طرح زمستاں کی برف باری کے بعد گرگانِ گرسنہ
بھوک کی شقاوت سے تنگ آ کر

اس ایک لمحے کے منتظر ہوں
جب اُن کا کوئی نحیف ساتھی
غنودگی کا شکار ہو
اور سب کے سب اس پہ ٹوٹ کر چیر پھاڑ ڈالیں
کہ اس شکم کے مہیب دوزخ سے بڑھ کے
کوئی نہیں جہنم
نہ اس جہاں میں
نہ اُس جہاں میں

رباعی

مذہب کو مدام بیچتے ہیں یہ لوگ
ایمان تو عام بیچتے ہیں یہ لوگ
جنّت کے اجارہ دار بن کر شب و روز
اللہ کا نام بیچتے ہیں یہ لوگ

تھک جائیں گے راہگیر چلتے چلتے
ڈھل جائیں گے ماحول میں ڈھلتے ڈھلتے
تاریکیٔ شب میں نہ کمی آئے گی
بجھ جائیں گے یہ چراغ جلتے جلتے

مشورہ

زیست کی تلخیوں سے گھبرا کر
اپنا دامانِ عجز پھیلا کر
آسماں کی طرف نگاہ کیے
اپنے ربِّ کریم کے در سے
موت کی بھیک مانگنے والے!
دیکھ اِس زرنگار مسجد کو
آبِ زرّیں کی جھلملاہٹ سے
جس کے مینار جگمگاتے ہیں

تیرے ربِّ کریم کا گھر ہے
اور اس خانۂ مقدّس میں
مئے کوثر کے خم لنڈھائے ہوئے
شوخ غلماں لگائے سینے سے
ملک الموت نیم خوابیدہ
یادِ ربِّ کریم میں گم ہیں

چھوڑ انداز یہ دعاؤں کا
تا بہ کے آسرا خداؤں کا
ہاں فقط ایک نعرۂ وحشت
بڑھ فقط اک قدم بغاوت کا
یا تو یہ خیر و شر کے رکھوالے
موت کی بھیک تجھ کو دے دیں گے
یا پھر ان کے مہیب پنجوں سے
چھین کر اپنی زندگی پالے
موت کی بھیک مانگنے والے

غیر سے تیرا آشنا ہونا
گویا اچھا ہُوا بُرا ہونا

خود نگوں سار، ہمسفر بیزار
اک ستم ہے شکستہ پا ہونا

کتنی جانکاہ ہے ضمیر کی موت
کتنا آساں ہے بے وفا ہونا

نشۂ لذّتِ گناہ کے بعد
سخت مشکل ہے پارسا ہونا

آدمی کو خدا نہ دکھلائے
آدمی کا کبھی خدا ہونا

دل کی باتوں پہ کون جائے فراز
ایسے دشمن کا دوست کیا ہونا

رباعی

روتا ہوں تو احباب بُرا مانتے ہیں
ہنستا ہوں تو مجرم مجھے گردانتے ہیں
ہر حال میں اعتراض کرنے والے
ناداں مرے حالات کہاں جانتے ہیں

زہرابِ حیات چکھ رہا ہوں دیکھو
کانٹوں پہ زبان رکھ رہا ہوں دیکھو
واقف ہوں طبیعتوں سے ان کی پھر بھی
احباب کے دل پرکھ رہا ہوں دیکھو

غزل

تیرے ہوتے ہُوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

اپنی محرومی کے احساس سے شرمندہ ہیں
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

بستیاں دور ہُوئی جاتی ہیں رفتہ رفتہ
دمبدم آنکھوں سے چھپتے چلے جاتے ہیں چراغ

کیا خبر اُن کو کہ دامن بھی بھڑک اُٹھتے ہیں
جو زمانے کی ہواؤں سے بچاتے ہیں چراغ

گو سیہ بخت ہیں ہم لوگ پہ روشن ہے ضمیر
خود اندھیرے میں ہیں دنیا کو دکھاتے ہیں چراغ

بستیاں چاند ستاروں کی بسانے والو
کرۂ ارض پہ بجھتے چلے جاتے ہیں چراغ

ایسے بے درد ہوئے ہم بھی کہ اب گلشن پر
برق گرتی ہے تو زنداں میں جلاتے ہیں چراغ

ایسی تاریکیاں آنکھوں میں بسی ہیں کہ فراز
رات تو رات ہے ہم دن کو جلاتے ہیں چراغ

آگ میں پھول

میں تو شعلوں کا پُجاری ہوں مرے پاس نہ آ
اپنے دامن محبّت کے حسیں پھُول لیے
ان دلآویز بہاروں سے مجھے ربط نہیں

جب کوئی تازہ کلی نکہت و رنگت کی پلی
شبنمی حسن کے سیمین لبادے اوڑھے
مست پلکوں پہ لیے صبح جوانی کی پھوار
میرے تپتے ہُوئے ماحول میں در آتی ہے
تو مرے سرد ارادوں سے دھواں اُٹھتا ہے
میری آنکھوں میں الاؤ سے دہک جاتے ہیں
اور اس آتش و ظلمت کے گھنے لاوے میں
مسکراتی ہُوئی شاداب کلی کی سانسیں
چند ہی لمحوں میں رک جاتی ہیں پھک جاتی ہیں

تو کہ تو بھی ہے کسی ذوقِ نمو سے سرشار
مست پلکوں پہ لیے صبحِ جوانی کی پھوار

ایک انجان سی منزل کو بڑھے آتی ہے
دیکھ اس شعلوں کی بستی کو ذرا غور سے دیکھ
ہر قدم پر جہاں انگارے ہی انگارے ہیں
تو یہاں رہ کے کبھی پھول نہیں بن سکتی
لوٹ جا پیشتر اس کے کہ ترے ہونٹوں میں
احمریں رس کی جگہ تند شرر گھل جائیں
ان مہکتے ہوئے رخساروں کے زرخیز کنول
آگ کے حلقۂ بے باک میں جھلسے جائیں

میں تو شعلوں کا پجاری ہوں...

رباعی

حالات کی دوپہر کڑی ہے ساقی
تقدیر برہنہ سر کھڑی ہے ساقی
کچھ دیر غمِ جہاں پہ ہنس لیں آؤ
رونے کو تو زندگی پڑی ہے ساقی

دنیا تو ہے کانٹوں کا بچھونا پیارے
تم ہم سے کبھی جدا نہ ہونا پیارے
آؤ مل کر دکھ کے لمحے کاٹیں
اک جشن ہے ساتھ ساتھ رونا پیارے

بڑھ جاتا ہے دل کا روگ گاہے گاہے
کر لیتے ہیں اپنا سوگ گاہے گاہے
جو یاد دلا دیتے ہیں بھولے صدمے
مل جاتے ہیں ایسے لوگ گاہے گاہے

غزل

میری حالت ہے کہ احساسِ طرب ہے کوئی
تیرے بے ساختہ ہنسنے کا سبب ہے کوئی

فتنۂ گردشِ دوراں ذرا آہستہ گزر
سایۂ زلف میں آرام طلب ہے کوئی

اپنے رونے کا سبب تو نہیں معلوم مگر
لوگ کہتے ہیں کہ تقریبِ طرب ہے کوئی

آج تک ان سے رہ و رسم چلی جاتی ہے
جن سے کچھ پہلے توقع تھی نہ اب ہے کوئی

یا تجھے دیکھ کے بھر آئے خوشی سے آنسو
یا مری آنکھوں میں گزری ہوئی شب ہے کوئی

جانے کن لوگوں کی بستی میں چلے آئے فراز
آبدیدہ ہے کوئی خندہ بلب ہے کوئی

غزل

اب جو کانٹے ہیں دل میں تمنّاؤں کے پھول تھے
آج کے زخم پہلے شناساؤں کے پھول تھے

دشتِ غربت کچھ ایسا ہُوا گلفشاں گلفشاں
جس طرح پھوٹتے آبلے پاؤں کے پھول تھے

تھی ہمیں کو بہت خارزارِ جنوں کی لگن
دوستو! ورنہ اقوال داناؤں کے پھول تھے

غم کی لَو سے دھڑکتے دلوں کے کنول بجھ گئے
دھوپ میں کیسے کھلتے وہ جو چھاؤں کے پھول تھے

برف زاروں میں کوئی اگر یہ سماں دیکھتا
جا بجا نقشِ پا کوہ پیماؤں کے پھول تھے

شہر میں حسنِ سادہ کو کانٹوں میں تولا گیا
بک گئے کوڑیوں مول جو گاؤں کے پھول تھے

زہر آگیں فضا بستیوں کی جنھیں کھا گئی
ہم فرازؔ ایسے سنسان صحراؤں کے پھول تھے

غزل

سکوتِ شامِ خزاں ہے قریب آجاؤ
بڑا اداس سماں ہے قریب آجاؤ

نہ تم کو خود پہ بھروسہ نہ ہم کو زعمِ وفا
نہ اعتبارِ جہاں ہے قریب آجاؤ

رہِ طلب میں کسی کو کسی کا دھیان نہیں
ہجومِ ہمسفراں ہے قریب آجاؤ

جو دستِ عشق میں بچھڑے وہ عمر بھر نہ ملے
یہاں دھواں ہی دھواں ہے قریب آجاؤ

یہ آندھیاں ہیں تو شہرِ وفا کی خیر نہیں
زمانہ خاک فشاں ہے قریب آجاؤ

فقیہہِ شہر کی مجلس نہیں کہ دور رہو،
یہ بزمِ پیرِ مغاں ہے قریب آجاؤ

فرازؔ دور کے سورج غروب سمجھے گئے
یہ دورِ کم نظراں ہے قریب آجاؤ

رباعی

ہر لحرِ ستم کو پاٹ لینے والا
ہر زہرِ الم کو چاٹ لینے والا
ذرّے سے پناہ ڈھونڈتا پھرتا ہے
انساں پہاڑ کاٹ لینے والا

آشوب گہہ حیات لے ڈوبیں گے
دنیا کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے
ہم لوگ عبارت ہیں زمانے جن سے
ڈوبیں گے تو کائنات لے ڈوبیں گے

جانشین

(۱۹۵۲ء میں کراچی میں طلباء پر فائرنگ سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

علم و دانش کے سوداگروں نے کہا
جاہلو!
تم اندھیروں کی دنیا کے باسی
جہالت کی تاریک غاروں کے مُردے
کہاں جا رہے ہو، کہاں ؟
تم تہی دست ہو
تم تہی جیب ہو
تم تہی دامنوں سے ہمیں کوئی لالچ نہیں
تم نہیں جانتے
تم نہیں مانتے
ہم تمھارے لیے

۷۶۱

کب سے تہذیب و حکمت کی نایاب اجناس کو
منڈیوں میں سجائے ہوئے ہیں
تم نہیں دیکھتے
تم کہ شب کور ہو
ہم نے دن کے اُجالے میں بھی بس تمھارے لیے
اس تمدن کے فانوس روشن کیے
جن کی شفاف کرنوں سے سارا جہاں بقعۂ نور ہے
عالمِ طور ہے
پاگلو!
تم نہیں جانتے
تم نہیں مانتے
ہم ارسطو ہیں شاہوں کے استاد ہیں
ہم فلاطوں ہیں ہم کو ہر اک علم و حکمت کے گُر یاد ہیں
ہم ہی سقراط ہیں
ہم ہی بقراط ہیں
ہم ہی بے مثل شخصیتوں کے خردمند فرزند ہیں

ہم ہی کون و مکاں کے خداوند ہیں
سرپھرو!
تم کو ہم سے گلہ ہے کہ ہم نے تمھیں
خاک و خوں کے سمندر میں نہلا دیا
صرف اپنے تسلّط کی خاطر تمھیں
ہم نے اپنوں کے ہاتھوں سے کٹوا دیا
چاند سورج تو اپنے لیے رکھ لیے
اور تم کو کھلونوں سے بہلا دیا
تم کو اس کی مگر کچھ خبر ہی نہیں
یہ تسلّط یہ جاہ و حشم یہ زمیں
بس تمھارے لیے ہے تمھارے لیے
دورِ فردا کے فرماں روا ہو تمھیں
تم کو ہونا ہے اجداد کا جانشیں
پاگلو! — ہم سے عالی نظر دیدہ ور
تم سے جو بھی کہیں مان لو
اپنے اپنے مراتب کو پہچان لو

تم نہیں جانتے۔ تم کہ مردہ رہے سال ہا سال سے
بھیڑوں اور درندوں کی ارواحِ بد تم میں در آئی ہیں
اور جہل و جنوں کی نجس مشعلیں دے کے تم کو
بغاوت پہ اُکساتی ہیں
اپنے اجداد سے۔ اپنے فرمانرواؤں سے آقاؤں سے
جاہلو!
پاگلو!!

غزل

راتیں ہیں اُداس دن کڑے ہیں
اے دل ترے حوصلے بڑے ہیں

اے یادِ حبیب ساتھ دینا
کچھ مرحلے سخت آپڑے ہیں

رکنا ہو اگر تو سو بہانے
جانا ہو تو راستے بڑے ہیں

اب کیسے بتائیں وجہِ گریہ
جب آپ بھی ساتھ رو پڑے ہیں

اب جانے کہاں نصیب لے جائے
گھر سے تو فرازؔ چل پڑے ہیں

سیلاب

پھر تم ہاتھوں کو پھیلاؤ آیا ہے سیلاب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

قدرت کے سب کھیل نیارے
اس میں کسی کو دخل نہیں ہے
جس کو ڈبوئے جس کو ابھارے

چھوڑو ناؤ خوف نہ کھاؤ دور نہیں گرداب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

کٹیاؤں کو بہہ جانے دو
مال مویشی سب کچھ چھوڑو
نام خدا کا رہ جانے دو

ہاتھ اُٹھاؤ ڈوبے جاؤ چھوڑو مال اسباب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

پھٹے پرانے کپڑے پہنو
اپنا مقدّر۔ اپنا نصیبہ
دیکھتی جاؤ۔ ننگی بہنو
ننگی ماؤ۔ بُنتی جاؤ اطلس اور کمخواب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب
تم ہو جیون بھر کے روگی
یہ جگ چھوڑو اُس دنیا میں
تم پہ خدا کی رحمت ہوگی
پھول اُگاؤ پتھّر کھاؤ گندم ہے نایاب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب
ہنس ہنس کر اے غربت زادو
ان داتاؤں کے چرنوں میں
اپنی جانیں بھینٹ چڑھادو
بڑھتے آؤ روگ مٹاؤ ہو جاؤ غرقاب
ناچو گاؤ جشن مناؤ آیا ہے سیلاب

غزل

لے اڑا پھر کوئی خیال ہمیں — ساقیا ساقیا سنبھال ہمیں
رو رہے ہیں کہ ایک عادت ہے — ورنہ اتنا نہیں ملال ہمیں
خلوتی ہیں ترے جمال کے ہم — آئینے کی طرح سنبھال ہمیں
مرگ انبوہ جشنِ شادی ہے — مل گئے دوست حسبِ حال ہمیں
اختلاف جہاں کا رنج نہ تھا — دے گئے مات ہم خیال ہمیں
کیا توقع کریں زمانے سے — ہو بھی گر جراُتِ سوال ہمیں
ہم یہاں بھی نہیں ہیں خوش لیکن — اپنی محفل سے مت نکال ہمیں

ہم ترے دوست ہیں فراز مگر
اب نہ الجھنوں میں ڈال ہمیں

غزل

ہم ہیں ظلمت میں کہ ابھرا نہیں خورشید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں رات کی تردید اب کے

کون سنتا تھا حدیثِ غمِ دل یوں تو مگر
ہم نے چھیڑی ہے ترے نام سے تمہید اب کے

پی گئے رند کہ نایاب ہے صہبا ورنہ
زہر تھی محتسبِ شہر کی تنقید اب کے

تشنگی وجہِ جنوں ہے تو چلو یوں ہی سہی
کوئی سنگ آئے سرِ ساغرِ جمشید اب کے

اک زمانے سے نہ روئے ہیں نہ جاں تڑپی ہے
دل پہ لازم ہے ترے درد کی تجدید اب کے

قصۂ اہلِ وفا جانے کہاں تک پہنچے
منزلِ دار و رسن ٹھہری ہے تمہید اب کے

لہو روئے ہیں تو گلنارِ شفق پھولے گی
آنسو بوئے ہیں تو ہم کاٹیں گے خورشید اب کے

ہم نے یہ سوچ کے جاں دی ہے محبت میں فراز
بوالہوس کرتے ہیں کس رنگ میں تقلید اب کے

۲۳ ؍ مارچ

(جشنِ جمہوریہ پاکستان کے موقع پر لکھی گئی)

"خوشا یہ ساعتِ رنگیں خوشا یہ روزِ طرب
ستم کشو! نئی منزل کا احترام کرو
اداس چہروں سے گردِ ملال دھو ڈالو
ملول روحوں کو ہنس ہنس کے شاد کام کرو
درونِ خانہ گھنی ظلمتیں سہی لیکن
بڑے خلوص سے تزئینِ سقف و بام کرو
چراغ ہوں کہ لہو ہو کہ آنسوؤں کی لکیر
پھر آج جشنِ بہاراں کا اہتمام کرو
شبِ الم کی حکایات کا یہ وقت نہیں
اٹھو اور اُٹھ کے نئی صبح کو سلام کرو"

امیرِ شہر کے فرمان سب بجا لیکن
فقیرِ شہر بھی کچھ عرضِ حال کرتے ہیں
خطا معاف بصد احترامِ عہدِ وفا
سسکتے ہونٹ، دکھے دل سوال کرتے ہیں
کہ ہم تو وہ ہیں جو باوصفِ ضعفِ تشنہ لبی
مزاجِ پیرِ مغاں کا ملال کرتے ہیں
ہر ایک تیر کو خوش آمدید کہتے ہوئے
دو چند اہلِ حشم کا جلال کرتے ہیں
ہمیں تو جاں سے زیادہ عزیز دردِ وطن
مگر حضور بھی ایسا خیال کرتے ہیں

چمن میں جشنِ ورودِ بہار جب بھی ہوا
وطن میں جب بھی فروزاں ہوئے خوشی کے دیئے
رہی ہے بوالہوسوں کے سبو میں بادۂ ناب
بلاکشانِ وفا نے لہو کے گھونٹ پیئے
مہ و نجوم رہے بزمِ شہریاراں میں
نگاہِ خلق ترستی رہی کرن کے لیے

ادھر عبا و قبا کا خیال دامن گیر
ادھر یہ فکر کہ کوئی جگر کے چاک سیئے
تو کیا یہی غمِ جمہور کے تقاضے ہیں
نظر اُٹھا کے نہ دیکھیں کوئی مرے کہ جیئے

زہے نصیب جواب بھی غمِ مآل رہے
یہ دورِ نو ہے مبارک اگر سنبھل کے چلیں
یہ چند سانسوں کی فرصت بڑی غنیمت ہے
کسے خبر ہے کہ پھر حادثے ٹلیں نہ ٹلیں
خدا وہ وقت نہ لائے کہ گردشوں کے طفیل
حضور اپنی جفا کیشیوں پہ ہاتھ ملیں
جو ہو سکے تو مٹا دیں یہ فاصلے ورنہ
کہیں یہ ذرّے ستاروں سے انتقام نہ لیں
بجھے ہوں دل تو اندھیرے کبھی نہیں مٹتے
یہ قمقمے تو کجا لاکھ آفتاب چلیں

غزل

دل کو اب یوں تری ہر ایک ادا لگتی ہے
جس طرح نشّے کی حالت میں ہوا لگتی ہے

رتجگے خوابِ پریشاں سے کہیں بہتر ہیں
لرز اُٹھتا ہوں اگر آنکھ ذرا لگتی ہے

اے رگِ جاں کے مکیں تو بھی کبھی غور سے سُن
دل کی دھڑکن ترے قدموں کی صدا لگتی ہے

گو دکھی دل کو بہت ہم نے بچایا پھر بھی
جس جگہ زخم ہو واں چوٹ سدا لگتی ہے

شاخِ اُمید پہ کھلتے ہیں طلب کے غنچے
یا کسی شوخ کے ہاتھوں میں حنا لگتی ہے

تیرا کہنا کہ ہمیں رونقِ محفل ہیں فراز
گو تعلّی ہے مگر بات خدا لگتی ہے

غزل

ہم اپنے آپ میں گم تھے ہمیں خبر کیا تھی
کہ ماورائے غمِ جاں بھی ایک دنیا تھی

وفا پہ سخت گراں ہے ترا وصالِ دوام
کہ تجھ سے مِل کے بچھڑنا مری تمنّا تھی

ہُوا ہے تجھ سے بچھڑنے کے بعد اب معلوم
کہ تو نہیں تھا ترے ساتھ ایک دنیا تھی

خوشا وہ دل جو سلامت رہے بزعمِ وفا
نگاہِ اہلِ جہاں ورنہ سنگِ خارا تھی

دیارِ اہلِ سخن پر سکوت ہے کہ ہے جو تھا
فرازؔ میری غزل بھی صدا بصحرا تھی

تنہا، تنہا
۱۳۷

تفاوت

تو کیوں ہے اُداس، مسکرا دے
کیوں تجھ کو غمِ وفا نے گھیرا
زنگارِ الم سے دور ہی رہ
آئینۂ صفت جمال تیرا
کتنی ہی سیاہ شب ہو لیکن
کب چاند پہ چھا سکا اندھیرا
کب موجۂ روشنی تھمی ہے
دریاؤں پہ دھول کب جمی ہے

میں کیسے ہنسوں کہ دردِ ہستی
ہے میرے شعور کا تقاضا
حالات کی دھوپ میری قسمت
آلام کی ریگ میری دنیا
میں سایۂ نخل کو بھی ترسوں
صحرا کی طرح وجود میرا
صحراؤں میں پھول کب کھلے ہیں
ہم دونوں میں کتنے فاصلے ہیں

غزل

اب تک تیرے فتنے ہیں سلامت اُسے کہنا
یارو! سرِ محشر بھی قیامت اُسے کہنا

اے ہمنفسو محوِ غمِ جاں ہیں ابھی ہم
آئیں گے سرِ کوئے ملامت اُسے کہنا

معیارِ نظر دار کی رفعت بھی تھی لیکن
بھولا نہیں تیرا قد و قامت اُسے کہنا

اک وہ ہی نہیں ترکِ تعلّق پہ پشیماں
ہے اہلِ وفا کو بھی ندامت اُسے کہنا

اے دل زدگاں! موت ہے اظہارِ تمنّا
وہ بت ہو خدا بھی تو خدا مت اُسے کہنا

ہر چند فرازؔ ان دنوں معتوب ہے پھر بھی
حالات کا مارا ہے بُرا مت اُسے کہنا

تسلسل

کب سے سنسان خرابوں میں پڑا تھا یہ جہاں
کب سے خوابیدہ تھے اس وادیٔ خارا کے صنم
کس کو معلوم یہ صدیوں کے پر اسرار بھرم
کون جانے کہ یہ پتھّر بھی کبھی تھے انساں
صرفِ لب دوختہ پربت ہوں جہاں نوحہ کناں

نہ در و بام نہ دیوار و دریچہ کوئی
کوئی دہلیزِ شکستہ نہ حریمِ ویراں
شہر کے شہر ہیں پاتال کے دامن میں نہاں
کون پہچانتا ظلمت میں سیاہی کے نشاں
جو نظر ڈھونڈھنے اٹھی وہ نظر بھی کھوئی
چشمِ مہتاب بھی شبنم کی جگہ خوں رو دی

یہ خرابے تھے ان ادوار کے مدفن جن میں
ارضِ مشرق کے جہاں تاب اجالوں کی نمود
جگمگاتی رہی تاریخ کا تاریک وجود
رات ہوتی رہی تبدیل چمکتے دن میں
اَن گنت صدیوں کی تہذیب دبی تھی ان میں

علم نے آج کریدے ہیں وہ ظلمات کے ڈھیر
وقت نے جن پہ بٹھائے تھے فنا کے پہرے
جاگ اُٹھے صورِ سرافیل سے گونگے بہرے
تا ابد جن کے مقدّر میں تھی دنیا اندھیر
یہ مگر عظمتِ انساں ہے کہ تقدیر کے پھیر؟

یہ عمارات، یہ مینار، یہ گلزار، یہ کھیت
تودۂ خاک سے ہستی نے لیا تازہ جنم
جی اُٹھے وادیٔ خاموش کے بے جان صنم
پھر کوئی چیرے گا ذرّے کا جگر قطرۂ یم
دفن کر دے گا جو خالق کو بھی مخلوق سمیت

غزل

چاندنی رات کو سحر کہنا — دوستو! یوں نہیں مگر کہنا
اب کہاں وہ بہار پھولوں کی — گلِ نرگس کو چشمِ تر کہنا
بجھ چکے ہیں محبّتوں کے چراغ — ان دیاروں کو اب کھنڈر کہنا
راہ میں لٹ کے بیٹھنے والو — اب کسی کو نہ ہمسفر کہنا
خود اُجاگر کرو ہُنر اپنا — دوسروں کو نہ کم نظر کہنا

ق

ہم کو آوارگی کے پردے میں — دل کی باتیں اِدھر اُدھر کہنا
ذکر تیرا گلی گلی کرنا — حال اپنا نگر نگر کہنا

لبِ گویا عذابِ جاں ہے فرازؔ
جو بھی کہنا ہو سوچ کر کہنا

ہلالِ عید

ہلالِ عید! نویدِ طرب ہے دید تری
تری نمود خوشی کا پیام لاتی ہے
بجھی نگاہوں میں کرنوں کی جوت بھرتی ہے
ملول روحوں کی افسردگی مٹاتی ہے
روائیتیں ہیں کہ اس دن ہر ایک دل کی کلی
وفورِ نشۂ راحت سے جھُوم جاتی ہے
بلند و پست کے ہر تفرقے مٹاتے ہُوے
ہر اک محل میں ہر اک گھر میں عید آتی ہے

ہلالِ عید! مگر میں نے ہر برس دیکھا
کہ تیری ضو بھی شبوں میں مسکراتی نہیں
روائتوں پہ مجھے بھی یقیں تو ہے لیکن
یہ خوش عقیدگی کیا کیجے راس آتی نہیں
خدا کے گھر میں برابر سبھی غریب و غنی
یہ رسم ملکِ خدا میں رواج پاتی نہیں
طلوع ہوتا رہا تو ہر ایک سال مگر
مرے وطن کی جبیں پھر بھی جگمگاتی نہیں

ہلالِ عید! تفاوت کی آتشیں آندھی
جھلس رہی ہے میرے دیس میں خوشی کے چمن
کہیں تو جسم پہ ریشم کے ڈھیر بار نظر
کہیں بدن پہ ہیں عریانیاں ہی پیراہن
کہیں تو کجکلہی وجہِ نخوت و تمکیں
کہیں فلاکت و افلاس زندگی کے کفن
کہاں وہ دن کہ غریب الدیار روتے تھے
یہ حال ہو تو وطن میں ستم ہے عیدِ وطن

ہلالِ عید! تجھے غمزدوں سے کیا نسبت
کہ خواجگانِ جہاں ہی ترے چہیتے ہیں
جو تیرے نام کے ساغر فضا میں لہرا کر
تری کمان کی قوسوں کو موڑ دیتے ہیں
فغاں! کہ تجھ کو بھی ان بےکسوں سے ربط نہیں
جو اپنے دل کے سفینے لہو میں کھیتے ہیں
تیری ضیا بھی ہے گویا کٹی پتنگ جسے
بلند بام خلا ہی میں لوٹ لیتے ہیں

ہلالِ عید! طرب زا سہی یہ شام مگر
چراغ شوق جلاتے ہوئے لرزتے ہیں
دلوں پہ کل جو قیامت گزرنے والی ہے
اب اس کا دھیان بھی لاتے ہوئے لرزتے ہیں
ہم اہلِ غم تجھے خوش آمدید کیسے کہیں
جو اپنے دکھ بھی سناتے ہوئے لرزتے ہیں
اگرچہ تجھ پہ نگاہیں جمی ہوئی ہیں مگر
دعا کو ہاتھ اٹھاتے ہوئے لرزتے ہیں

غزل

جانے کس غم سے من سلگتا ہے
بات کرتے دہن سلگتا ہے

غم لگاتا ہے آگ خلوت میں
دل سرِ انجمن سلگتا ہے

احمریں جسم آنچ دیتا ہُوا
جس طرح پیرہن سلگتا ہے

یہ طلب ہے کہ دردِ محرومی
ابر چھائے تو بن سلگتا ہے

دیکھنا لُو چلی کہ بامُراد
دوستو پھر چمن سلگتا ہے

جاگ اُٹھی خواہشِ گناہ فراز
چاندنی میں بدن سلگتا ہے

واہمہ

تو ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تری سادہ و معصوم ہنسی
آنکھ کی بھول سماعت کا فسوں
تیری عادت ترا انداز نہ ہو
بے تکلّف ترے ہونٹوں کی چٹک
میری خوش فہمی کا اعجاز نہ ہو
میں سرابوں کو بھی دریا سمجھوں
تو فقط شوق کی پرواز نہ ہو

تو ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تری سادہ و بیباک ہنسی
میں جسے خواب سے تعبیر کروں
وہ حقیقت میں کوئی راز نہ ہو
تیرے بے ساختہ ہنسنے کی ادا
تیری تنہائی کی آواز نہ ہو
میں جسے حسنِ طبیعت جانوں
تیرے جذبات کی غمّاز نہ ہو

تو ہر اک بات پہ ہنس دیتی ہے
اور میں سوچ میں پڑ جاتا ہوں
یہ تیری سادہ و پرکار ہنسی
میری دنیا مری ہستی کا سکوں
کسی طوفان کا آغاز نہ ہو

میں محبّت کی طلب کا مارا
تو فقط حسنِ نظر باز نہ ہو
یہ نہ ہو میں تو سوئمبر جیتوں
اور ترے قصر کا در باز نہ ہو

ایک شعر

جسم بلور سا نازک ہے جوانی بھرپور
اب کے انگڑائی نہ ٹوٹی تو بدن ٹوٹے گا

غزل

یہ ہیں یہ کوئے دار یہ تنہائی دوستو
کیا تم بھی بن گئے ہو تماشائی دوستو

پیغامِ مرگ ہے کہ پیامِ حبیب ہے
صرصر چلی کہ بادِ مراد آئی دوستو

یہ کیا کہ ایک تیرِ ملامت نہ سہہ سکے
ہونی ہے کو بکو ابھی رسوائی دوستو

آغازِ شامِ ہجر ہے بیٹھے رہو ابھی
ٹھہرو ذرا کہ موت ہے تنہائی دوستو

زنجیر کٹ گئی کہ کوئی دوست کٹ گیا
کچھ تو کہو یہ کیسی صدا آئی دوستو

اک بار اس کو میری نگاہوں سے دیکھ لو
پھر خود کہو کہ کون ہے سودائی دوستو

وہ حسنِ دلفروز کہ جانِ فراز ہے
خلقِ خدا ہے اس کی تمنائی دوستو

کنیز

حضور آپ اور نصف شب مرے مکان پر
حضور کی تمام تر بلائیں میری جان پر
حضور خیریت تو ہے حضور کیوں خموش ہیں
حضور بولیے کہ وسوسے وبال ہوش ہیں
حضور ہونٹ اس طرح سے کپکپا رہے ہیں کیوں
حضور آپ ہر قدم پہ لڑکھڑا رہے ہیں کیوں
حضور آپ کی نظر میں نیند کا خمار ہے
حضور شاید آج دشمنوں کو کچھ بخار ہے
حضور مسکرا رہے ہیں میری بات بات پر
حضور کو نہ جانے کیا گماں ہے میری ذات پر
حضور منہ سے بہہ رہی ہے پیک صاف کیجیے
حضور آپ تو نشے میں ہیں معاف کیجیے
حضور کیا کہا میں آپ کو بہت عزیز ہوں
حضور کا کرم ہے ورنہ میں بھی کوئی چیز ہوں
حضور چھوڑیے ہمیں ہزار اور روگ ہیں
حضور جائیے کہ ہم بہت غریب لوگ ہیں

آتشِ عجم

شبِ سیہ کے اُمڈتے ہُوئے اندھیروں میں
دل و نظر نے اُمیدوں کے کتنے خواب بُنے
خرد کے ہاتھ میں جب آخری چراغ بجھا
جنوں نے عزم کے ذرّوں سے آفتاب چُنے

ہوس کی تیرہ نگاہوں کے رینگتے سائے
بڑھے تو بجھتے شراروں نے آگ برسائی
فضا نے جب بھی ارادہ کیا کچلنے کا
تو ڈوبتی ہُوئی نبضوں میں برق لہرائی

خیال تھا کہ اگر تند آندھیاں بھی اُٹھیں
تو ذرّے سُرخ بگولوں کا روپ لے لیں گے
ہزار بادِ مخالف کا زور ہو لیکن
سفینے شدّتِ طوفاں کو مات دے دیں گے

حیات دست و گریباں ہوئی قضا سے مگر
ہزار سانپ نکل آئے آستینوں سے
بہت قریب تھی ساحل کی روشنی لیکن
سفینے جھوم کے ٹکرا گئے سفینوں سے

اس اختلاف بہم کی کڑی کشاکش میں
وہ ولولے وہ شرر سرد ہو گئے آخر
وہ ذرّے جن کو فضاؤں میں رقص کرنا تھا
بگولے بن نہ سکے گرد ہو گئے آخر

بہ ایں ہمہ نہ رُکے گی اس انقلاب کی رو
اس انقلاب کی ضو تیرگی مٹائے گی
جو آگ تیل کے چشموں کو چھو کے گزری ہے
سمندروں کی تہوں کو بھی چیر جائے گی

ماورا پبلشرز
۳- بہاول پور روڈ
لاہور

درد آشوب

(۱۹۶۶ء کا آدم جی ادبی انعام یافتہ)

احمد فراز

محبوب اختر کے نام

ترتیب

فن کاروں کے نام

تم نے دھرتی کے ماتھے پہ افشاں چُنی
خود اندھیری فضاؤں میں پلتے رہے
تم نے دُنیا کے خوابوں کی جنّت بُنی
خود فلاکت کے دوزخ میں جلتے رہے
تم نے اِنسان کے دل کی دھڑکن سُنی
اور خود عُمر بھر خوں اُگلتے رہے

جنگ کی آگ دنیا میں جب بھی جلی
امن کی لوریاں تم سناتے رہے
جب بھی تخریب کی تُند آندھی چلی
روشنی کے نشاں تم دکھاتے رہے
تم سے انساں کی تہذیب پھُولی پھلی
تم مگر ظلم کے تیر کھاتے رہے

تم نے شہکار خونِ جگر سے سجائے
اور اس کے عوض ہاتھ کٹوا دیئے
تم نے دنیا کو امرت کے چشمے دکھائے
اور خود زہرِ قاتل کے پیالے پیے
تم مرے تو زمانے کے ہاتھوں سے مارے
تم جیے تو زمانے کی خاطر جیے

تم پیمبر نہ تھے عرش کے مدّعی
تم نے دُنیا سے دنیا کی باتیں کہیں
تم نے ذرّوں کو تاروں کی تنویر دی
تم سے گو اپنی آنکھیں بھی چھینی گئیں
تم نے دُکھتے دلوں کی مسیحائی کی
اور زمانے سے تم کو صلیبیں ملیں

کاخ و دربار سے کوچۂ دار تک
کل جو تھے آج بھی ہیں وہی سلسلے
جیتے جی تو نہ پائی چمن کی مہک
موت کے بعد پھولوں کے مرقد ملے
اے مسیحاؤ! یہ خودکشی کب تلک
ہیں زمیں سے فلک تک بڑے فاصلے

۱۲

○

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

کچھ تو مرے پندارِ محبّت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ

پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رسم و رہِ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ

کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ

اِک عمر سے ہوں لذّتِ گریہ سے بھی محروم
اے راحتِ جاں مجھ کو رُلانے کے لیے آ

اب تک دلِ خوش فہم کو تجھ سے ہیں امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

○

قربتوں میں بھی جدائی کے زمانے مانگے
دل وہ بے مہر کہ رونے کے بہانے مانگے

ہم نہ ہوتے تو کسی اور کے چرچے ہوتے
خلقتِ شہر تو کہنے کو فسانے مانگے

یہی دل تھا کہ ترستا تھا مراسم کے لیے
اب یہی ترکِ تعلّق کے بہانے مانگے

اپنا یہ حال کہ جی ہار چکے لُٹ بھی چکے
اور محبّت وہی انداز پُرانے مانگے

زندگی ہم ترے داغوں سے رہے شرمندہ
اور تُو ہے کہ سدا آئینہ خانے مانگے

دل کسی حال پہ قانع ہی نہیں جانِ فراز
مل گئے تم بھی تو کیا اور نہ جانے مانگے

معبُود

بہت حسین ہیں تیری عقیدتوں کے گلاب
حسین تر ہے مگر ہر گلِ خیال ترا
ہم ایک درد کے رشتے میں منسلک دونوں
تجھے عزیز مرا فن، مجھے جمال ترا

مگر تجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم
تری نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے
تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری
لہو اُگلتی ہُوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں ہے اذیّت ہے زندگی بھر کی
یہاں گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے
یہاں قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اس قبیلۂ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو
پجاریوں کی عقیدت، پہ پھول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی
وفا پرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

۱۶

جُز ترے کوئی بھی دن رات نہ جانے میرے
تو کہاں ہے مگر اے دوست پُرانے میرے

تُو بھی خوشبو ہے مگر میرا تجسّس بے کار
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

شمع کی لَو تھی کہ وہ تُو تھا مگر ہجر کی رات
دیر تک روتا رہا کوئی سرہانے میرے

خلق کی بے خبری ہے کہ مری رسوائی
لوگ مجھ کو ہی سناتے ہیں فسانے میرے

لُٹ کے بھی خوش ہوں کہ اشکوں سے بھرا ہے دامن
دیکھ غارت گرِ دل یہ بھی خزانے میرے

آج اک اور برس بیت گیا اس کے بغیر
جس کے ہوتے ہُوئے ہوتے تھے زمانے میرے

— ق —

کاش تُو بھی مری آواز کہیں سُنتا ہو
پھر پکارا ہے تجھے دل کی صدا نے میرے

کاش تو بھی کبھی آ جائے مسیحائی کو
لوگ آتے ہیں بہت دل کو دکھانے میرے

کاش اوروں کی طرح میں بھی کبھی کہہ سکتا
بات سُن لی ہے مری، آج خدا نے میرے

تُو ہے کس حال میں اے زود فراموش مرے
مجھ کو تو چھین لیا عہدِ وفا نے میرے

چارہ گر یوں تو بہت ہیں مگر اے جانِ فراز
جز ترے اور کوئی زخم نہ جانے میرے

۱۹

○

نہ حریفِ جاں نہ شریکِ غم شبِ انتظار کوئی تو ہو
کسے بزمِ شوق میں لائیں ہم دلِ بے قرار کوئی تو ہو

کسے زندگی ہے عزیز اب کسے آرزوئے شبِ طرب
مگر اے نگارِ وفا طلب ترا اعتبار کوئی تو ہو

کہیں تارِ دامنِ گل ملے تو یہ مان لیں کہ چمن کھلے
کہ نشان فصلِ بہار کا سرِ شاخسار کوئی تو ہو

یہ اُداس اُداس سے بام و در، یہ اُجاڑ اُجاڑ سی رہگزر
چلو ہم نہیں نہ سہی مگر سرِ کوئے یار کوئی تو ہو

یہ سکونِ جاں کی گھڑی ڈھلے تو چراغِ دل ہی نہ بجھ چلے
وہ بلا سے ہو غمِ عشق یا غمِ روزگار کوئی تو ہو

سرِ مقتلِ شبِ آرزو رہے کچھ تو عشق کی آبرو
جو نہیں عدو تو فراز تو کہ نصیبِ دار کوئی تو ہو

شاخِ نہالِ غم

میں ایک برگِ خزاں کی مانند
کب سے شاخِ نہالِ غم پہ
لرز رہا ہوں
مجھے ابھی تک ہے یاد وہ جاں فگار ساعت
کہ جب بہاروں کی آخری شام
مجھ سے کچھ یوں لپٹ کے روئی
کہ جیسے اب عمر بھر نہ دیکھے گا
ہم میں ایک دوسرے کو کوئی

وہ رات کتنی کڑی تھی
جب آندھیوں کے شبِ خوں سے
بُوئے گل بھی لہو لہو تھی

سحر ہوئی جب تو پیڑیوں خشک و زرد رُو تھے
کہ جیسے مقتل میں میرے بچھڑے ہُوے رفیقوں کی
زخم خوردہ برہنہ لاشیں
گڑی ہُوئی ہوں

میں جانتا تھا
کہ جب یہ بوجھل اشجار
جن کی کہنہ جڑیں زمیں کی عمیق گہرائیوں میں برسوں سے جاگزیں تھیں
ہجومِ صرصر میں چند لمحے یہ ایستادہ نہ رہ سکے تو
میں ایک برگِ خزاں بھی
شاخِ نہالِ غم پر رہ سکوں گا

۲۲

وہ ایک پل تھا کہ ایک رُت تھی
مگر مرے واسطے بہت تھی
مجھے خبر ہے کہ کل بہاروں کی اوّلیں صبح
پھر سے بے برگ و بار شاخوں کو
زندگی کی نئی قبائیں عطا کرے گی
مگر مرا دل دھڑک رہا ہے
مجھے، جسے آندھیوں کی یورش
خزاں کے طوفاں نہ چھُو سکے تھے
کہیں نسیمِ بہار — شاخِ نہالِ غم سے
جُدا نہ کر دے

خود کلامی

دیکھے ہی نہیں وہ لب و رخسار وہ گیسو
بس ایک کھنکتی ہوئی آواز کا جادو
حیران پریشاں لیے پھرتا ہے بہر سُو
پابندِ تصوّر نہیں وہ جلوۂ بے تاب
ہو دُور تو جگنو ہے قریب آئے تو خوشبو
لہرائے تو شعلہ ہے چھنک جائے تو گھنگرو
باندھے ہیں نگاہوں نے صداؤں کے بھی منظر
وہ قہقہے جیسے بھری برسات میں کُوکُو
جیسے کوئی قمری سرِ شمشاد لبِ جُو

اے دل تری باتوں میں کہاں تک کوئی جائے

جذبات کی دنیا میں کہاں سوچ کے پہلو
کب آئے ہیں فتراک میں وحشت زدہ آہو

مانا کہ وہ لب ہوں گے شفق رنگ و شرر خو
شاید کہ وہ عارض ہوں گُلِ تر سے بھی خوشرو
دل کش ہی سہی حلقۂ زلف و خمِ ابرو

یہ کس کو خبر کس کا مقدّر ہے یہ سب کچھ

خوابوں کی گھٹا دور برس جائے گی اور تو
لوٹ آئے گا لے کر فقط آہیں فقط آنسو

دل تو وہ برگِ خزاں ہے کہ ہوا لے جائے
غم وہ آندھی ہے کہ صحرا بھی اُڑا لے جائے

کون لایا تری محفل میں ہمیں ہوش نہیں
کوئی آئے تری محفل سے اُٹھا لے جائے

اور سے اور ہوئے جاتے ہیں معیارِ وفا
اب متاعِ دل و جاں بھی کوئی کیا لے جائے

جانے کب اُبھرے تری یاد کا ڈوبا ہوا چاند
جانے کب دھیان کوئی ہم کو اُڑا لے جائے

یہی آوارگیِ دل ہے تو منزل معلوم
جو بھی آئے تری باتوں میں لگا لے جائے

دشتِ غربت میں تمہیں کون پکارے گا فراز
چل پڑو خود ہی جدھر دل کی صدا لے جائے

○

نہ انتظار کی لذّت نہ آرزو کی تھکن
بجھی ہیں درد کی شمعیں کہ سو گیا ہے بدن

سُلگ رہی ہیں نہ جانے کس آنچ سے آنکھیں
نہ آنسوؤں کی طلب ہے نہ رتجگوں کی جلن

دلِ فریب زدہ! دعوتِ نظر پہ نہ جا
یہ آج کے قد و گیسو ہیں کل کے دار و رسن

غریبِ شہر کسی سایۂ شجر میں نہ بیٹھ
کہ اپنی چھاؤں میں خود جل رہے ہیں سرو و سمن

بہارِ قرب سے پہلے اُجاڑ دیتی ہیں
جدائیوں کی ہوائیں محبّتوں کے چمن

وہ ایک رات گزر بھی گئی مگر اب تک
وصالِ یار کی لذّت سے ٹوٹتا ہے بدن

پھر آج شب ترے قدموں کی چاپ کے ہمراہ
سنائی دی ہے دلِ نامراد کی دھڑکن

یہ ظلم دیکھ کہ تُو جانِ شاعری ہے مگر
مری غزل میں ترا نام بھی ہے جرمِ سخن

امیرِ شہر غریبوں کو لوٹ لیتا ہے
کبھی بہ حیلۂ مذہب کبھی بنامِ وطن

ہوائے دہر سے دل کا چراغ کیا بجھتا
مگر فراز سلامت ہے یار کا دامن

۲۸

○

ہم تو یوں خوش تھے کہ اک تار گریباں میں ہے
کیا خبر تھی کہ بہار اس کے بھی ارماں میں ہے

ایک ضرب اور بھی اے زندگیِ تیشہ بدست
سانس لینے کی سکت اب بھی مری جاں میں ہے

میں تجھے کھو کے بھی زندہ ہوں یہ دیکھا تو نے
کس قدر حوصلہ ہارے ہوئے انساں میں ہے

فاصلے قرب کے شعلوں کو ہوا دیتے ہیں
میں ترے شہر سے دور اور تُو مرے دھیان میں ہے

سرِ دیوار فروزاں ہے ابھی ایک چراغ
اے نسیمِ سحری! کچھ ترے امکان میں ہے

دل دھڑکنے کی صدا آتی ہے گاہے گاہے
جیسے اب بھی تری آواز مرے کان میں ہے

خلقتِ شہر کے ہر ظلم کے باوصف فرازؔ
ہائے وہ ہاتھ کہ اپنے ہی گریبان میں ہے

○

خاموش ہو کیوں دادِ جفا کیوں نہیں دیتے
بسمل ہو تو قاتل کو دعا کیوں نہیں دیتے

وحشت کا سبب روزنِ زنداں تو نہیں ہے
مہر و مہ و انجم کو بجھا کیوں نہیں دیتے

اک یہ بھی تو اندازِ علاجِ غمِ جاں ہے
اے چارہ گرو! درد بڑھا کیوں نہیں دیتے

منصف ہو اگر تم تو کب انصاف کرو گے
مجرم ہیں اگر ہم تو سزا کیوں نہیں دیتے

رہزن ہو تو حاضر ہے متاعِ دل و جاں بھی
رہبر ہو تو منزل کا پتہ کیوں نہیں دیتے

کیا بیت گئی اب کے فرازؔ اہلِ چمن پر
یارانِ قفس مجھ کو صدا کیوں نہیں دیتے

اِظہار

پتّھر کی طرح اگر میں چپ رہوں
تو یہ نہ سمجھ کہ میری ہستی
بیگانۂ شعلۂ وفا ہے
تحقیر سے یوں نہ دیکھ مجھ کو
اے سنگ تراش! تیرا تیشہ
ممکن ہے کہ ضربِ اوّلیں سے
پہچان سکے کہ میرے دل میں
جو آگ ترے لیے دبی ہے
وہ آگ ہی میری زندگی ہے

خودکشی

وہ پیمان بھی ٹوٹے جن کو
ہم سمجھے تھے پائندہ
وہ شمعیں بھی داغ ہیں جن کو
برسوں رکھا تابندہ
دونوں وفا کر کے ناخوش ہیں
دونوں کیے پر شرمندہ
پیار سے پیارا جیون پیارے
کیا ماضی کیا آئندہ
ہم دونوں اپنے قاتل ہیں
ہم دونوں اب تک زندہ

(۱)

سُن بھی اے نغمہ سنجِ کنجِ چمن اب سماعت کا اعتبار کسے
کون سا پیرہن سلامت ہے دیجیے دعوتِ بہار کسے
جل بجھیں دردِ ہجر کی شمعیں گھل چکے نیم سوختہ پیکر
سر میں سودائے خام ہو بھی تو کیا طاقت و تابِ انتظار کسے
نقدِ جاں بھی تو نذر کر آئے اور ہم مفلسوں کے پاس تھا کیا
کون ہے اہلِ دل میں اتنا غنی اس قدر پاسِ طبعِ یار کسے
کاہشِ ذوقِ جستجو معلوم داغ ہے دل چراغ ہیں آنکھیں
ماتمِ شہرِ آرزو کیجے فرصتِ نغمۂ قرار کسے
کون دارائے ملکِ عشق ہُوا کس کو جاگیرِ چشم و زلف ملی
"خونِ فرہاد، برسرِ فرہاد" قصرِ شیریں پہ اختیار کسے
حاصلِ مشربِ مسیحائی سنگِ تحقیر و مرگِ رسوائی
قامتِ یار ہو کہ رفعتِ دار ان صلیبوں کا اعتبار کسے

○

دل بہلتا ہے کہاں انجم و مہتاب سے بھی
اب تو ہم لوگ گئے، دیدۂ بے خواب سے بھی

رو پڑا ہوں تو کوئی بات ہی ایسی ہوگی
میں کہ واقف تھا ترے ہجر کے آداب سے بھی

کچھ تو اس آنکھ کا شیوہ ہے خفا ہو جانا
اور کچھ بھول ہوئی ہے دلِ بیتاب سے بھی

اے سمندر کی ہوا تیرا کرم بھی معلوم
پیاس ساحل کی تو بجھتی نہیں سیلاب سے بھی

کچھ تو اُس حسن کو جانے ہے زمانہ سارا
اور کچھ بات چلی ہے مرے احباب سے بھی

دل کبھی غم کے سمندر کا شناور تھا فرازؔ
اب تو خوف آتا ہے اک موجۂ پایاب سے بھی

○

وفا کے باب میں الزامِ عاشقی نہ لیا
کہ تیری بات کی اور تیرا نام بھی نہ لیا

خوشا وہ لوگ کہ محرومِ التفات رہے
ترے کرم کو بہ اندازِ سادگی نہ لیا

تمھارے بعد کئی ہاتھ دل کی سمت بڑھے
ہزار شکر گریباں کو ہم نے سی نہ لیا

تمام مستی و تشنہ لبی کے ہنگامے
کسی نے سنگ اُٹھایا کسی نے مینا لیا

فراز ظلم ہے اتنی خود اعتمادی بھی
کہ رات بھی تھی اندھیری چراغ بھی نہ لیا

شکست

بارہا مجھ سے کہا دل نے کہ اے شعبدہ گر
تو کہ الفاظ سے اصنام گری کرتا ہے
کبھی اُس حسنِ دل آرا کی بھی تصویر بنا
جو تری سوچ کے خاکوں میں لہو بھرتا ہے

بارہا دل نے یہ آواز سنی اور چاہا!
مان لوں مجھ سے جو وجدان مرا کہتا ہے
لیکن اس عجز سے ہارا مرے فن کا جادو
چاند کو چاند سے بڑھ کر کوئی کیا کہتا ہے

زیرِ لب

کس بوجھ سے جسم ٹوٹتا ہے
اِتنا تو کڑا سفر نہیں تھا
دو چار قدم کا فاصلہ کیا
پھر راہ سے بے خبر نہیں تھا
لیکن یہ تھکن یہ لڑکھڑاہٹ
یہ حال تو عمر بھر نہیں تھا

آغازِ سفر میں جب چلے تھے
کب ہم نے کوئی دیا جلایا
کب عہدِ وفا کی بات کی تھی
کب ہم نے کوئی فریب کھایا
وہ شام وہ چاندنی وہ خوشبو
منزل کا کسے خیال آیا

تو محوِ سخن تھی مجھ سے لیکن
میں سوچ کے جال بُن رہا تھا
میرے لیے زندگی تڑپ تھی
تیرے لیے غم بھی قہقہا تھا
اب تجھ سے بچھڑ کے سوچتا ہوں
کچھ تو نے کہا تھا! کیا کہا تھا

○

ایسے چپ ہیں کہ یہ منزل بھی کڑی ہو جیسے
تیرا ملنا بھی جدائی کی گھڑی ہو جیسے

اپنے ہی سائے سے ہر گام لرز جاتا ہوں
راستے میں کوئی دیوار کھڑی ہو جیسے

کتنے ناداں ہیں ترے بھولنے والے کہ تجھے
یاد کرنے کے لیے عمر پڑی ہو جیسے

تیرے ماتھے کی شکن پہلے بھی دیکھی تھی مگر
یہ گرہ اب کے مرے دل میں پڑی ہو جیسے

منزلیں دور بھی ہیں منزلیں نزدیک بھی ہیں
اپنے ہی پاؤں میں زنجیر پڑی ہو جیسے

آج دل کھول کے روئے ہیں تو یوں خوش ہیں فرازؔ
چند لمحوں کی یہ راحت بھی بڑی ہو جیسے

○

کیا ایسے کم سخن سے کوئی گفتگو کرے
جو مستقل سکوت سے دل کو لہو کرے

اب تو ہمیں بھی ترکِ مراسم کا دُکھ نہیں
پر دل یہ چاہتا ہے کہ آغاز تو کرے

تیرے بغیر بھی تو غنیمت ہے زندگی
خود کو گنوا کے کون تری جستجو کرے

اب تو یہ آرزو ہے کہ وہ زخم کھائیے
تا زندگی یہ دل نہ کوئی آرزو کرے

تجھ کو بُھلا کے دل ہے وہ شرمندۂ نظر
اب کوئی حادثہ ہی ترے روبرو کرے

چپ چاپ اپنی آگ میں جلتے رہو فرازؔ
دنیا تو عرضِ حال سے بے آبرو کرے

○

ہر ایک بات نہ کیوں زہر سی ہماری لگے
کہ ہم کو دستِ زمانہ سے زخم کاری لگے

اُداسیاں ہوں مسلسل تو دل نہیں روتا
کبھی کبھی ہو تو یہ کیفیت بھی پیاری سے لگے

بظاہر ایک ہی شب ہے فراقِ یار مگر
کوئی گزارنے بیٹھے تو عمر ساری سے لگے

علاج اس دلِ درد آشنا کا کیا کیجیے
کہ تیر بن کے جسے حرفِ غمگساری سے لگے

ہمارے پاس بھی بیٹھو بس اتنا چاہتے ہیں
ہمارے ساتھ طبیعت اگر تمھاری سے لگے

فراز تیرے جنوں کا خیال ہے ورنہ
یہ کیا ضرور وہ صورت سبھی کو پیاری لگے

ہمدرد

اے دل ان آنکھوں پر نہ جا
جن میں وفورِ رنج سے
کچھ دیر کو تیرے لیے
آنسو اگر لہرا گئے

یہ چند لمحوں کی چمک
جو تجھ کو پاگل کر گئی!
اِن جگنوؤں کے نُور سے
چمکی ہے کب وہ زندگی
جس کے مقدّر میں رہی
صبحِ طلب سے تیرگی

۴۳

کس سوچ میں گم سم ہے تُو
اے بے خبر! ناداں نہ بن
تیری فسردہ روح کو
چاہت کے کانٹوں کی طلب
اور اس کے دامن میں فقط
ہمدردیوں کے پھُول ہیں

خواب

وہ چاند جو میرا ہم سفر تھا
دُوری کے اجاڑ جنگلوں میں
اب میری نظر سے چھپ چکا ہے

اِک عمر سے میں ملول و تنہا
ظلمات کی رہگزار میں ہوں
میں آگے بڑھوں کہ لوٹ جاؤں
کیا سوچ کے انتظار میں ہوں
کوئی بھی نہیں جو یہ بتائے
میں کون ہوں کس دیار میں ہوں

○

سو دوریوں پہ بھی مرے دل سے جدا نہ تھی
تُو میری زندگی تھی مگر بے وفا نہ تھی

دل نے ذرا سے غم کو قیامت بنا دیا
ورنہ وہ آنکھ اتنی زیادہ خفا نہ تھی

یوں دل لرز اُٹھا ہے کسی کو پکار کر
میری صدا بھی جیسے کہ میری صدا نہ تھی

برگِ خزاں جو شاخ سے ٹوٹا وہ خاک تھا
اس جاں سپردگی کے تو قابل ہوا نہ تھی

جگنو کی روشنی سے بھی کیا کیا بھڑک اُٹھی
اس شہر کی فضا کہ چراغ آشنا نہ تھی

مرہونِ آسماں جو رہے اُن کو دیکھ کر
خوش ہوں کہ میرے ہونٹوں پہ کوئی دعا نہ تھی

ہر جسم داغ داغ تھا لیکن فرازؔ ہم
بدنام یوں ہوئے کہ بدن پر قبا نہ تھی

○

جو بھی دکھ یاد نہ تھا یاد آیا
آج کیا جانیے کیا یاد آیا

پھر کوئی ہاتھ ہے دل پر جیسے
پھر ترا عہدِ وفا یاد آیا

جس طرح دھند میں لپٹے ہوئے پھول
ایک اک نقش ترا یاد آیا

ایسی مجبوری کے عالم میں کوئی
یاد آیا بھی تو کیا یاد آیا

۴۸

اے رفیقو سرِ منزل جا کر
کیا کوئی آبلہ پا یاد آیا

یاد آیا تھا بچھڑنا تیرا
پھر نہیں یاد کہ کیا یاد آیا

جب کوئی زخم بھرا داغ بنا
جب کوئی بھول گیا یاد آیا

یہ محبت بھی ہے کیا روگ فرازؔ
جس کو بھولے وہ سدا یاد آیا

سوال

(فراقؔ کی تصویر دیکھ کر)

ایک سنگ تراش جس نے برسوں
ہیروں کی طرح صنم تراشے
آج اپنے صنم کدے میں تنہا
مجبور، نڈھال، زخم خوردہ
دن رات پڑا کراہتا ہے

چہرے پہ اُجاڑ زندگی کے
لمحات کی اَن گنت خراشیں
آنکھوں کے شکستہ مرقدوں میں
روٹھی ہُوئی حسرتوں کی لاشیں

سانسوں کی تھکن بدن کی ٹھنڈک
احساس سے کب تلک لہو لے
ہاتھوں میں کہاں سکت کہ بڑھ کر
خود ساختہ پیکروں کو چھُو لے

یہ زخمِ طلب یہ نامرادی
ہر بُت کے لبوں پہ ہے تبسّم
اے تیشہ بدست دیوتاؤ!
تخلیق عظیم ہے کہ خالق
انسان جواب چاہتا ہے

غریبِ شہر کے نام

غریبِ شہر تری دُکھ بھری نوا پہ سلام
تری طلب، تری چاہت تری وفا پہ سلام
ہر ایک حرفِ تمنّائے دلربا پہ سلام
حدیثِ درد و سکوتِ سخن ادا پہ سلام
دریدہ دل! ترے آہنگ سازِ غم پہ نثار
گہر فروش! ترے رنگ چشمِ نم پہ نثار

جنوں کا شہر ہے آباد فصلِ دار کی خیر
ہر ایک دل ہے گریباں بھری بہار کی خیر
بجھے ہیں بام مگر شمع رہگزار کی خیر
تمام عمر تو گزرے اس انتظار کی خیر
رخِ نگار و غمِ یار کو نظر نہ لگے
گلہ نہیں ہے اگر آنکھ عمر بھر نہ لگے

دل و نظر کی شکستوں کا کیا شمار کریں
شمارِ زخم عبث ہے نجات سے پہلے
کچھ اور دیدۂ خوں رنگ کو گلاب کریں
صبا کا ذکر قیامت ہے رات سے پہلے
ابھی لبوں پہ حکایاتِ خوں چکیدہ سہی
بہ سینہ رہ سپرم دست و پا بریدہ سہی

○

زخم کو پھول تو صرصر کو صبا کہتے ہیں
جانے کیا دور ہے کیا لوگ ہیں کیا کہتے ہیں

کیا قیامت ہے کہ جن کے لیے رُک رُک کے چلے
اب وہی لوگ ہمیں آبلہ پا کہتے ہیں

کوئی بتلاؤ کہ اک عمر کا بچھڑا محبوب
اتفاقاً کہیں مل جائے تو کیا کہتے ہیں

یہ بھی اندازِ سخن ہے کہ جفا کو تیری
غمزہ و عشوہ و انداز و ادا کہتے ہیں

جب تلک دور ہے تو تیری پرستش کر لیں
ہم جسے چھو نہ سکیں اُس کو خدا کہتے ہیں

کیا تعجب ہے کہ ہم اہلِ تمنّا کو فراز
وہ جو محرومِ تمنّا ہیں بُرا کہتے ہیں

(۰)

گل ہو چراغ مے تو سزاوارِ سنگ ہیں
مینا سرشت ہم بھی شہیدانِ رنگ ہیں

مطرب کی بے دلی ہے کہ محفل کی بے حسی
کس تیغ سے ہلاکِ نواہائے چنگ ہیں؟

دل خلوتِ خیال کی آرائشوں میں گم
آنکھیں نگار خانۂ ہستی پہ دنگ ہیں

تاب و تواں نہیں ہے مگر حوصلے تو دیکھ
شیشہ صفات پھر بھی حریفانِ سنگ ہیں

اے حسنِ سادہ دل تری رسوائیاں نہ ہوں
کچھ لوگ کشتۂ ہوسِ نام و ننگ ہیں

معذور ہیں تلوّنِ خاطر کو کیا کریں
ہم خود فراز اپنی طبیعت سے تنگ ہیں

○

وہی جنوں ہے وہی کوچۂ ملامت ہے
شکستِ دل پہ بھی عہدِ وفا سلامت ہے

یہ ہم جو باغ و بہاراں کا ذکر کرتے ہیں
تو مدّعا وہ گُلِ تر وہ سروِ قامت ہے

بجا یہ فرصتِ ہستی مگر دلِ ناداں
نہ یاد کر کہ اسے بھولنا قیامت ہے

چلی چلے یونہی رسمِ وفا و مشقِ ستم
کہ تیغِ یار و سرِ دوستاں سلامت ہے

سکوتِ بحر سے ساحل لرز رہا ہے مگر
یہ خامشی کسی طوفان کی علامت ہے

عجیب وضع کا احمد فراز ہے شاعر
کہ دل دریدہ مگر پیرہن سلامت ہے

پیغام بر

میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
اپنے اپنے دکھ کی تاریکی لیے
تم آ گئے کیوں میرے پاس
غم کے انباروں کو کاندھے پر دھرے
بوجھل صلیبوں کی طرح
آشفتہ مو افسردہ رو خونیں لباس
ہونٹ محرومِ تکلّم پر سراپا التماس
اس تمنّا پر کہ تم کو مل سکے

۵۷

غم کے انباروں کے بدلے
مسکراہٹ کی کرن — جینے کی آس
ہیں مگر کرنوں کا سوداگر نہیں
ہیں نہیں جوہر شناس
صورتِ انبوہِ دریوزہ گراں
سب کے دل ہیں قہقہوں سے چُور
لیکن آنکھ سے آنسو رواں
سب کے سینوں ہیں اُمیدوں کے چراغاں
اور چہروں پر شکستوں کا دھواں
زندگی سب سے گریزاں
سوئے مقتل سب رواں
سب نحیف و ناتواں
سب کے سب اک دوسرے کے ہمسفر
اِک دوسرے سے بدگماں

سب کی آنکھوں میں خیالِ مرگ سے خوف و ہراس
میری باتوں سے میری آواز سے
تم نے یہ جانا کہ میں بھی
لے کے آیا ہوں تمھارے واسطے وہ معجزے
جن سے بھر جائیں گے پل بھر میں تمھارے
اَن گنت صدیوں کے لاتعداد زخم
دم بخود سانسوں کو ٹھہرائے ہوئے بے جان جسم
منتظر ہیں قم باذنی کی صدائے سحر کے
ایشیا پیغمبروں کی سرزمیں
اور تم اس کے زبوں قسمت مکیں ..... تیرہ جبیں
منّ و سلویٰ کے لیے دامن کش
قحط خوردہ زار و بیمار و حزیں
صرف تقدیر و توکّل پر یقیں
تم کو شیرینِ طلب کی چاہ لیکن بے ستونِ غم کی سل کو

چھیڑنے کا حوصلہ، یارا نہیں
تم یدِ بیضا کے قائل، بازوئے فرہاد کی قوت سے بہرہ ور نہیں
تم کہ ہو کوہِ گرفتہ ..... زندگی سے دور
مردہ ساحروں کی بے نشاں قبروں کے سجادہ نشیں
خاکِ دان کی اس گلِ تاریک کا
میں بھی اک پیکر ہوں، پیکر گر نہیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں
ریت کے تپتے ہوئے ٹیلوں پہ استادہ ہو تم
سایۂ ابرِ رواں کو دیکھتے رہنا تمہارا جزوِ دیں
سات قلزم موجزن چاروں طرف
اور تمہارے بخت میں شبنم نہیں
اپنے اپنے دکھ کی بوجھل گٹھڑیوں کو
تم نے کھولا ہے کبھی ؟
اپنے ہم جنسوں کے سینوں کو ٹٹولا ہے کبھی ؟

سب کی روحیں گرسنہ .... سب کی متاعِ درد میں
دوسروں کا خون پینے کی ہوس
ایک کا دکھ دوسروں سے کم نہیں
ایک کا دُکھ تشنگی، بیچارگی
دوسروں کا دُکھ مگر افراطِ مے .... دیوانگی
پیاس اور نشّے کا دکھ
اپنے انباروں سے مل کر چھانٹ لو
پیاس اور نشّے کا دُکھ اک دوسرے میں بانٹ لو
پھر تمھاری زندگی شاید نہ ہو
شاکیٔ عرشِ بریں و رحمت اللعالمیں
میں کوئی کرنوں کا سوداگر نہیں

روز کی مسافت سے چُور ہو گئے دریا
پتھروں کے سینوں پر تھک گئے سو گئے دریا

جانے کون کاٹے گا فصل لعل و گوہر کی
ریتلی زمینوں میں سنگ بو گئے دریا

اے سحابِ غم کب تک یہ گریز آنکھوں سے
انتظارِ طوفاں میں خشک ہو گئے دریا

چاندنی میں آتی ہے کس کو ڈھونڈنے خوشبو
ساحلوں کے پھولوں کو کب سے رو گئے دریا

بجھ گئی ہیں قندیلیں خواب ہو گئے چہرے
آنکھ کے جزیروں کو پھر ڈبو گئے دریا

دل چٹان کی صورت سیلِ غم پہ ہنستا ہے
جب نہ بن پڑا کچھ بھی داغ دھو گئے دریا

زخمِ نامرادی سے ہم فراز زندہ ہیں
دیکھنا سمندر میں غرق ہو گئے دریا

○

تو کہ انجان ہے اس شہر کے آداب سمجھ
پھول روئے تو اسے خندۂ شاداب سمجھ

کہیں آ جائے میسّر تو مقدر ہے تیرا
ورنہ آسودگیٔ دہر کو نایاب سمجھ

حسرتِ گریہ میں جو آگ ہے اشکوں میں نہیں
خشک آنکھوں کو مری چشمۂ بے آب سمجھ

موجِ دریا ہی کو آوارۂ صد شوق نہ کہہ
ریگِ ساحل کو بھی لب تشنۂ سیلاب سمجھ

یہ بھی وا ہے کسی مانوس کرن کی خاطر
روزنِ در کو بھی اک دیدۂ بے خواب سمجھ

اب کسے ساحلِ اُمید سے تکتا ہے فراز
وہ جو اک کشتیٔ دل تھی اسے غرقاب سمجھ

خدائے برتر

خدائے برتر
مری محبّت
تری محبّت کی رفعتوں سے عظیم تر ہے
تری محبّت کا درخورِ اعتنا
فقط بیکراں سمندر
کہ جس کی خاطر
سدا تری رحمتوں کے بادل
کبھی کسی آبشار کی نغمگی کے موتی
کبھی کسی آبجو کے آنسو

۶۵

کبھی کسی جھیل کے ستارے

کہیں سے شبنم کہیں سے چشمے کہیں سے دریا اُڑا کے لائے

کہ تیرے محبوب کو جلال و جمال بخشیں

تری محبّت تو اس شہنشاہ کی طرح ہے

جو دوسروں کے ہُنر سے، خونِ جگر سے

اپنی وفا کو دوام بخشے

مگر مری بے بساط چاہت

فقط مرے آنسوؤں سے

میرے لہُو سے ..... میری ہی آبرُو سے

رہی ہے زندہ

اگرچہ اس بے بضاعتی نے

مجھے ہمیشہ شکست دی ہے

مگر یہ ناکامیِ تمنّا بھی

اس محبّت سے کامراں تر عظیم تر ہے

جو اپنی سطوت کے بل پر
اوروں کی آہ و زاری سے
اپنے جذبِ وفا کی تشہیر چاہتی ہے
مری محبّت نے
جو بھی نامِ حبیب سے کر دیا معنون
وہ حرف میرا ہے، میرا اپنا ہے
اے خدائے بزرگ و برتر

○

قرب جز داغِ جدائی نہیں دیتا کچھ بھی
تو نہیں ہے تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

دل کے زخموں کو نہ رو، دوست کا احسان سمجھ
ورنہ وہ دستِ حنائی نہیں دیتا کچھ بھی

کیا اسی زہر کو تریاق سمجھ کر پی لیں
ناصحوں کو تو سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی

ایسا گم ہوں تری یادوں کے بیابانوں میں
دل نہ دھڑکے تو سنائی نہیں دیتا کچھ بھی

سوچتا ہوں تو ہر اک نقش میں دنیا آباد
دیکھتا ہوں تو دکھائی نہیں دیتا کچھ بھی

یوسفِ شعر کو کس مصر میں لائے ہو فرازؔ
ذوقِ آشفتہ نوائی نہیں دیتا کچھ بھی

○

دوست بن کر بھی نہیں ساتھ نبھانے والا
وہی انداز ہے ظالم کا زمانے والا

اب اسے لوگ سمجھتے ہیں گرفتار مرا
سخت نادم ہے مجھے دام میں لانے والا

صبحدم چھوڑ گیا نکہتِ گُل کی صورت
رات کو غنچۂ دل میں سمٹ آنے والا

کیا کہیں کتنے مراسم تھے ہمارے اس سے
وہ جو اک شخص ہے منہ پھیر کے جانے والا

تیرے ہوتے ہوئے آجاتی تھی ساری دنیا
آج تنہا ہوں تو کوئی نہیں آنے والا

منتظر کس کا ہوں ٹوٹی ہوئی دہلیز پہ میں
کون آئے گا یہاں کون ہے آنے والا

کیا خبر تھی جو مری جاں میں گھُلا ہے اتنا
ہے وہی مجھ کو سرِ دار بھی لانے والا

میں نے دیکھا ہے بہاروں میں چمن کو جلتے
ہے کوئی خواب کی تعبیر بتانے والا

تم تکلّف کو بھی اخلاص سمجھتے ہو فرازؔ
دوست ہوتا نہیں ہر ہاتھ ملانے والا

۷۰

○

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے
وہ بُت ہے یا خدا دیکھا نہ جائے

یہ کن نظروں سے تو نے آج دیکھا
کہ تیرا دیکھنا دیکھا نہ جائے

ہمیشہ کے لیے مجھ سے بچھڑ جا
یہ منظر بارہا دیکھا نہ جائے

۱۷

غلط ہے جو سنا، پر آزما کر
تجھے اے بے وفا دیکھا نہ جائے

یہ محرومی نہیں پاسِ وفا ہے
کوئی تیرے سوا دیکھا نہ جائے

یہی تو آشنا بنتے ہیں آخر
کوئی نا آشنا دیکھا نہ جائے

فرازؔ اپنے سوا ہے کون تیرا
تجھے تجھ سے جدا دیکھا نہ جائے

خود غرض

اے دل! اپنے درد کے کارن تو کیا کیا بیتاب رہا
دن کے ہنگاموں میں ڈوبا راتوں کو بے خواب رہا
لیکن تیرے زخم کا مرہم تیرے لیے نایاب رہا

پھر اک انجانی صورت نے تیرے دکھ کے گیت سُنے
اپنی سندرتا کی کرنوں سے چاہت کے خواب بُنے
خود کانٹوں کی باڑھ سے گزری تیری راہ میں پھول چُنے

اے دل جس نے تیری محرومی کے داغ کو دھویا تھا
آج اس کی آنکھیں پُرنم تھیں اور تو سوچ میں کھویا تھا
دیکھ پرائے دکھ کی خاطر تو بھی کبھی یوں رویا تھا؟

وابستگی

آ گئی پھر وہی پہاڑ سی رات
دوش پر ہجر کی صلیب لیے
ہر ستارہ ہلاکِ صبح طلب
منزلِ خواہشِ حبیب لیے

اس سے پہلے بھی شامِ وصل کے بعد
کاروانِ دل و نگاہ چلا
اپنی اپنی صلیب اُٹھائے ہُوئے
ہر کوئی سُوئے قتل گاہ چلا

کتنی باہوں کی ٹہنیاں ٹوٹیں
کتنے ہونٹوں کے پھول چاک ہُوئے
کتنی آنکھوں سے چھن گئے موتی
کتنے چہروں کے رنگ خاک ہُوئے

پھر بھی ویراں نہیں کُوئے مراد
پھر بھی شب زندہ دار ہیں زندہ
پھر بھی روشن ہے بزمِ رسمِ وفا
پھر بھی ہیں کچھ چراغ تابندہ

وہی قاتل جو اپنے ہاتھوں سے
ہر مسیحا کو دار کرتے ہیں
پھر اسی کی مراجعت کے لیے
حشر تک انتظار کرتے ہیں

○

دل بھی بجھا ہو شام کی پرچھائیاں بھی ہوں
مر جائیے جو ایسے میں تنہائیاں بھی ہوں

آنکھوں کی سرخ لہر ہے موجِ سپردگی
یہ کیا ضرور ہے کہ اب انگڑائیاں بھی ہوں

ہر حسنِ سادہ لوح نہ دل میں اُتر سکا
کچھ تو مزاجِ یار میں گہرائیاں بھی ہوں

دنیا کے تذکرے تو طبیعت ہی لے بجھے
بات اس کی ہو تو پھر سخن آرائیاں بھی ہوں

پہلے پہل کا عشق ابھی یاد ہے فراز
دل خود یہ چاہتا تھا کہ رسوائیاں بھی ہوں

○

جب تری یاد کے جگنو چمکے
دیر تک آنکھ میں آنسو چمکے

سخت تاریک ہے دل کی دنیا
ایسے عالم میں اگر تُو چمکے

ہم نے دیکھا سرِ بازارِ وفا
کبھی موتی کبھی آنسو چمکے

شرط ہے شدّتِ احساسِ جمال
رنگ تو رنگ ہے خوشبو چمکے

آنکھ مجبورِ تماشا ہے فراز
ایک صورت ہے کہ ہر سُو چمکے

ممدوح

میں نے کب کی ہے ترے کاکل و لب کی تعریف
میں نے کب لکھے قصیدے ترے رخساروں کے
میں نے کب تیرے سراپا کی حکایات کہیں
میں نے کب شعر کہے جھومتے گلزاروں کے
جانے دو دن کی محبت میں یہ بہکے ہوئے لوگ
کیسے افسانے بنا لیتے ہیں دلداروں کے

میں کہ شاعر تھا مرے فن کی روایت تھی یہی
مجھ کو اک پھول نظر آئے تو گلزار کہوں
مسکراتی ہوئی ہر آنکھ کو قاتل جانوں
ہر نگاہِ غلط انداز کو تلوار کہوں
میری فطرت تھی کہ میں حسنِ بیاں کی خاطر
ہر حسیں لفظ کو در مدحِ رُخِ یار کہوں

میرے دل میں بھی کھلے ہیں تری چاہت کے کنول
ایسی چاہت کہ جو وحشی ہو تو کیا کیا نہ کرے
مجھے گر ہو بھی تو کیا زعمِ طوافِ شعلہ
تو ہے وہ شمع کہ پتھر کی بھی پروا نہ کرے
میں نہیں کہتا کہ تجھ سا ہے نہ مجھ سا کوئی
ورنہ شوریدگیٔ شوق تو دیوانہ کرے

کیا یہ کم ہے کہ ترے حسن کی رعنائی سے
میں نے وہ شمعیں جلائی ہیں کہ مہتاب نثار
تیرے پیمانِ وفا سے مرے فن نے سیکھی
وہ دل آویز صداقت کہ کئی خواب نثار
تیرے غم نے مرے وجدان کو بخشی وہ کسک
مرے دشمن مرے قاتل، مرے احباب نثار

میں کسی غم میں بھی رویا ہوں تو میں نے دیکھا
تیرے دکھ سے کوئی مجروح نہیں تیرے سوا
میرے پیکر میں تری ذات گھُلی ہے اتنی
کہ مرا جسم مری روح نہیں تیرے سوا
میرا موضوعِ سخن تو ہو کہ ساری دنیا
درحقیقت کوئی ممدوح نہیں تیرے سوا

○

پیام آئے ہیں اس یارِ بے وفا کے مجھے
جسے قرار نہ آیا کہیں بھلا کے مجھے

جدائیاں ہوں تو ایسی کہ عمر بھر نہ ملیں
فریب دو تو ذرا سلسلے بڑھا کے مجھے

نشے سے کم تو نہیں یادِ یار کا عالم
کہ لے اُڑا ہے کوئی دوش پر ہوا کے مجھے

میں خود کو بھول چکا تھا مگر جہاں والے
اُداس چھوڑ گئے آئینہ دکھا کے مجھے

تمہارے بام سے اب کم نہیں ہے رفعتِ دار
جو دیکھنا ہو تو دیکھو نظر اُٹھا کے مجھے

کھنچی ہوئی ہے مرے آنسوؤں میں اِک تصویر
فرازؔ دیکھ رہا ہے وہ مسکرا کے مجھے

O

بے نیازِ غمِ پیمانِ وفا ہو جانا
تم بھی اوروں کی طرح مجھ سے جُدا ہو جانا

میں بھی پلکوں پہ سجا لوں گا لہو کی بوندیں
تم بھی پابستۂ زنجیرِ حنا ہو جانا

گرچہ اب قرب کا امکاں ہے بہت کم پھر بھی
کہیں مل جائیں تو تصویر نما ہو جانا

صرف منزل کی طلب ہو تو کہاں ممکن ہے
دوسروں کے لیے خود آبلہ پا ہو جانا

خلق کی سنگ زنی میری خطاؤں کا صلہ
تم تو معصوم ہو تم دُور ذرا ہو جانا

اب مرے واسطے تریاق ہے الحاد کا زہر
تم کسی اور پجاری کے خدا ہو جانا

اے نگارِ گُل

نگارِ گل تجھے وہ دن بھی یاد ہوں شاید
کہ جن کے ذکر سے اب دل پہ تازیانہ لگے

تری طلب میں وہ دار و رسن کے ہنگامے
کہ جن کی بات کریں بھی تو اب فسانہ لگے

بقدرِ ذوق جلاتے رہے لہو کے چراغ
کہ تُو جب آئے تو یہ گھر نگار خانہ لگے

اِسی خیال سے ہر زخم اپنے دل پہ سہا
کہ تجھ کو گردشِ ایّام کی ہوا نہ لگے
مگر جو گزری ہے ہم پر ترے حصول کے بعد
وہ حالِ غم بھی کہیں گر تجھے بُرا نہ لگے

نگارِ گل وہ ہمیں تھے ترے تمنّائی
کہ جن کے خوں سے ترے رنگ تابناک ہوئے
ہمیں ہیں جن سے قبا تیری لالہ رنگ ہُوئی
ہمیں ہیں وہ جو تری رہگزر میں خاک ہوئے
خزاں تو خیر ستم کیشیوں کی رُت تھی مگر
بہار میں بھی ہمارے جگر ہی چاک ہوئے
ہمیں منارۂ کسریٰ کو توڑنے والے
ترے حریم میں آ کر ہمیں ہلاک ہوئے

نگارِ گُل یہ تقاضہ مگر وفا کا ہے
کہ اب بھی ہم ترے وعدوں کا اعتبار کریں
گزر گئی جو گزرنی تھی سخت جانوں پر
پھر آج تیری جفاؤں کا کیا شمار کریں
الم گزیدہ سہی پیرہن دریدہ سہی
مگر لبوں پہ غمِ دل نہ آشکار کریں
یہی اصول رہا ہے وفا پرستوں کا
ہر ایک حال میں توصیفِ حسنِ یار کریں
جبیں سے دھو کے ہر اک نقش نامرادی کا
نگارِ گُل ترے جلووں کا انتظار کریں

گُلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو

عمر گزری ہے سجاتے ہوئے بام و در کو
اس تمنّا پہ کہ وہ جانِ بہار آئے گی
فرشِ رہ دیدہ و دل تھے کہ وہ آسودہ خرام
درد کی آگ کو گلزار بنا جائے گی
اس توقع پر خرابے رہے آغوش کشا
کھُل کے برسے گی اگر ابر کی گھٹا چھائے گی
ایک اک لمحہ قیامت کی طرح گزرا ہے
آخرِ کار وہ محبوبِ نظر بھی آئی

منتظر آنکھیں تو پتھرا ہی چکی تھیں لیکن
کشتگانِ شبِ فرقت کی سحر بھی آئی
جسم کیوں شل ہیں دھڑکتے ہوئے دل کیوں چپ ہیں
جرسِ گل کی تو آواز ادھر بھی آئی

آج پھر کرتے ہو کس زعم پہ زخموں کا شمار
سر پھرو! وادیٔ پُرخار میں یہ تو ہوگا
کیوں نگاہوں میں ہے افسردہ چراغوں کا دھواں
آرزوئے لب و رخسار میں یہ تو ہوگا
ایک سے ایک کڑی منزلِ جاں آئے گی
رہگزارِ طلبِ یار میں یہ تو ہوگا

ہونٹ سل جائیں مگر جراٗتِ اظہار رہے
دل کی آواز کو مدھم نہ کرو دیوانو!

وصل چکی رات تو اب کہر بھی چھٹ جائے گی
اب بھی امید کی لو کم نہ کرو دیوانو!
آندھیاں آیا ہی کرتی ہیں ہر اک حبس کے بعد
گلشدہ شمعوں کا ماتم نہ کرو دیوانو!

○

دل میں اب طاقت کہاں خوننابہ افشانی کرے
ورنہ غم وہ زہر ہے پتّھر کو بھی پانی کرے

عقل وہ ناصح کہ ہر دم لغزشِ پا کا خیال
دل وہ دیوانہ یہی چاہے کہ نادانی کرے

ہاں مجھے بھی ہو گلہ بے مہریٔ حالات کا
تجھ کو آزردہ اگر میری پریشانی کرے

یہ تو اک شہرِ جنوں ہے چاک دامانو! یہاں
سب کے سب وحشی ہیں کس کو کون زندانی کرے

موسمِ گُل ہے مگر بے رنگ ہے، شاخِ مژہ
کتنا شرمندہ ہمیں آنکھوں کی ویرانی کرے

ہنستے چہروں سے دلوں کے زخم پہچانے گا کون
تجھ سے بڑھ کر ظلم اپنی خندہ پیشانی کرے

ناصحوں کو کون سمجھائے نہ سمجھے گا فرازؔ
وہ تو سب کی بات سُن لے اور من مانی کرے

○

بے سر و ساماں تھے لیکن اتنا اندازہ نہ تھا
اس سے پہلے شہر کے لٹنے کا آوازہ نہ تھا

ظرفِ دل دیکھا تو آنکھیں کرب سے پتھرا گئیں
خون رونے کی تمنّا کا یہ خمیازہ نہ تھا

آمرے پہلو میں آ اے رونقِ بزمِ خیال
لذّتِ رخسار و لب کا اب تک اندازہ نہ تھا

ہم نے دیکھا ہے خزاں میں بھی تری آمد کے بعد
کون سا گل تھا کہ گلشن میں تر و تازہ نہ تھا

ہم قصیدہ خواں نہیں اس حسن کے لیکن فرازؔ
اتنا کہتے ہیں رہینِ سُرمہ و غازہ نہ تھا

○

تپتے صحراؤں پہ گرجا سرِ دریا برسا
تھی طلب کس کو مگر ابر کہاں جا برسا

کتنے طوفانوں کی حامل تھی لہو کی اک بوند
دل میں اک لہر اُٹھی آنکھ سے دریا برسا

کوئی غرقاب کوئی ماہیٔ بے آب ہُوا
ابرِ بے فیض جو برسا بھی تو کیسا برسا

چڑھتے دریاؤں میں طوفان اُٹھانے والے
چند بوندیں ہی سرِ دامنِ صحرا برسا

طنز ہیں سوختہ جانوں پہ گرجتے بادل
یا تو گھنگھور گھٹائیں نہ اُٹھا، یا برسا

ابرِ باراں کے خدا، جھومتا بادل نہ سہی
آگ ہی اب سرِ گلزارِ تمنّا برسا

اپنی قسمت کہ گھٹاؤں میں بھی جلتے ہیں فرازؔ
اور جہاں وہ ہیں وہاں ابر کا سایہ برسا

○

افعی کی طرح ڈسنے لگی موجِ نفس بھی
اے زہرِ غمِ یار بہت ہو چکی بس بھی

یہ حبس تو جلتی ہوئی رُت سے بھی گراں ہے
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اب تو برس بھی

آئینِ خرابات معطّل ہے تو کچھ روز
اے رندِ بلا نوش و تہی جام ترس بھی

صیّاد و نگہبانِ چمن پر ہے یہ روشن
آباد ہمیں سے ہے نشیمن بھی قفس بھی

محرومیٔ جاوید گنہگار نہ کر دے
بڑھ جاتی ہے کچھ ضبطِ مسلسل سے ہوس بھی

اے مرے بیدرد شہر

دل سلگ اُٹھتا ہے اپنے بام و در کو دیکھ کر
پھیلنے لگتی ہیں جب بھی شام کی پرچھائیاں
اس قدر ویران لمحے، اس قدر سنسان رات
سوچ میں گم ہیں اُفق سے تا اُفق پہنائیاں
کس لیے روشن کرے دل دیوار و در کوئی تو ہو
گنگ دیواروں میں کیا ہوں انجمن آرائیاں

۹۵

دردِ ہر شب جاگ اُٹھتے ہیں کئی ماہ و نجوم
آگ بھڑکاتی ہیں سنگ و خشت کی رعنائیاں
راستوں سے خوابگاہوں تک مسلسل موجِ رنگ
جس طرح قوسِ قزح کی ٹوٹتی انگڑائیاں
زخمِ نظارہ لیے آنکھوں میں چپ تکتا رہا
گو مری نیندیں بھی مجھ سے لے اُڑیں شہنائیاں

کل ذرا سی دیر چمکے تھے مرے دیوار و در
جھلملا اُٹھیں تھیں میری روح کی گہرائیاں
چند لمحوں کے لیے لَو دے اُٹھا تھا اک چراغ
اور دمک اُٹھی تھیں کچھ لمحے مری تنہائیاں!
آج اتنا شور کیوں ہے اے مرے بیدرد شہر
ہر نظر میری طرف ہے اس قدر رسوائیاں؟

○

گھر میں کتنا سناٹا ہے باہر کتنا شور
یا دنیا دیوانی ہے یا میرا دل ہے چور

کبھی تو آنکھوں کے گلزاروں میں بھی آکر ناچ
دل میں کون تجھے دیکھے گا اے جنگل کے مور

یوں پھرتے ہیں گلیوں میں گھبرائے گھبرائے سے
جیسے اس بستی کے سائے بھی ہوں آدم خور

سوچ کی چنگاری بھڑکا کر کیا نادانی کی
اس لمحے سے لے کر اب تک آگ ہے چاروں اور

چاک گریباں پھرنا کس کو خوش آتا ہے فرازؔ
ہم بھی اس کو بھول نہ جائیں دل پہ اگر ہو زور

○

پھر اسی راہگزر پر شاید
ہم کبھی مل سکیں مگر شاید

جن کے ہم منتظر رہے ان کو
مل گئے اور ہمسفر شاید

جان پہچان سے بھی کیا ہوگا
پھر بھی اے دوست غور کر شاید

اجنبیت کی دھند چھٹ جائے
چمک اُٹھے تری نظر شاید

زندگی بھر لہو رُلائے گی
یادِ یارانِ بے خبر شاید

جو بھی بچھڑے وہ کب ملے ہیں فراز
پھر بھی تو انتظار کر شاید

○

اب وہ جھونکے کہاں صبا جیسے
آگ ہے شہر کی ہوا جیسے

شب سلگتی ہے دوپہر کی طرح
چاند، سورج سے جل بجھا جیسے

مدّتوں بعد بھی یہ عالم ہے
آج ہی تو جُدا ہُوا جیسے

اس طرح منزلوں سے ہوں محروم
میں شریکِ سفر نہ تھا جیسے

اب بھی ویسی ہے دُوریٔ منزل
ساتھ چلتا ہو راستہ جیسے

اتفاقاً بھی زندگی میں فراز
دوست ملتے نہیں ضیاؔ[1] جیسے

[1] ضیاء الدین ضیاؔ

تریاق

جب تیری اُداس انکھڑیوں میں
پل بھر کو چمک اُٹھے تھے آنسو
کیا کیا نہ گزر گئی تھی دل پر!
جب میرے لیے ملول تھی تو

کہنے کو وہ زندگی کا لمحہ
پیمانِ وفا سے کم نہیں تھا
ماضی کی طویل تلخیوں کا!
جیسے مجھے کوئی غم نہیں تھا
تو! میرے لیے! اداس اتنی
کیا تھا یہ اگر کرم نہیں تھا

تو آج بھی میرے سامنے ہے
آنکھوں میں اُداسیاں نہ آنسو
اک طنز ہے تیری ہر ادا میں
چبھتی ہے ترے بدن کی خوشبو
یا اب مرے زخم بھر چکے ہیں
یا سب مرا زہر پی چکی تو

○

مستقل محرومیوں پر بھی تو دل مانا نہیں
لاکھ سمجھایا کہ اس محفل میں اب جانا نہیں

خود فریبی ہی سہی کیا کیجیے دل کا علاج
تو نظر پھیرے تو ہم سمجھیں کہ پہچانا نہیں

ایک دنیا منتظر ہے اور تیری بزم میں
اس طرح بیٹھے ہیں ہم جیسے کہیں جانا نہیں

جی میں جو آتی ہے کر گزرو کہیں ایسا نہ ہو
کل پشیماں ہوں کہ کیوں دل کا کہا مانا نہیں

زندگی پر اس سے بڑھ کر طنز کیا ہو گا فراز
اس کا یہ کہنا کہ تو شاعر ہے دیوانہ نہیں

○

تو پاس بھی ہو تو دل بیقرار اپنا ہے
کہ ہم کو تیرا نہیں انتظار اپنا ہے

ملے کوئی بھی ترا ذکر چھیڑ دیتے ہیں
کہ جیسے سارا جہاں رازدار اپنا ہے

وہ دور ہو تو بجا ترکِ دوستی کا خیال
وہ سامنے ہو تو کب اختیار اپنا ہے

زمانے بھر کے دکھوں کو لگا لیا دل سے
اس آسرے پہ کہ اِک غمگسار اپنا ہے

بلا سے جاں کا زیاں ہو اس اعتماد کی خیر
وفا کرے نہ کرے پھر بھی یار اپنا ہے

فرازؔ راحتِ جاں بھی وہی ہے کیا کیجے
وہ جس کے ہاتھ سے سینہ فگار اپنا ہے

○

جس سے یہ طبیعت بڑی مشکل سے لگی تھی
دیکھا تو وہ تصویر ہر اک دل سے لگی تھی

تنہائی میں روتے ہیں کہ یوں دل کو سکوں ہو
یہ چوٹ کسی صاحبِ محفل سے لگی تھی

اے دل ترے آشوب نے پھر حشر جگایا
بے درد ابھی آنکھ بھی مشکل سے لگی تھی

خلقت کا عجب حال تھا اس کوئے ستم میں
سائے کی طرح دامنِ قاتل سے لگی تھی

اُترا بھی تو کب درد کا چڑھتا ہُوا دریا
جب کشتیٔ جاں موت کے ساحل سے لگی تھی

○

کسی کے تذکرے بستی میں کو بکو جو ہُوئے
ہمیں خموش تھے موضوعِ گفتگو جو ہُوئے

نہ دل کا درد ہی کم ہے نہ آنکھ ہی نم ہے
نہ جانے کون سے ارماں تھے وہ لہو جو ہُوئے

نظر اُٹھائی تو گم گشتۂ تحیّر تھے
ہم آئینے کی طرح تیرے روبرو جو ہُوئے

ہمیں ہیں وعدۂ فردا پہ ٹالنے والے
ہمیں نے بات بدل دی بہانہ جُو جو ہُوئے

فراز ہو کہ وہ فرہاد ہو کہ ہو منصور
انھیں کا نام ہے ناکامِ آرزو جو ہُوئے

مجھ سے پہلے

مجھ سے پہلے تجھے جس شخص نے چاہا اس نے
شاید اب بھی ترا غم دل سے لگا رکھا ہو
ایک بے نام سی اُمید پہ اب بھی شاید
اپنے خوابوں کے جزیروں کو سجا رکھا ہو

میں نے مانا کہ وہ بیگانۂ پیمانِ وفا
کھو چکا ہے جو کسی اور کی رعنائی میں
شاید اب لوٹ کے آئے نہ تری محفل میں
اور کوئی دُکھ نہ رُلائے تجھے تنہائی میں

میں نے مانا کہ شب و روز کے ہنگاموں میں
وقت ہر غم کو بھلا دیتا ہے رفتہ رفتہ
چاہے اُمید کی شمعیں ہوں کہ یادوں کے چراغ
مستقل بُعد بجھا دیتا ہے رفتہ رفتہ

پھر بھی ماضی کا خیال آتا ہے گاہے گاہے
مدّتیں درد کی لو کم تو نہیں کر سکتیں
زخم بھر جائیں مگر داغ تو رہ جاتا ہے
دُوریوں سے کبھی یادیں تو نہیں مر سکتیں

یہ بھی ممکن ہے کہ اک دن وہ پشیماں ہو کر
تیرے پاس آئے زمانے سے کنارا کر لے
تو کہ معصوم بھی ہے زود فراموش بھی ہے
اس کی پیماں شکنی کو بھی گوارا کر لے

اور میں، جس نے تجھے اپنا مسیحا سمجھا
ایک زخم اور بھی پہلے کی طرح سہہ جاؤں
جس پہ پہلے بھی کئی عہدِ وفا ٹوٹے ہیں
اسی دوراہے پہ چپ چاپ کھڑا رہ جاؤں

○

کروں نہ یاد، مگر کس طرح بھلاؤں اُسے
غزل بہانہ کروں اور گنگناؤں اسے

وہ خار خار ہے شاخِ گلاب کی مانند
میں زخم زخم ہوں پھر بھی گلے لگاؤں اسے

یہ لوگ تذکرے کرتے ہیں اپنے لوگوں کے
میں کیسے بات کروں اب کہاں سے لاؤں اسے

مگر وہ زود فراموش، زود رنج بھی ہے
کہ رُوٹھ جائے، اگر یاد کچھ دلاؤں اسے

وہی جو دولتِ دل ہے وہی جو راحتِ جاں
تمھاری بات پہ اے ناصحو! گنواؤں اسے

جو ہمسفر سرِ منزل بچھڑ رہا ہے فراز
عجب نہیں ہے اگر یاد بھی نہ آؤں اسے

○

اب اور کیا کسی سے مراسم بڑھائیں ہم
یہ بھی بہت ہے تجھ کو اگر بھول جائیں ہم

صحرائے زندگی میں کوئی دوسرا نہ تھا
سنتے رہے ہیں آپ ہی اپنی صدائیں ہم

اس زندگی میں اتنی فراغت کسے نصیب
اتنا نہ یاد آ کہ تجھے بھول جائیں ہم

تو اتنی دل زدہ تو نہ تھی اے شبِ فراق
آ تیرے راستے میں ستارے لٹائیں ہم

وہ لوگ اب کہاں ہیں جو کہتے تھے کل فراز
ہے ہے خدا نہ کردہ تجھے بھی رُلائیں ہم

○

اُتری تھی شہرِ گل میں کوئی آتشیں کرن
وہ روشنی ہُوئی کہ سلگنے لگے بدن

غارت گرِ چمن سے عقیدت تھی کس قدر
شاخوں نے خود اُتار دیے اپنے پیرہن

اس انتہائے قرب نے دھندلا دیا تجھے
کچھ دور ہو کہ دیکھ سکوں تیرا بانکپن

میں بھی تو کھو چلا تھا زمانے کے شور میں
یہ اتفاق ہے کہ وہ یاد آ گئے معاً

جس کے طفیل مہر بلب ہم رہے فراز
اس کے قصیدہ خواں ہیں سبھی اہلِ انجمن

کوئی بھٹکتا بادل

دور اِک شہر سے جب کوئی بھٹکتا بادل
میری جلتی ہُوئی بستی کی طرف آئے گا
کتنی حسرت سے اسے دیکھیں گی پیاسی آنکھیں
اور وہ وقت کی مانند گزر جائے گا

جانے کس سوچ میں کھو جائے گی دل کی دنیا
جانے کیا کیا مجھے بیتا ہُوا یاد آئے گا
اور اس شہر کا بے فیض بھٹکتا بادل
درد کی آگ کو پھیلا کے چلا جائے گا

○

کیسی طلب اور کیا اندازے مشکل ہے تقدیر بنے
دل پر جس کا ہاتھ بھی رکھیو آخر وہ شمشیر بنے

غم کے رشتے بھی نازک تھے تم آئے اور ٹوٹ گئے
دل کا وحشی اب کیا سنبھلے اب کیا شے زنجیر بنے

اپنا لہو تیری رعنائی تاریکی اس دُنیا کی
میں نے کیا کیا رنگ چُنے ہیں دیکھوں کیا تصویر بنے

اپنا یہ عالم ہے خود سے بھی اپنے زخم چھپاتے ہیں
لوگوں کو یہ فکر کہ کوئی موضوعِ تشہیر بنے

تم نے فراز اس عشق میں سب کچھ کھو کر بھی کیا پایا ہے
وہ بھی تو ناکامِ وفا تھے جو غالب اور میر بنے

(۱)

اپنی محبّت کے افسانے کب تک راز بناؤ گے
رسوائی سے ڈرنے والو بات تمھی پھیلاؤ گے

اس کا کیا ہے تم نہ سہی تو چاہنے والے اور بہت
ترکِ محبّت کرنے والو! تم تنہا رہ جاؤ گے

ہجر کے ماروں کی خوش فہمی! جاگ رہے ہیں پہروں سے
جیسے یوں شب کٹ جائے گی جیسے تم آ جاؤ گے

زخمِ تمنا کا بھر جانا گویا جان سے جانا ہے
اس کا بھلانا سہل نہیں ہے خود کو بھی یاد آؤ گے

چھوڑو عہدِ وفا کی باتیں کیوں جھوٹے اقرار کریں
کل میں بھی شرمندہ ہوں گا کل تم بھی پچھتاؤ گے

رہنے دو یہ پند و نصیحت ہم بھی فرازؔ سے واقف ہیں
جس نے خود سو زخم سہے ہوں اس کو کیا سمجھاؤ گے

زندگی! اے زندگی

میں بھی چپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی!
جب تلک روشن ہیں آنکھوں کے فسردہ طاقچے
نیلگوں ہونٹوں سے پھوٹے گی صدا کی روشنی
جسم کی گرتی ہوئی دیوار کو تھامے ہوئے
موم کے بُت آتشیں چہرے سُلگتی مورتیں
میری بینائی کی یہ مخلوق زندہ ہے ابھی
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی!

ہو تو جانے دے مرے لفظوں کو معنی سے تہی
میری تحریریں، دھوئیں کی رنگیتی پرچھائیاں
جن کے پیکر اپنی آوازوں سے خالی بے لہو
محو ہو جانے تو دے یادوں سے خوابوں کی طرح
رُک تو جائیں آخری سانسوں کی وحشی آندھیاں
پھر ہٹا لینا مرے ماتھے سے تُو بھی اپنا ہاتھ
میں بھی چپ ہو جاؤں گا بجھتی ہوئی شمعوں کے ساتھ
اور کچھ لمحے ٹھہر! اے زندگی! اے زندگی!

○

چند لمحوں کے لیے تُو نے مسیحائی کی
پھر وہی میں ہوں وہی عمر ہے تنہائی کی

کس پہ گزری نہ شبِ ہجر قیامت کی طرح
فرق اتنا ہے کہ ہم نے سخن آرائی کی

اپنی باہوں میں سمٹ آئی ہے وہ قوسِ قزح
لوگ تصویر ہی کھینچا کیے انگڑائی کی

غیرتِ عشق بجا طعنۂ یاراں تسلیم
بات کرتے ہیں مگر سب اسی ہرجائی کی

ان کو بھولے ہیں تو کچھ اور پریشاں ہیں فراز
اپنی دانست میں دل نے بڑی دانائی کی

○

زعم ایسا کیا کہ لطفِ دوست ٹھکرانا پڑے
یہ طبیعت ہے تو شاید جاں سے بھی جانا پڑے

خانہ ویرانی تو ہوتی ہے مگر ایسی کہاں
اپنی آنکھوں سے خود اپنا گھر نہ پہچانا پڑے

رسم چل نکلی عجب اب میکدے کی خیر ہو
ہے وہی جمشید جس کے ہاتھ پیمانہ پڑے

سوچ لو اس بزم سے اُٹھنے سے پہلے سوچ لو
یہ نہ ہو پھر دل کے ہاتھوں لوٹ کر آنا پڑے

لے چلے ہیں حضرتِ ناصح مجھے جس راہ سے
لطف جب آئے اِدھر بھی کوئے جاناں نہ پڑے

غم ہی ایسا تھا کہ دل شق ہو گیا ورنہ فراز
کیسے کیسے حادثے ہنس ہنس کے سہہ جانا پڑے

○

اب نہ فرصت ہے، نہ احساس ہے غم سے اپنے
ورنہ ہم روز ہی ملتے تھے صنم سے اپنے

دل نہ مانا کہ کسی اور کے رستے پہ چلیں
لاکھ گمراہ ہُوئے نقشِ قدم سے اپنے

جی چکے ہم جو یہی شوق کی رسوائی ہے
تم سے بیگانے ہُوئے جاتے ہیں ہم سے اپنے

ہم نہیں پھر بھی تو آباد ہے محفل ان کی
ہم سمجھتے تھے کہ رونق ہے تو دم سے اپنے

میرے دامن کے مقدّر میں ہے خالی رہنا
آپ شرمندہ نہ ہوں دستِ کرم سے اپنے

رو چکے مرگِ تمنّا پہ بھی اک عمر فراز
اب جو زندہ ہیں تو شعروں کے بھرم سے اپنے

یہ تو جب ممکن ہے....

پھر چلے آئے ہیں ہمدم لے کے ہمدردی کے نام
آہوئے رم خوردہ کی وحشت بڑھانے کے لیے
میرے دل سے تیری چاہت کو مٹانے کے لیے

چھیڑ کر افسانۂ ناکامیٔ اہلِ وفا
تیری مجبوری کے قصے میری بربادی کی بات
اپنی اپنی سرگزشتیں دوسروں کے تجربات

ان کو کیا معلوم لیکن تیری چاہت کے کرم
میری تنہائی کے دوزخ میری جنّت کے بھرم
تیری آنکھوں کا وفا آمیز افسردہ خیال

کاش اتنا سوچ سکتے غمگساروں کے دماغ
یہ تو جب ممکن ہے بجھ جائے ہر آنسو ہر چراغ
خود کو ان میں دفن کر دوں بھول جاؤں اپنا نام

○

تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو
اب ہو چلا یقیں کہ بُرے ہم ہیں دوستو

کس کو ہمارے حال سے نسبت ہے کیا کہیں
آنکھیں تو دشمنوں کی بھی پُرنم ہیں دوستو

اپنے سوا ہمارے نہ ہونے کا غم کسے
اپنی تلاش میں تو ہمیں ہم ہیں دوستو

کچھ آج شام ہی سے ہے دل بھی بجھا بجھا
کچھ شہر کے چراغ بھی مدّھم ہیں دوستو

اس شہرِ آرزو سے بھی باہر نکل چلو
اب دل کی رونقیں بھی کوئی دم ہیں دوستو

سب کچھ سہی فراز پر اتنا ضرور ہے
دنیا میں ایسے لوگ بہت کم ہیں دوستو

○

تو کہاں تھا زندگی کے روز و شب آنکھوں میں تھے
آج یاد آیا کہ آنسو بے سبب آنکھوں میں تھے

رات بھر تاروں کی صورت جاگتے رہنا ہمیں
صبحدم کہنا کہ کیا کیا خوابِ شب آنکھوں میں تھے

تیری یادوں کی مہک ہر درد کو بہلا گئی
ورنہ تیرے دُکھ بھی اے شہرِ طرب آنکھوں میں تھے

اب تلک جن کی جُدائی کا قلق جی کو نہ تھا
آج تو بچھڑا تو وہ بھی سب کے سب آنکھوں میں تھے

اب تو ضبطِ غم نے پتھر کر دیا ورنہ فرازؔ
دیکھتا کوئی کہ دل کے زخم جب آنکھوں میں تھے

○

لمحے وفورِ شوق کے ایسے نہ آئے تھے
یوں چپ ہیں تیرے پاس ہی جیسے نہ آئے تھے

ساقی شکستِ جام سے چہروں پہ دیکھنا
وہ رنگ بھی کہ شعلۂ مے سے نہ آئے تھے

دل پر لگی خراش تو چہرے شفق ہوئے
اب تک تو زخم راس کچھ ایسے نہ آئے تھے

پہلے بھی روئے ہیں مگر اب کے وہ کرب ہے
آنسو کبھی بھی آنکھوں میں جیسے نہ آئے تھے

جب صبح ہو چکی ہے تو کیا سوچنا فراز
وہ رات کیوں نہ آئے تھے کیسے نہ آئے تھے

شہدائے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء
کے نام

تم نے جس دن کے لیے اپنے جگر چاک کیے
سو برس بعد سہی دن تو وہ آیا آخر
تم نے جس دشتِ تمنّا کو لہو سے سینچا
ہم نے اُس کو گل و گلزار بنایا آخر
نسل در نسل رہی جہدِ مسلسل کی تڑپ
ایک اِک بُوند نے طوفان اُٹھایا آخر
تم نے اِک ضرب لگائی تھی حصارِ شب پر
ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر

وقت تاریک خرابوں کا وہ عفریت ہے جو
ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے
زلفِ آزادی کے ہر تار سے دستِ ایّام
حرّیت کیش جوانوں کے کفن سیتا ہے
تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہُوا
ہم پہ وہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے
تم نے جو جنگ لڑی ننگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدّس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہار اپنے لیے جیت کی تمہید بنی
ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے
وادیٔ مرگ بھی منزل گہِ امّید بنی

ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی
شب کے سفّاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

پیمبرِ مشرق

وہ شب کہ جس میں ترا شعلۂ نوا لپکا
ڈھلی تو ماتمِ یک شہرِ آرزو بھی ہُوا
وہ رُت کہ جس میں ترا نغمۂ جنوں گونجا
کٹی تو سازِ تمنّا لہُو لہُو بھی ہُوا

یہی بہت تھا کوئی منزلِ طلب تو ملی
کہیں تو مژدۂ قربِ حریمِ یار ملا
ہزار شکر کہ طعنِ برہنگی تو گیا
اگرچہ پیرہنِ شوق تار تار ملا

خیال تھا کہ شکستِ قفس کے بعد بھی ہم
ترے پیام کے روشن چراغ دیکھیں گے
رہے گا پیشِ نظر تیرا آئینہ جس میں
ہم اپنے ماضی و فردا کے داغ دیکھیں گے

مگر جو حال طلوعِ سحر کے بعد ہُوا
جو تیرے درس کی تحقیر ہم نے دیکھی ہے
بیاں کریں بھی تو کس سے، کہیں تو کس سے کہیں
جو تیرے خواب کی تعبیر ہم نے دیکھی ہے

مدبّروں نے وفا کے چراغ گُل کر کے
درازدستیِٔ جاہ و حشم کو عام کیا
مفکّروں نے فقیہوں کی دلدہی کے لیے
خودی کی مے میں تصوّف کا زہر گھول دیا

وہ کم نظر تھے کہ نادان تھے کہ شعبدہ گر
جو تجھ کو جنّ و ملائک کا ترجماں سمجھے
تری نظر میں ہمیشہ زمیں کے زخم رہے
مگر یہ تجھ کو مسیحائے آسماں سمجھے

عروجِ عظمتِ آدم تھا مدّعا تیرا
مگر یہ لوگ نقوشِ فنا اُبھارتے ہیں
کسی آسماں پہ ہے تو اے پیمبرِ مشرق
زمیں کے زخم تجھے آج بھی پکارتے ہیں

○

اسی خیال میں تاروں کو رات بھر دیکھوں
کہ تجھ کو صبحِ قیامت سے پیشتر دیکھوں

اس اک چراغ کی لَو چبھ رہی ہے آنکھوں میں
تمام شہر ہو روشن تو اپنا گھر دیکھوں

مجھے خود اپنی طبیعت پہ اعتماد نہیں
خدا کرے کہ تجھے اب نہ عمر بھر دیکھوں

صدائے غولِ بیاباں نہ ہو یہ آوازہ
مرا وجود ہے پتھّر جو لوٹ کر دیکھوں

نظر عذاب ہے پاؤں میں ہو اگر زنجیر
فضا کے رنگ کو دیکھوں کہ بال و پر دیکھوں

جُدا سہی مری منزل، بچھڑ نہیں سکتا
میں کس طرح تجھے اوروں کا ہمسفر دیکھوں

وہ لب فراز اگر کر سکیں مسیحائی
بقولِ دردؔ میں سو سو طرح سے مر دیکھوں

○

(بطرزِ بیدل)

جنبشِ مژگاں کہ ہر دم دل کشائے زخم ہے
جو نظر اُٹھتی ہے گویا آشنائے زخم ہے

دیکھنا آئینِ مقتلِ دلفگارانِ وفا
التفاتِ تیغِ قاتل خوں بہائے زخم ہے

بسکہ جوشِ فصلِ گُل سے کُھل گئے سینوں کے چاک
خندۂ گل بھی ہم آہنگ صدائے زخم ہے

ہم نفس اہرِ آستیں میں دشنہ پنہاں ہے تو کیا
ہم کو پاسِ خاطرِ یاراں بجائے زخم ہے

آشنا کر کبھی اے بے نیازِ شامِ غم
دیدۂ بے خواب بھی چاکِ قبائے زخم ہے

کس سے جز دیوارِ مژگاں سیلِ دردِ دل کیسے رکے
ساحلِ دریائے خوں لب آشنائے زخم ہے

ضبطِ گریہ، چشمِ خوں بستہ کو تھا عقدہ کشا
رہ گیا تھا دل میں جو آنسو بنائے زخم ہے

شعلۂ افسردگی ہے شمعِ فانوسِ خیال
داغ کیا ہے دل سے پیمانِ وفائے زخم ہے

اب تو دامن تک پہنچ آیا سرِ چاکِ جنوں
ہم تو سمجھے تھے کہ بس دل انتہائے زخم ہے

سلسلہ ہائے طلب سے رشتگاری ہے کسے
دل ہلاکِ ناوک و ناوک فدائے زخم ہے

چارہ گر نے بہرِ تسکیں رکھ دیا ہے دل پہ ہاتھ
مہرباں ہے وہ مگر نا آشنائے زخم ہے

میری وحشت کب ہوئی رسوائے عریانی فرازؔ
گل بدن پر پیرہن تھا اب ردائے زخم ہے

المیہ

کس تمنّا سے یہ چاہا تھا کہ اک روز تجھے
ساتھ اپنے لیے اس شہر کو جاؤں گا جسے
مجھ کو چھوڑے ہوئے بھولے ہوئے اک عمر ہوئی

ہائے وہ شہر کہ جو میرا وطن ہے پھر بھی
اس کی مانوس فضاؤں سے رہا بیگانہ
میرا دل میرے خیالوں کی طرح دیوانہ

آج حالات کا یہ طنزِ جگر سوز تو دیکھ
تو مرے شہر کے اک حجلۂ زرّیں میں مکیں
اور میں پردیس میں جاں دادۂ یک نانِ جویں

ملکیّت

سسکیاں لینے سے کیا فائدہ اے زینتِ شب
دیکھ اس ہنستی ہوئی رات کو افسردہ نہ کر
تیرا رونا تجھے تسکین تو دے سکتا ہے
لیکن اس انجمنِ عیش کو آزردہ نہ کر

مجھ پہ روشن ہے ترے سوئے ہوئے درد کی آگ
جبر کی بادہ گساری سے بھڑک اُٹھی ہے
تیری کچلی ہوئی غیرت تری روندی ہوئی رُوح
اک حقارت بھری ٹھوکر سے بھڑک اُٹھی ہے

اور یہ توہین ترے جسم کی توہین نہ تھی
ورنہ یہ زہر تو ہنس ہنس کے پیا ہے تُو نے
وقفِ گردش رہی ساغر کی طرح دست بدست
بزم کی بزم کو سرشار کیا ہے تُو نے

تُو نے ہر جلتی ہُوئی روح کو گلزار کیا
تُو ہر اک ہاتھ میں غنچے کی طرح چٹکی ہے
تُو نے ہر دوش پہ بکھرائی ہیں اپنی زُلفیں
تُو ہر آغوش میں خوشبو کی طرح بھٹکی ہے

مگر امشب ترے احساس پہ وہ چوٹ پڑی
تلخ فاقوں کی اذیّت بھی بھُلا دی جس نے
تیرے کردار کے صحرا سے وہ آندھی اُٹھی
فکرِ فردا کی بھی دیوار گرا دی جس نے

تجھ کو معلوم نہیں ہے مگر اے دشمنِ جاں
اس تجارت سے عبارت تری شخصیّت ہے
جسم سے لے کے تری روح تلک آج کی رات
یا مری یا مرے احباب کی ملکیّت ہے

منتظر کب سے تحیّر ہے تری تقدیر کا
بات کر، تجھ پر گماں ہونے لگا تصویر کا

رات کیا سوئے کہ باقی عمر کی نیند اُڑ گئی
خواب کیا دیکھا کہ دھڑکا لگ گیا تعبیر کا

کیسے پایا تھا تجھے پھر کس طرح کھویا تجھے
مجھ سا منکر بھی تو قائل ہو گیا تقدیر کا

جس طرح بادل کا سایہ پیاس بھڑکاتا رہے
میں نے یہ عالم بھی دیکھا ہے تری تصویر کا

جانے کس عالم میں تو بچھڑا کہ ہے تیرے بغیر
آج تک ہر نقش فریادی مری تحریر کا

عشق میں سر پھوڑنا بھی کیا کہ یہ بے مہر لوگ
جوئے خوں کو نام دے دیتے ہیں جُوئے شیر کا

جس کو بھی چاہا اسے شدّت سے چاہا ہے فرازؔ
سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے درد کی زنجیر کا

○

اہلِ غم جاتے ہیں نااُمید تیرے شہر سے
جب نہیں تجھ سے تو کیا امید تیرے شہر سے

دیدنی تھی سادگی ان کی جو رکھتے تھے کبھی
اے وفا ناآشنا اُمید تیرے شہر سے

تیرے دیوانوں کے حق میں زہرِ قاتل ہو گئی
نااُمیدی سے سوا اُمید تیرے شہر سے

پا بجولاں دل گرفتہ پھر رہے ہیں کُو بکُو
ہم جو رکھتے تھے سوا اُمید تیرے شہر سے

تُو تو بے پروا ہی تھا اب لوگ بھی پتھر ہوئے
یا ہمیں تجھ سے تھی یا اُمید تیرے شہر سے

راستے کیا کیا چمک جاتے ہیں اے جانِ فراز
جب بھی ہوتی ہے ذرا امید تیرے شہر سے

تمثیل

کتنی صدیوں کے انتظار کے بعد
قربتِ یک نفس نصیب ہوئی
پھر بھی تو چپ اُداس کم آمیز

اے سلگتے ہوئے چراغ بھڑک
درد کی روشنی کو چاند بنا
کہ ابھی آندھیوں کا شور ہے تیز

ایک پل مرگِ جاوداں کا صلہ
اجنبیت کے زہر میں مت گھول
مجھ کو مت دیکھ لیکن آنکھ تو کھول

آنکھوں میں چُبھ رہے ہیں در و بام کے چراغ
جب دل ہی بجھ گیا ہو کس کام کے چراغ

کیا شام تھی کہ جب ترے آنے کی آس تھی
اب تک جلا رہے ہیں ترے نام کے چراغ

شاید کبھی یہ عرصۂ یک شب نہ کٹ سکے
تو صبح کی ہوا ہے تو ہم شام کے چراغ

اس تیرگی میں لغزشِ پا بھی ہے خودکشی
اے رہ نوردِ شوق ذرا تھام کے چراغ

ہم کیا نجھے کہ جاتی رہی یادِ رفتگاں
شاید ہمیں بھے گردشِ ایّام کے چراغ

ہم درخورِ ہوائے ستم بھی نہیں فرازؔ
جیسے مزار پر کسی گمنام کے چراغ

○

نظر کی دھوپ میں سائے گھُلے ہیں شب کی طرح
میں کب اُداس نہیں تھا مگر نہ اب کی طرح

پھر آج شہرِ تمنّا کی رہگزاروں سے
گزر رہے ہیں کئی لوگ روز و شب کی طرح

تجھے تو میں نے بڑی آرزو سے چاہا تھا
یہ کیا کہ چھوڑ چلا تُو بھی اور سب کی طرح

فسردگی ہے مگر وجہِ غم نہیں معلوم
کہ دل پہ بوجھ سا ہے رنج بے سبب کی طرح

کھِلے تو اب کے بھی گلشن میں پھول ہیں لیکن
نہ میرے زخم کی صورت نہ تیرے لب کی طرح

○

ہم کیا کہ اسی سوچ میں بادِ چمنی تھی
وہ گُل کی چٹک تھی کہ تری کم سخنی تھی

آنسو کی وہ اِک بُوند جو آنکھوں سے نہ ٹپکی
آئینۂ دل کے لیے ہیرے کی کنی تھی

پیمانے کو ہم منہ سے لگاتے نہ لگاتے
ساقی کی ملاقات ہی توبہ شکنی تھی

اب صورتِ دیوار ہیں چپ چاپ کہ تجھ سے
کچھ اور تعلّق نہ سہی ہم سخنی تھی

یہ جاں جو کڑی دھوپ میں جلتی رہی برسوں
اوروں کے لیے سایۂ دیوار بنی تھی

دنیا سے بچھڑتے کہ فراز ان کو بُھلاتے
ہر حال میں اپنے لیے پیماں شکنی تھی

نیند

سرد پلکوں کی صلیبوں سے اُتارے ہُوئے خواب
ریزہ ریزہ ہیں مرے سامنے شیشوں کی طرح
جن کے ٹکڑوں کی چُبھن، جن کی خراشوں کی جلن
عمر بھر جاگتے رہنے کی سزا دیتی ہے
شدّتِ کرب سے دیوانہ بنا دیتی ہے

آج اِس قرب کے ہنگام وہ احساس کہاں
دل میں وہ درد نہ آنکھوں میں چراغوں کا دُھواں
اور صلیبوں سے اُتارے ہُوئے خوابوں کی مثال
جسم گرتی ہوئی دیوار کی مانند نڈھال
تُو مرے پاس سہی اے مرے آزردہ جمال

خوشبو کا سفر

چھوڑ پیمانِ وفا کی بات شرمندہ نہ کر
دُوریاں، مجبوریاں، رسوائیاں، تنہائیاں
کوئی قاتل، کوئی بسمل، سسکیاں، شہنائیاں
دیکھ یہ ہنستا ہُوا موسم ہے موضوعِ نظر

وقت کی رَو میں ابھی ساحل ابھی موجِ فنا
ایک جھونکا ایک آندھی اک کرن اک جوئے خوں
پھر وہی صحرا کا سناٹا وہی مرگِ جنوں
ہاتھ ہاتھوں کا اثاثہ ہاتھ ہاتھوں سے جُدا

جب کبھی آئے گا ہم پر بھی جدائی کا سماں
ٹوٹ جائے گا مرے دل میں کسی خواہش کا تیر
بھیگ جائے گی تری آنکھوں میں کاجل کی لکیر

کل کے اندیشوں سے اپنے دل کو آزردہ نہ کر
دیکھ یہ ہنستا ہُوا موسم، یہ خوشبو کا سفر

اب کے برس بھی

لب تشنہ و نومید ہیں ہم اب کے برس بھی
اے ٹھہرے ہوئے ابرِ کرم اب کے برس بھی

کچھ بھی ہو گلستاں میں مگر کنجِ چمن سے
ہیں دور بہاروں کے قدم اب کے برس بھی

اے شیخ کرم! دیکھ کہ باوصفِ چراغاں
تیرہ ہیں در و بامِ حرم اب کے برس بھی

اے دل زدگاں! خیر مناؤ کہ ہیں نازاں
پندارِ خدائی پہ صنم، اب کے برس بھی

پہلے بھی قیامت تھی ستم کاریٔ ایّام
ہیں کشتۂ غم، کشتۂ غم اب کے برس بھی
لہرائیں گے ہونٹوں پہ دکھاوے کے تبسّم
ہو گا یہ نظارہ کوئی دم اب کے برس بھی
ہو جائے گا ہر زخمِ کہن پھر سے نمایاں
روئے گا لہو دیدۂ نم اب کے برس بھی
پہلے کی طرح ہوں گے تہی جامِ سفالیں
چھلکے گا ہر اک ساغرِ جم اب کے برس بھی
مقتل میں نظر آئیں گے پا بستۂ زنجیر
اہلِ نظر و اہلِ قلم، اب کے برس بھی

تجھ سے مل کر بھی کچھ خفا ہیں ہم
بے مروّت نہیں تو کیا ہیں ہم

ہم غمِ کارواں میں بیٹھے تھے
لوگ سمجھے شکستہ پا ہیں ہم

اس طرح سے ہمیں رقیب ملے
جیسے مدّت کے آشنا ہیں ہم

راکھ ہیں ہم اگر یہ آگ بجھی
جز غمِ دوست اور کیا ہیں ہم

خود کو سنتے ہیں اس طرح جیسے
وقت کی آخری صدا ہیں ہم

کیوں زمانے کو دیں فرازؔ الزام
وہ نہیں ہیں تو بے وفا ہیں ہم

○

تجھے اُداس کیا خود بھی سوگوار ہوئے
ہم آپ اپنی محبّت سے شرمسار ہوئے

بلا کی رَو تھی، ندیمانِ آبلہ پا کو
پلٹ کے دیکھنا چاہا کہ خود غبار ہوئے

گِلہ اسی کا کیا جس سے تجھ پہ حرف آیا
وگرنہ یوں تو ستم ہم پہ بے شمار ہوئے

یہ انتقام بھی لینا تھا زندگی کو ابھی
جو لوگ دشمنِ جاں تھے وہ غمگسار ہوئے

ہزار بار کیا ترکِ دوستی کا خیال
مگر فراز پشیماں ہر ایک بار ہوئے

...اَن دیکھے دیاروں کے سفیر

اور جب ہوگا ترازو ہجر کے ترکش کا تیر
مختلف ہوں گے تو کتنے دوسرے لوگوں سے ہم
جو چلے تھے کوچۂ جاناں سے مقتل کی طرف
بے نیازِ سنگِ خلقت بے غمِ تیغِ ستم
اپنے اپنے شوقِ بے پروا کی بار آئیں لیے
دردِ وارفتہ کی شمعوں کو جلائے ہر قدم
ان میں ہر اک باوفا، ثابت قدم، زندہ ضمیر

ان کی آنکھیں ریزہ ریزہ ان کی جانیں زخم زخم
ان کے آنسو کانچ کے تابوت ریشم کے کفن
ان میں خوابیدہ کسی لیلا کسی شیریں کا خواب
ان میں آسودہ جنونِ قیس و خونِ کوہکن
ان کے ماتھوں پر شکستوں کے نشاں ضربِ عدو
ان کے ہاتھوں کی لکیروں میں جوانمرگوں کا فن
ان میں ہر اک تھا کسی دامِ تمنّا کا اسیر
ان پہ جو گزری وہ گزرے گی ہر اہلِ درد پر
اور ہم دونوں بھی اپنے جرم سے غافل نہیں
تیری پیشانی کی، سج دھج میری چاہت کا غرور
گو یہ وہ زندہ ہیں جو شرمندۂ قاتل نہیں
پھر بھی کس دامن دریدہ کو یہاں بخشش ملی
اس سفر میں راستوں کے زخم ہیں منزل نہیں
اور ہم دونوں ہیں ان دیکھے دیاروں کے سفیر

○

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سُوکھے ہُوئے پھول کتابوں میں ملیں

ڈھونڈ اُجڑے ہُوئے لوگوں میں وفا کے موتی
یہ خزانے تجھے ممکن ہے خرابوں میں ملیں

غمِ دنیا بھی غمِ یار میں شامل کر لو!
نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں

تُو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا
دونوں اِنساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

آج ہم دار پہ کھینچے گئے جن باتوں پر
کیا عجب کل وہ زمانے کو نصابوں میں ملیں

اب نہ وہ میں نہ وہ تُو ہے نہ وہ ماضی ہے فراز
جیسے دو شخص تمنّا کے سرابوں میں ملیں

○

اچھا تھا اگر زخم نہ بھرتے کوئی دن اور
اس کوئے ملامت میں گزرتے کوئی دن اور

راتوں کو تری یادوں کے خورشید اُبھرتے
آنکھوں میں ستارے سے اُترتے کوئی دن اور

ہم نے تجھے دیکھا تو کسی کو بھی نہ دیکھا
اے کاش ترے بعد گزرتے کوئی دن اور

راحت تھی بہت رنج میں ہم غم طلبوں کو
تم اور بگڑتے تو سنورتے کوئی دن اور

گو ترکِ تعلق تھا مگر جاں پہ بنی تھی
مرتے جو تجھے یاد نہ کرتے کوئی دن اور

اس شہرِ تمنا سے فراز آئے ہی کیوں تھے
یہ حال اگر تھا تو ٹھہرتے کوئی دن اور

○

ترس رہا ہوں مگر تو نظر نہ آ مجھ کو
کہ خود جدا ہے تو مجھ سے نہ کر جدا مجھ کو

وہ کپکپاتے ہُوئے ہونٹ میرے شانے پر
وہ خواب سانپ کی مانند ڈس گیا مجھ کو

چٹخ اُٹھا ہوں سلگتی چٹان کی صورت
پکار اب تو مرے دیر آشنا مجھ کو

تجھے تراش کے میں سخت منفعل ہوں کہ لوگ
تجھے صنم تو سمجھنے لگے خدا مجھ کو

یہ اور بات کہ اکثر دمک اُٹھا چہرہ
کبھی کبھی یہی شعلہ بجھا گیا مجھ کو

یہ قربتیں ہی تو وجہِ فراق ٹھہری ہے
بہت عزیز ہیں یارانِ بے وفا مجھ کو

ستم تو یہ ہے کہ ظالم سخن شناس نہیں
وہ ایک شخص کہ شاعر بنا گیا مجھ کو

اسے فرازؔ اگر دُکھ نہ تھا بچھڑنے کا
تو کیوں وہ دُور تلک دیکھتا رہا مجھ کو

○

کسی طرح تو بیانِ حرفِ آرزو کرتے
جو لب سِلے تھے تو آنکھوں سے گفتگو کرتے

بس ایک نعرۂ مستاں دریدہ پیرہنو
کہاں کے طوق و سلاسل بس ایک ہُو کرتے

کبھی تو ہم سے بھی اے ساکنانِ شہرِ خیال
تھکے تھکے ہُوئے لہجے میں گفتگو کرتے

گُلوں سے جسم تھے شاخِ صلیب پر لرزاں
تو کس نظر سے تماشائے رنگ و بُو کرتے

بہت دنوں سے ہے بے آبِ چشمِ خوں بستہ
وگرنہ ہم بھی چراغاں کنارِ جُو کرتے

یہ قربِ مرگِ وفا ہے اگر خبر ہوتی
تو ہم بھی تجھ سے بچھڑنے کی آرزو کرتے

چمن پرست نہ ہوتے تو اے نسیمِ بہار
مثالِ برگِ خزاں تیری جستجو کرتے

ہزار کوس پہ تُو اور یہ شامِ غربت کی
عجیب حال تھا پر کس سے گفتگو کرتے

فراز مصرعۂ آتش پہ کیا غزل کہتے
زبانِ غیر سے کیا شرحِ آرزو کرتے

مَیں اور تُو

روز جب دھوپ پہاڑوں سے اُترنے لگتی
کوئی گھٹتا ہُوا بڑھتا ہُوا بیکل سایہ
ایک دیوار سے کہتا کہ مرے ساتھ چلو

اور زنجیرِ رفاقت سے گریزاں دیوار
اپنے پندار کے نشے میں سدا استادہ
خواہشِ ہمدمِ دیرینہ پہ ہنس دیتی تھی

کون دیوار کسی سائے کے ہمراہ چلی
کون دیوار ہمیشہ مگر استادہ رہی
وقت دیوار کا ساتھی ہے نہ سائے کا رفیق

اور اب سنگ و گل و خشت کے ملبے کے تلے
اسی دیوار کا پندار ہے ریزہ ریزہ
دھوپ نکلی ہے مگر جانے کہاں ہے سایہ

○

کون آتا ہے مگر آس لگائے رکھنا
عمر بھر درد کی شمعوں کو جلائے رکھنا

دوست پُرسش پہ مصر اور ہمارا شیوہ
اپنے احوال کو خود سے بھی چھپائے رکھنا

ہم کو اس نام نے مارا کہ جہاں بھی جائیں
خلقتِ شہر نے طوفان اٹھائے رکھنا

اس چکاچوند میں آنکھیں بھی گنوا بیٹھو گے
اس کے ہوتے ہوئے پلکوں کو جھکائے رکھنا

افریشیائی ادیبوں کے نام

جہانِ لوح و قلم کے مسافرانِ جلیل
ہم اہلِ دشتِ پشاور سلام کہتے ہیں
دلوں کا قرب کہیں فاصلوں سے مٹتا ہے
یہ حرفِ شوق بصد احترام کہتے ہیں
ہزار لفظ و بیان و زباں کا فرق سہی
مگر حدیثِ وفا ہم تمام کہتے ہیں

وہ ماؤ ہو کہ لوممبا، سکارنو ہو کہ فیض
سبھی کے لوح و قلم عظمتِ بشر کے نقیب
سب ایک درد کے رشتے میں منسلک بسمل
سبھی ہیں دور نظر سے سبھی دلوں کے قریب
جکارتہ و سراندیپ سے پشاور تک
سبھی کا ایک ہی نعرہ سبھی کی ایک صلیب

ہمیں یہ سوچنا ہوگا کہ زندگی اپنی
فضائے دہر میں کیوں موت سے بھی سستی ہے
ہم اہلِ شرق ہیں سورج تراشنے والے
مگر ہماری زمیں نور کو ترستی ہے
یہ کیا کہ جو بھی گھٹا دشت سے ہمارے اُٹھے
وہ دُور پار سمندر پہ جا برستی ہے

زمیں سے اب نہیں اُترے گا کوئی پیغمبر
جہانِ آدم و حوّا سنوارنے کے لیے
یہاں محمدؐ و گوتم، مسیح و کنفیوشس
جلا چکے ہیں بہت آگہی فروز دیئے
مگر ہے آج بھی اپنا نصیب تاریکی
مگر ہے آج بھی مشرق شبِ دراز لیے

ہمیں کو توڑنے ہوں گے صنم قدامت کے
ہمیں کو اب نیا انسان ڈھالنا ہوگا
ہمیں کو اپنے قلم کی ستارہ سازی سے
ہر ایک خطۂ تیرہ اُجالنا ہوگا
ہمیں کو امن کے گیتوں سے میٹھے بولوں سے
مہیب جنگ کی آندھی کو ٹالنا ہوگا

میں کہ پُر شور سمندر تھے مرے پاؤں میں
اب کہ ڈوبا ہوں تو سُوکھے ہُوئے دریاؤں میں

نامرادی کا یہ عالم ہے کہ اب یاد نہیں
تُو بھی شامل تھا کبھی میری تمنّاؤں میں

دن کے ڈھلتے ہی اُجڑ جاتی ہیں آنکھیں ایسے
جس طرح شام کو بازار کسی گاؤں میں

چاکِ دل سی کہ نہ سی، زخم کی توہین نہ کر!
ایسے قاتل تو نہ تھے میرے مسیحاؤں میں

ذکر اس غیرتِ مریم کا جب آتا ہے فرازؔ
گھنٹیاں بجتی ہیں لفظوں کے کلیساؤں میں

نایافت

احمد فراز

اِنتساب :

میں تیرا نام نہ لُوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہَوا بہار کی ہے

ترتیب

"گفت آں کہ یافت می نہ شود آنم آرزوست"

دیباچہ

یہ قصہ پُرانا ہے
جب بعض ہونٹوں نے چاہا
کہ لفظوں کو آواز کی زندگی دیں
تو خود اُن کو زہرابِ پینا پڑا تھا
کہ اہلِ حکم کو یہ ڈر تھا
یہ الفاظ
آواز کی زندگی سے
کوئی داستاں بن نہ جائیں
..... اور وہ ہونٹ چُپ ہو گئے تھے
سِسکتے تڑپتے ہُوے لفظ
قاتل کی شمشیر سے نیم جاں
مدتوں تک فراقِ صدا میں
دھڑکتے رہے ہیں
کسے کیا خبر تھی
کہ ان بسملوں کا لہو..... قطرہ قطرہ
لکیروں کی صورت دمکتا رہے گا
اور اب یہ
لہو کی لکیریں
بجائے خود اک داستاں بن گئی ہیں

غزل

ہُوئی ہے شام تو آنکھوں میں بس گیا پھر تُو
کہاں گیا ہے مرے شہر کے مسافر تو

مری مثال کہ اک نخلِ خشکِ صحرا ہوں
ترا خیال کہ شاخِ چمن کا طائر تُو

میں جانتا ہوں کہ دنیا تجھے بدل دے گی
میں مانتا ہوں کہ ایسا نہیں بظاہر تُو

ہنسی خوشی سے بچھڑ جا اگر بچھڑنا ہے
یہ ہر مقام پہ کیا سوچتا ہے آخر تُو

فضا اداس ہے رُت مضمحل ہے میں چُپ ہوں
جو ہو سکے تو چلا آ کسی کی خاطر تُو

فرازؔ تُو نے اسے مشکلوں میں ڈال دیا
زمانہ صاحبِ زر اور صرف شاعر تُو

وفا پرست صلیبیں

وہ دن بھی یاد ہیں مجھ کو کہ جب مری دنیا
کہاں کے جسم، کہ سایوں کو بھی ترستی تھی
پھرا ہوں کوچہ بہ کوچہ متاعِ درد لیے
اگرچہ خلق مری سادگی پہ ہنستی تھی

سدا جلاتی رہی ہے مجھے یہ محرومی
وہی تھا میں وہی صحرائے آرزو کے سراب
کوئی نہ تھا کہ میں جس کے حضور نذر کروں
یہ آنسوؤں کے چراغاں یہ شاعری کے گلاب

یہ زخم وہ تھے جو فن کے لیے چراغ بنے
مرا شریکِ سفر بس مرا شعور رہا
کسی سے کہہ نہ سکا دردِ نارسا کا گلہ
وہ روز و شب تھے کہ تنہائیوں سے چور رہا

رہِ طلب میں پھر اک یہ مقام بھی آیا
کہ دل گرفتہ ہے تو میری زندگی کے لیے
میں دیکھتا ہوں کہ تیری اداس آنکھوں میں
وفا کی آنچ لیے ہیں عقیدتوں کے دیے

کسے عزیز نہ ہوگی تری طلب کی لگن
ہزار دل پہ پڑی ہو غمِ زمانہ کی دھول
کسے غرور نہ ہوگا اگر تیری چاہت
کھلائے دشتِ تمنّا میں التفات کے پھول

مگر تجھے نہیں معلوم قربتوں کے الم
تری نگاہ مجھے فاصلوں سے چاہتی ہے
تجھے خبر نہیں شاید کہ خلوتوں میں مری
لہو اُگلتی ہوئی زندگی کراہتی ہے

تجھے خبر نہیں شاید کہ ہم وہاں ہیں جہاں
یہ فن نہیں ہے اذیّت ہے زندگی بھر کی
کبھی گلوئے جنوں پر کمند پڑتی ہے
کبھی قلم کی زباں پر ہے نوک خنجر کی

ہم اُس قبیلۂ وحشی کے دیوتا ہیں کہ جو
پجاریوں کی عقیدت پہ پھول جاتے ہیں
اور ایک رات کے معبود صبح ہوتے ہی
وفا پرست صلیبوں پہ جھول جاتے ہیں

غزل

عجیب رُت تھی کہ ہر چند پاس تھا وہ بھی
بہت ملُول تھا میں بھی اُداس تھا وہ بھی

کسی کے شہر میں کی گفتگو ہواؤں سے
یہ سوچ کر کہ کہیں آس پاس تھا وہ بھی

ہم اپنے زعم میں خوش تھے کہ اُس کو بھُول چکے
مگر گمان تھا یہ بھی قیاس تھا وہ بھی

کہاں کا اب غمِ دنیا کہاں کا اب غمِ جاں
وہ دن بھی تھے کہ ہمیں یہ بھی راس تھا وہ بھی

فرازؔ تیرے گریباں پہ کل جو ہنستا تھا
اسے ملے تو دریدہ لباس تھا وہ بھی

عقیدت

میں کتنی وارفتگی سے اس کو سُنا رہا تھا
وہ ساری باتیں وہ سارے قصّے
جو اس سے ملنے سے پیشتر
میری زندگی کی حکایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ اور بھی لوگ تھے
جنھیں میری آرزو تھی مری طلب تھی
کہ جن سے میری محبّتوں کا رہا تعلّق
کہ جن کی مجھ پر عنایتیں تھیں

میں کہہ رہا تھا
کہ ان میں کچھ کو تو میں نے
جاں سے عزیز جانا
مگر انھیں میں سے بعض کو
میری بے دلی سے شکایتیں تھیں

میں ایک اک بات
ایک اک جرم کی کہانی
دھڑکتے دل کانپتے بدن سے سنا رہا تھا
مگر وہ پتھر بنی
مجھے اس طرح سے سُنتی رہی
کہ جیسے مرے لبوں پر
کئی مقدّس تریں صحیفے کی آیتیں تھیں

سچ کا زہر

تجھے خبر بھی نہیں
کہ تیری اُداس ادھوری
محبّتوں کی کہانیاں
جو بڑی کشادہ دلی سے
ہنس ہنس کے سُن رہا تھا
وہ شخص تیری صداقتوں پر فریفتہ
باوفا و ثابت قدم
کہ جس کی جبیں پر
ظالم رقابتوں کی جلن سے
کوئی شکن نہ آئی
وہ ضبط کی کربناک شدّت سے
دل ہی دل میں
خموش ، چُپ چاپ
مر گیا ہے

غزل

ہر آشنا میں کہاں خوئے محرمانہ وہ
کہ بے وفا تھا مگر دوست تھا پرانا وہ

کہاں سے لائیں اب آنکھیں اسے کہ رکھتا تھا
عداوتوں میں بھی اندازِ مخلصانہ وہ

جو ابر تھا تو اسے ٹوٹ کر برسنا تھا
کہ کیا کہ آگ لگا کر ہوا روانہ وہ

پکارتے ہیں مہ و سال منزلوں کی طرح
لگا ہے توسنِ ہستی کو تازیانہ وہ

ہمیں بھی غم طلبی کا نہیں رہا یارا
ترے بھی رنگ نہیں گردشِ زمانہ وہ

اب اپنی خواہشیں کیا کیا اُسے رُلاتی ہیں
یہ بات ہم نے کہی تھی مگر نہ مانا وہ

یہی کہیں گے کہ بس صورت آشنائی تھی
جو عہد ٹوٹ گیا یاد کیا دلانا وہ

اس ایک شکل میں کیا کیا نہ صورتیں دیکھیں
نگار تھا، نظر آیا نگار خانہ وہ

فرازؔ خواب سی دنیا دکھائی دیتی ہے
جو لوگ جانِ جہاں تھے ہُوئے فسانہ وہ

کونسا نام تجھے دُوں؟

یوں بھی گزری ہے کہ جب درد میں ڈوبی شام
گھول دیتی ہے مری سوچ میں زہرِ ایّام
زرد پڑ جاتا ہے جب شہرِ نظر کا مہتاب
خون ہو جاتا ہے ہر ساعتِ بیدار کا خواب
ایسے لمحوں میں عجب لطفِ دل آرام کے ساتھ
مہرباں ہاتھ ترے ریشم و بلّور — ہاتھ

اپنے شانوں پہ مرے سر کو جھکا دیتے ہیں
جس طرح ساحلِ اُمید سے بے بس چہرے
دیر تک ڈوبنے والے کو صدا دیتے ہیں

یوں بھی گزری ہے کہ جب قرب کی سرشاری میں
چمک اُٹھتا ہے نگاہوں میں ترے حُسن کا شہر
زخمِ دہر کی تلچھٹ نہ شبِ ہجر کا زہر
مجھ کو ایسے میں اچانک ترا بے وجہ سکوت

کوئی بے فیض نظر یا کوئی تلوار سی بات
ان گنت درد کے رشتوں میں پرو دیتی ہے
اس طرح سے کہ ہر آسودگی رو دیتی ہے

کونسا نام تجھے دوں مرے ظالم محبوب
تُو ہی قاتل ہے مرا تُو ہی مسیحا میرا

غزل

تیرے قریب آ کے بڑی الجھنوں میں ہوں
میں دشمنوں میں ہوں کہ ترے دوستوں میں ہوں

مجھ سے گریز پا ہے تو ہر راستہ بدل
میں سنگِ راہ ہوں تو سبھی راستوں میں ہوں

تو آ چکا ہے سطح پہ کب سے خبر نہیں
بے درد میں ابھی انھیں گہرائیوں میں ہوں

اے یارِ خوش دیار تجھے کیا خبر کہ میں
کب سے اداسیوں کے گھنے جنگلوں میں ہوں

تو لوٹ کر بھی اہلِ تمنا کو خوش نہیں
میں لُٹ کے بھی وفا کے انھیں قافلوں میں ہوں

بدلا نہ میرے بعد بھی موضوعِ گفتگو
میں جا چکا ہوں پھر بھی تری محفلوں میں ہوں

مجھ سے بچھڑ کے تو بھی تو روئے گا عمر بھر
یہ سوچ لے کہ میں بھی تری خواہشوں میں ہوں

تو ہنس رہا ہے مجھ پہ مرا حال دیکھ کر
اور پھر بھی میں شریک ترے قہقہوں میں ہوں

خود ہی مثالِ لالۂ صحرا لہو لہو
اور خود فراز اپنے تماشائیوں میں ہوں

تخلیق

درد کی آگ بجھا دو کہ ابھی وقت نہیں — زخمِ دل جاگ سکے نشترِ غم رقص کرے
جو بھی سانسوں میں گھلا ہے اسے عریاں نہ کرو — چپ بھی شعلہ ہے مگر کوئی نہ الزام دھرے

ایسے الزام کہ خود اپنے تراشے ہوئے بت — جذبۂ کاوشِ خالق کو نگونسار کریں
موقلم حلقۂ ابرو کو بنا دے خنجر — لفظ نوحوں میں رقم مدحِ رخِ یار کریں
رقصِ مینا سے اُٹھے نغمۂ رقصِ بسمل — ساز خود اپنے مغنّی کو گنہگار کریں

مرہمِ اشک نہیں زخمِ طلب کا چارہ — خون بھی روئے تو کس خاک کی سج دھج ہوگی
کانپتے ہاتھوں سے ٹوٹی ہوئی بنیادوں پر — جو بھی دیوار اُٹھاؤ گے وہی کج ہوگی

کوئی پتّھر ہو کہ نغمہ کوئی پیکر ہو کہ رنگ
جو بھی تصویر بناؤ گے اپاہج ہوگی

یہ کیسی رُت ہے

یہ کیسی رُت ہے
کہ ہر شجر
صحنِ گلستاں میں
ملول و تنہا سلگ رہا ہے
طیور چپ چاپ کب سے منقار زیرِ پر ہیں
ہوائیں نوحہ کناں
کہ اس باغ کی بہاریں
گئیں تو پھر لوٹ کر نہ آئیں

یہ کیسی رُت ہے
نہ برف باری کے دن
کہ شاخوں کے پیرہن پر
سپیدۂ صبح کا گماں ہو

نہ فصلِ گل ہے
کہ ہر طرف شورِ جانفروشاں سے
کوئے محبوب کا سماں ہو
نہ دَورِ بیت جھڑ کا ہے
کہ بے جان کونپلوں کو
اُمیدِ فردائے مہرباں ہو

یہ کیسی رُت ہے
کوئی تو بولے
کوئی تو دھڑکے
کوئی تو بھڑکے

غزل

آنکھ سے دور نہ ہو دل سے اُتر جائے گا
وقت کا کیا ہے گزرتا ہے گزر جائے گا

اتنا مانوس نہ ہو خلوتِ غم سے اپنی
تو کبھی خود کو بھی دیکھے گا تو ڈر جائے گا

ڈوبتے ڈوبتے کشتی کو اُچھالا دے دوں
میں نہیں کوئی تو ساحل پہ اُتر جائے گا

زندگی تیری عطا ہے تو یہ جانے والا
تیری بخشش تری دہلیز پہ دھر جائے گا

ضبط لازم ہے مگر دُکھ ہے قیامت کا فراز
ظالم اب کے بھی نہ روئے گا تو مر جائے گا

غزل

کب یاروں کو تسلیم نہیں کب کوئی عدو انکاری ہے
اس کوئے طلب میں ہم نے بھی دل نذر کیا جاں واری ہے

جب سازِ سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو سے سجتے تھے
وہ رسم ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے

کچھ اہلِ ستم کچھ اہلِ حشم میخانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چوم کے چھوڑ گئے دیکھا کہ یہ پتّھر بھاری ہے

جب پرچمِ جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اس وقت سے لے کر آج تلک جلّاد پہ ہیبت طاری ہے

زخموں سے بدن گلزار سہی پر ان کے شکستہ تیر گنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

ہم سہل انگار سہی لیکن کیوں اہلِ ہوس یہ بھول گئے
یہ خاکِ وطن ہے جاں اپنی اور جان تو سب کو پیاری ہے

(جنگ ستمبر ۱۹۶۵ء)

میں کیوں اُداس نہیں

(جنگ ستمبر ۶۵ء کے موقع پر لکھی گئی)

لہولہان مرے شہر مرے یار شہید — مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخمِ جگر تک پہنچ نہیں پائے — کہ مجھ کو منزلِ اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہوں کہ پشاور سے چاٹگام تک — مرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں

وہی ہوں میں مرا دل بھی وہی جنوں بھی وہی — کسی پہ تیر چلے جان فگار اپنی ہو
وہ ہیروشیما ہو ویتنام ہو کہ بٹ مالو؎ — کہیں بھی ظلم ہو آنکھ اشکبار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج مرا — متاعِ درد سبھی پر نثار اپنی ہو

نہیں کہ درد نے پتھر بنا دیا ہے مجھے — نہ یہ کہ آتشِ احساس سرد ہے میری
نہیں کہ خونِ جگر سے تہی ہے میرا قلم — نہ یہ کہ لوحِ وفا برگِ زرد ہے میری
گواہ ہیں میرے احباب میرے شعر ثبوت — کہ منزلِ رسن و دار گرد ہے میری

؎ کشمیر کا ایک قصبہ

بجا کہ امن کا بربط اٹھائے آج تلک   ہمیشہ گیت محبت کے گائے ہیں میں نے
عزیز ہے مجھے معصوم صورتوں کی ہنسی   بجا پیار کے نغمے سنائے ہیں میں نے
چھڑک کے اپنا لہو اپنے آنسوؤں کی پھوار   ہمیشہ جنگ کے شعلے بجھائے ہیں میں نے

میں سنگدل ہوں نہ بیگانۂ وفا یارو   نہ یہ کہ میں کسی خواب زار میں کھویا
تمہیں خبر ہے کہ دل پر خراش جب بھی لگے   تو بند رہ نہیں سکتا مرا لبِ گویا
وہ مرگِ ہم نفساں پہ حزیں نہیں ہے تو کیوں   جو فاطمی و لوممبا کی موت پر رویا

دلاورانِ وفا کیش کی شہادت پر   مرا جگر بھی لہو ہے پہ وقفِ یاس نہیں
سیالکوٹ کے مظلوم ساکنوں کے لیے   جز آفریں کے کوئی لفظ میرے پاس نہیں
میں کیسے خطۂ لاہور کے پڑھوں نوحے   یہ شہرِ زندہ دلاں آج بھی اداس نہیں

جنوں فروغ ہے یارو عدو کی سنگ زنی   ہزار شکر کہ معیارِ عشق پست نہیں
مناؤ جشن کہ روشن ہیں مشعلیں اپنی   دریدہ سر ہیں تو کیا غم شکستہ دست نہیں
مرے وطن کی جبیں پر دمک رہا ہے جو زخم   وہ نقشِ فتح ہے داغِ غمِ شکست نہیں

"گریز داز صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست"

غزل

اب شوق سے کہ جاں سے گزر جانا چاہیے
بول اے ہوائے شہر! کدھر جانا چاہیے

کب تک اسی کو آخری منزل کہیں گے ہم
کوئے مراد سے بھی اُدھر جانا چاہیے

وہ وقت آ گیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر
گہرے سمندروں میں اُتر جانا چاہیے

اب رفتگاں کی بات نہیں کارواں کی ہے
جس سمت بھی ہو گردِ سفر جانا چاہیے

کچھ تو ثبوتِ خونِ تمنّا کہیں ملے
ہے دل تہی تو آنکھ کو بھر جانا چاہیے

یا اپنی خواہشوں کو مقدّس نہ جانتے
یا اپنی خواہشوں کے ساتھ ہی مر جانا چاہیے

گئی رُت

پھر آ گئی ہے، گئی رُت تمھیں خبر بھی نہیں
خبر مجھے بھی نہیں تھی کہ رات پچھلے پہر
کسی نے مجھ سے کہا جاگ اے دریدہ جگر
نشستہ ہے سرِ دہلیز کوئی بام نشیں

بدل چکا تھا سبھی کچھ تمھارے جاتے ہی
فلک کا چاند، زمیں کے گلاب راکھ ہُوئے
وہ راکھ خواب ہُوئی پھر وہ خواب راکھ ہُوئے
تم آس کو تو میں سمجھوں تمھارے آتے ہی

ہر ایک نقش وہی آج بھی ہے جو کل تھا
یہ راکھ خواب بنے خواب سے گلاب بنے
ہر ایک ستارۂ مژگاں سے ماہتاب بنے
برس فراق کا جیسے وصال کا پل تھا

کردار

ہم ابھی ایستادہ تھے
اب سے کچھ پہلے
وفا کے فرشِ پائندہ پہ
خوش وقتی کے رنگیں شامیانوں کے تلے
اپنے ہاتھوں میں قرار و قول کی شمعیں لیے
آندھیوں میں زلزلوں میں
تا قیامت ساتھ دینے کے لیے
آمادہ تھے
اک دوسرے کے اس قدر دلدادہ تھے

دیکھنے والوں میں شامل
یار بھی اغیار بھی
چند آنکھوں میں نمی
چند آنکھوں میں حقارت، برہمی
چند آنکھوں میں سکوتِ دائمی

جم گئے سائے ادھر
اور کانپ اٹھی اس طرف دیوار بھی
دشمنوں کو بھی یقیں
اور بدگماں کچھ ہمنشیں — غم خوار بھی
دیکھنے والوں نے دیکھا
کس طرح صدیاں اچانک
ثانیوں میں بٹ گئیں
شامیانوں کی طنابیں کٹ گئیں
بجھ گئیں شمعیں قرار و قول کی
فرشِ وفا کی سخت و پائندہ سلیں بھی پھٹ گئیں
اور دو پیکر
خود اپنے خنجروں کے وار سے
خاک و خوں میں تر بتر
فرش پر افتادہ تھے
ہم ابھی ایستادہ تھے

غزل

نظر بجھی تو کرشمے بھی روز و شب کے گئے
کہ اب تلک نہیں آئے لوگ جب کے گئے

سنے گا کون تری بے وفائیوں کا گلہ
یہی ہے رسمِ زمانہ تو ہم بھی اب کے گئے

مگر کسی نے ہمیں ہمسفر نہیں جانا
یہ اور بات کہ ہم ساتھ ساتھ سب کے گئے

اب آئے ہو تو یہاں کیا ہے دیکھنے کے لیے
یہ شہر کب سے ہے ویراں وہ لوگ کب کے گئے

گرفتہ دل تھے، مگر حوصلہ نہ ہارا تھا
گرفتہ دل ہیں مگر حوصلے بھی اب کے گئے

تم اپنی شمعِ تمنّا کو رو رہے ہو فرازؔ
ان آندھیوں میں تو پیارے چراغ سب کے گئے

روزنا جرمن نژاد

روزنا جرمن نژاد
اس کے ہونٹوں میں حرارت
جسم میں طوفاں
برہنہ پنڈلیوں میں آگ
نیّت میں فساد
رنگ و نسل و قامت و قد
سرزمین و دین کے سب تفرقوں سے بے نیاز
ہر کسی سے بے تکلّف ایک حد تک دلنواز
وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس

روز نا جرمن نژاد
اور دیکھنے والوں میں سب
اس کی آسودہ نگاہی بے محابا میگساری کے سبب
پیکرِ تسلیم و سرتا پا طلب
ان میں ہر اک کی متاعِ کُل
بہائے التفاتِ نیم شب

روز نا جرمن نژاد
اور اس کا دل — زخموں سے چور
اپنے ہمدردوں سے ہمسایوں سے دُور
گھر کی دیواریں نہ دیواروں کے سایوں کا سرور
جنگ کے آتشکدے کا رزق کب سے بن چکا
ہر آہنی بازو کا خوں
ہر چاند سے چہرے کا نور

خلوتیں خاموش و ویراں
اور ہر دہلیز پر اک مضطرب مرمر کا بُت
ایستادہ ہے بچشمِ ناصبُور

کون ہے اپنوں میں باقی
توسنِ راہِ طلب کا شہسوار
ہر دریچے کا مقدّر انتظار

اجنبی مہماں کی دستک خواب
شاید خواب کی تعبیر بھی
چند لمحوں کی رفاقت جاوداں بھی
حسرتِ تعمیر بھی
الوداعی شام، آنسو، عہد و پیماں
مضطرب صیّاد بھی نخچیر بھی
کون کر سکتا ہے ورنہ ہجر کے کالے سمندر کو عبور
اجنبی مہماں کا اک حرفِ وفا
نومید چاہت کا غرور

روزنا اب اجنبی کے ملک میں خود اجنبی
پھر بھی پھرے پر اداسی ہے نہ آنکھوں میں تھکن
اجنبی کا ملک جس میں چار سُو
تاریکیاں ہی خیمہ زن

سب کے سایوں سے بدن
روز نا مرمر کا بُت
اور اس کے گرد
ناچتے سائے بہت
سب کے ہونٹوں پر وہی حرفِ وفا
ایک ہی سب کی صدا
وہ سبھی کی ہم پیالہ ہم نفس
عمر شاید بیس سے اُوپر برس یا دو برس
اس کی آنکھوں میں تجسّس اور بس!

غزل

بدن میں آگ سے چہرہ گلاب جیسا ہے
کہ زہرِ غم کا نشہ بھی شراب جیسا ہے

وہ سامنے ہے مگر تشنگی نہیں جاتی
یہ کیا ستم ہے کہ دریا سراب جیسا ہے

کہاں وہ قرب کہ اب تو یہ حال ہے جیسے
ترے فراق کا عالم بھی خواب جیسا ہے

مگر کبھی کوئی دیکھے کوئی پڑھے تو سہی
دل آئینہ ہے تو چہرہ گلاب جیسا ہے

بہارِ خوں سے چمن زار بن گئے مقتل
جو نخلِ دار ہے شاخِ گلاب جیسا ہے

فرازؔ سنگِ ملامت سے زخم زخم سہی
ہمیں عزیز ہے خانہ خراب جیسا ہے

فضانورد بادل

میں سایۂ نخل میں کھڑا ہوں
جب ایک فضانورد بادل
لہراتا ہُوا نظر پڑا تھا

یوں قلب و جگر سے آگ اُٹھی
برسوں کی طویل تشنہ کامی
یک لخت ہی جیسے جاگ اُٹھی

پل بھر میں بدن دھک رہا تھا
میں سایۂ نخل سے نکل کر
بادل کی طرف لپک رہا تھا

بادل تھا سمندروں کا پیاسا
یہ اس کا کرم کہ چند لمحے
وہ مجھ کو بھی دے گیا دلاسا

دل پہ لیے داغِ نامرادی
چاہا پلٹ چلوں ادھر بھی
جس سمت سے درد نے صدا دی

دیکھا تو وہ رُت بھی جا چکی تھی
مایوس کن انتظار کی دھوپ
اس نخلِ وفا کو کھا چکی تھی

غزل

کہا تھا کس نے تجھے آبرو گنوانے جا
فراؔز اور اسے حالِ دل سُنانے جا

کل اک فقیر نے کس سادگی سے مجھ سے کہا
تری جبیں کو بھی ترسیں گے آستانے جا

اسے بھی ہم نے گنوایا تری خوشی کے لیے
تجھے بھی دیکھ لیا ہے ارے زمانے جا

بہت ہے دولتِ پندار پھر بھی دیوانے
جو تجھ سے رُوٹھ چکا ہے اسے منانے جا

سُنا ہے اس نے سوئمبر کی رسم تازہ کی
فراؔز تو بھی مقدّر کو آزمانے جا

غزل

نہ اب جواز نہ موقع ہے ہاتھ ملنے کا
ہمیں کو شوق رہا راستے بدلنے کا

پہنچ گئے سرِ منزل بخوبیٔ قسمت
مگر وہ لطف کہاں ساتھ ساتھ چلنے کا

ہیں آپ اپنے ہی پندار کے حصار میں ہوں
بجز شکست کہاں راستہ بدلنے کا

وہ ساعتیں تو ہواؤں کے ساتھ جا بھی چکیں
نظر میں اب بھی ہے منظر چراغ جلنے کا

وہ سرد مہر سہی پر نگاہِ لطف کے بعد
فرازؔ دیکھ سماں برف کے پگھلنے کا

فصلِ رائیگاں

زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں
تو دریدہ دل میں آشفتہ بیاں
زندگی کے خواب فصلِ رائیگاں

رائیگاں ہر درد کے سُورج کی دھوپ
آبلے ہاتھوں کے ماتھوں کا عرق
گیسوؤں کے ابر ہونٹوں کی شفق
میرے دل کی آگ تیرا رنگ و روپ

رائیگاں خونِ وفا کی ندیاں
کشتِ بے حاصل کا حاصل بے نشاں

آنسوؤں کی جھیل دوپہروں کی لو
جسم شل احساس مردہ دل لہو

چار جانب ریت کے ٹیلے رواں
کوئی نوحہ گر نہ کوئی چشمِ نم
صرف ہم تو بھی کہاں میں بھی کہاں
جیسے ویرانے میں لاشیں بے اماں

بے کفن، بے گور، رزقِ کرگساں
اور یہ یادیں بھی کچھ لمحوں کی ہیں
جس طرح صحرا میں قدموں کے نشاں
جس طرح تعزیتی خاموشیاں

سلامتی کونسل

پھر چلے ہیں مرے زخموں کا مداوا کرنے
مرے غم خوار اسی فتنہ گرِ دہر کے پاس
جس کی دہلیز پہ ٹپکی ہیں لہو کی بوندیں
جب بھی پہنچا ہے کوئی سوختہ جاں کشتۂ یاس
جس کے ایوانِ عدالت میں فروکش قاتل
بزم آرا و سخن گستر و فرخندہ لباس
ہر گھڑی نعرہ زناں "امن و مساوات کی خیر"
زر کی میزان میں رکھے ہُوئے انسان کا ماس

کون اس قتل گہہِ ناز کے سمجھے اسرار
جس نے ہر دشنہ کو پھُولوں میں چھپا رکھا ہے
امن کی فاختہ اُڑتی ہے نشاں پر لیکن
نسلِ انساں کو صلیبوں پہ چڑھا رکھا ہے
اس طرف نطق کی بارانِ کرم اور ادھر
کاسۂ سر سے مناروں کو سجا رکھا ہے

جب بھی آیا ہے کوئی کشتۂ بیداد اُسے
مرہمِ وعدۂ فردا کے سوا کچھ نہ ملا
یہاں قاتل کے طرفدار ہیں سارے قاتل
کاہشِ دیدۂ پرخوں کا صلہ کچھ نہ ملا
کاشمر، کوریا، وٹ نام، دومنکن، کانگو
کسی بسمل کو بجز حرفِ دعا کچھ نہ مِلا

قصرِ انصاف کی زنجیر ہلانے والو!
کجکلاہوں پہ قیامت کا نشہ ہے طاری
اپنی شمشیر پہ کشکول کو ترجیح نہ دو
دم ہو بازو میں تو ہر ضرب جنوں ہے کاری
اس جزیرہ میں کہیں نور کا مینار نہیں
جس کے اطراف میں ایک قلزم خوں ہے جاری
جوہر جامِ جم از کانِ جہاں دگر است
تو توقع زِ گلِ کوزہ گراں می داری

نوحہ گر چُپ ہیں

نوحہ گر چُپ ہیں کہ روئیں بھی تو کس کو روئیں
کوئی اس فصلِ ہلاکت میں سلامت بھی تو ہو
کونسا دل ہے کہ جس کے لیے آنکھیں کھولیں
کوئی بسمل کسی شبِ خوں کی علامت بھی تو ہو

شکر کی جا ہے کہ بے نام ونسب کے چہرے
مسندِ عدل کی بخشش کے سزاوار ہُوے
کتنی تکریم سے دفنائے گئے سوختہ تن
کتنے اعزاز کے حامل یہ گنہگار ہُوے

یوں بھی اس دور میں جینے کا کسے تھا یارا
بے نوا بازوئے قاتل سے گلہ مند نہ ہوں
زندگی یوں بھی تو "مفلس کی قبا" تھی لیکن
دلفگاروں کے کفن میں بھی تو پیوند نہ ہوں

ناوکِ ظلِّ الٰہی اجل آہنگ سہی
شکر کی جا ہے کہ سونے کی اَنی رکھتے ہیں
جاں گنوائی بھی تو کیا مدفن و مرقد تو ملا
شاہِ جم جاہ طبیعت تو غنی رکھتے ہیں

غزل

گزرا ہوں جس طرف سے بھی پتھر لگے مجھے
ایسے بھی کیا تھے لعل و جواہر لگے مجھے

لو ہو چکی شفا کہ مداوائے دردِ دل
اب تیری دسترس سے بھی باہر لگے مجھے

ترسا دیا ہے ابرِ گریزاں نے اس قدر
برسے جو بوند بھی تو سمندر لگے مجھے

تھامے رہو گے جسم کی دیوار تابکے
یہ زلزلہ تو روح کے اندر لگے مجھے

گر روشنی یہی ہے تو اے بد نصیب شہر
اب تیرگی ہی تیرا مقدر لگے مجھے

منزل کہاں کہ زادِ سفر کو بچا رکھو
اب رہزنوں کی نیّتِ رہبر لگے مجھے

وہ مطمئن کہ سب کی زباں کاٹ دی گئی
ایسی خموشیوں سے مگر ڈر لگے مجھے

وہ قحطِ حرفِ حق ہے کہ اس عہد میں فراز
خود سا گناہگار پیمبر لگے مجھے

غزل

مرے قلم پہ رہی نوک جس کے خنجر کی
سنا ہے اس کی زباں بھی ہُوئی ہے پتّھر کی

رواں ہے قلزمِ خوں اندرونِ شہر بھی دیکھ
کہ خوشنما تو بہت ہے فصیل باہر کی

اُجاڑ پیڑ گئے موسموں کو روتے ہیں
ہر آبجُو کو ہوس پی گئی سمندر کی

فقیہہِ شہر جبیں پر کلاہِ زر رکھے
سنا رہا ہے ہمیں آئتیں مقدّر کی

خود اپنے خوں میں نہائے ہُوئے مگر چُپ ہیں
یہ لوگ ہیں کہ چٹانیں ہیں سُرخ پتّھر کی

وہ ایک شخص کہ سُورج کے رُوپ میں آیا
چُرا کے لے گیا شمعیں فراز ہر گھر کی

قاتل

قاتل چپ ہے
خوں آلودہ ہاتھ میں اب تک
خنجر تھر تھر کانپ رہا ہے
لوگوں کا انبوہ اسے
گھیرے ہیں لے کر
چیخ رہا ہے
یہ قاتل ہے
یہ قاتل ہے
خاک اور خوں میں لت پت لاش
کے ہونٹوں پر
اک بات جمی ہے
یہ قاتل ہے
لیکن کس کا
یہ اپنی تخلیق کا قاتل

اس نے خود کو قتل کیا ہے
لوگوں کا انبوہ مگر
کب سُنتا ہے
کون ہے قاتل
کس نے
کس کو قتل کیا ہے؟

نہیں ہے یوں

نہیں ہے یوں کہ مرا دکھ مری حدود میں ہے
نہ صرف دل ہی دریدہ نہ صرف جاں ہی فگار
نہ صرف دیکھتی آنکھوں میں حسرتوں کا دھواں
نہ صرف ہاتھ شکستہ نہ سر پہ زخم ہزار

جو یوں بھی ہو تو بڑی بات ہے تری قربت
تری وفا تری چاہت تری مسیحائی
ہر ایک زخم کو دھو دے شفیق ہاتھوں سے
ہر ایک درد کو چُن لے تری دل آرائی

مگر یہ درد یہ دکھ کب مری حدود میں ہے
کہاں نہیں مرا پیکر کہاں نہیں یہ فغاں
تو اک وجود کو زندہ تو کر چکے لیکن
ہر اک صلیب پہ میرا ہی جسم آویزاں

ہر ایک تیرِ ستم پر مرا لہو لرزاں
کسے کسے تو بچائے گی اے مری دِرماں

غزل

مزاج ہم سے زیادہ جُدا نہ تھا اُس کا
جب اپنے طور یہی تھے تو کیا گلہ اُس کا

وہ اپنے زعم میں تھا بے خبر رہا مجھ سے
اسے گماں بھی نہیں میں نہیں رہا اُس کا

وہ برق رو تھا مگر رہ گیا کہاں جانے
اب انتظار کریں گے شکستہ پا اُس کا

چلو یہ سیلِ بلا خیز ہی بنے اپنا
سفینہ اُس کا، خدا اُس کا، ناخدا اُس کا

یہ اہلِ درد بھی کس کی دہائی دیتے ہیں
وہ چپ بھی ہو تو زمانہ ہے ہمنوا اُس کا

ہمیں نے ترکِ تعلّق میں پہل کی کہ فرازؔ
وہ چاہتا تھا مگر حوصلہ نہ تھا اُس کا

غزل

چلو اسی سے کہیں دل کا حال جو بھی ہو
وہ چارہ گر تو ہے اس کو خیال جو بھی ہو

اسی کے در سے ملتے ہیں سلسلے جاں کے
اسی کے نام لگا دو ملال جو بھی ہو

مرے نہ ہار کے ہم قیس و کوہکن کی طرح
اب عاشقی میں ہماری مثال جو بھی ہو

یہ رہگزر پہ جو شمعیں دمکتی جاتی ہیں
اسی کا قامتِ زیبا ہے چال جو بھی ہو

فرازؔ اس نے وفا کی بے وفائی کی
جوابدہ تو ہمیں ہیں سوال جو بھی ہو

کشان بی بی

تو جب
بمبریت کے قاتل پہاڑوں کی صلیبوں سے اُتر آئے
تو یہ جانا
کہ ہم دشتِ عدم کو پار کر آئے
ہر اک کے پاؤں چھلنی جسم شل
اعضا، تھکن سے چُور
لیکن سب
ہراس مرگ سے بے جان — بے حس تھے
سبھی یوں زرد رُو جیسے
ابھی تک آسمانوں کے سفر سے لوٹ کر

* کافرستان کی ایک لڑکی

رُوحیں نہیں آئیں
چلو ہم سب کے سب زندہ ہیں
جیسے بھی ہیں یکجا ہیں
ضیا، باسط، سعید اور ہیں
ہمارا میزباں کب سے نہ جانے
گھر کے دروازے کھلے چھوڑے
سبک شہتیر کے پل پر ہمارا منتظر تھا
اس کو یہ معلوم تھا
ہم اجنبی مہمان
سیاحت کے لیے کن مشکلوں سے
ہفت خواں طے کر کے
اس وادی میں آئیں گے

چناروں کے بلند اشجار
انگوروں کی بیلیں
چار سُو سبزہ
ہوائیں بید مشک و عود و مُر کی خوشبوؤں
سے چُور بوجھل

طائرانِ خوشنما و خوش نوا — بے کل
سبک رفتار چشموں کی تہوں میں
پتّھروں کا نیلم و یاقوت سا چھل بل
ادھر کچھ دُور بزغالوں کے گلّے
نوجواں چرواہیوں کے دودھیا چہروں کی صورت
برف سے شفاف و دل آرا،
فضا حیرت فزا — سحر آفریں دنیا
"مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگ تماشا را"

ہمارا میزباں مفلس
لیکن شام کو خوانِ ضیافت دیکھ کر
ہم خس بدنداں تھے
کشادہ طشت میں بزغالۂ بریاں
بطک میں آبِ تاک
اور کشتیوں میں ڈھیر سیبوں کے
الاؤ کی دہکتی آگ
کتنی گرم کتنی خوبصورت تھی

مگر ہم منتظر اس پل کے تھے
جب کافرستاں کی جواں پریاں
زمینی خلد کی حوریں
دف و مردنگ کی تھاپوں پہ رقصاں
اپنے محبوبوں کی فرقت کے
نشیلے گیت گائیں گی
الف لیلہ کے شہزادوں کی صورت
ہم میں ہر اک
اس طلسماتی فضا کے سحر میں گم تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
سیہ ملبوس میں لپٹے ہوُئے
مرمر کے بُت
مہتاب سے پیکر
سبھی باہوں میں باہیں ڈال کر زنجیر کی صورت
کماں کی شکل میں جنباں
کہ جیسے دیوتاؤں کے رتھوں کی گھوڑیاں
وحشت سے پاکُوباں
دف و دمامہ و مردنگ کے آہنگ میں

آہستہ آہستہ
کھنکھتے قہقہے — مجوب آوازیں بھی
شامل ہو گئیں آخر
کہ جیسے نقرئی گھنگرو
اچانک جھنجھنا اُٹھیں

سبھی غارت گرِ تمکین و ہوش و دشمنِ ایماں
ہر اک فتنہ گرِ دوراں
مگر وہ سرگروہِ نازنیناں
غیرتِ ناہید
جانِ حلقۂ خوباں
کشان بی بی
قد و قامت قیامت
جنبشیں جادو
بدن طوفاں
ضیا کردار میں گوتم
مجسّم صدق و ایثار و وفا
دردآشنا و نفس کش ہمدم

لہو اس کا بھی اس شعلے نے گرمایا
مگر سب ساتھیوں سے کم

بتانِ آذری رقصاں
مگر باسط جو اک فن کار
لیکن شکوہ سنجِ زندگی ہر دم
قلم اس کا دُر افشان و گہر تحریر
لیکن خود تہی داماں
شکستہ دل
خود اپنے فن سے اپنے آپ سے نالاں
جہاں دنیا کے غم بھولا ہُوا
بسمل
ہر اک پیکر پہ سو سو جان سے قرباں

سعید اک کم نظر جذبات کا پتلا
مہندس
اور فقط جسموں کا سوداگر
جو اپنے ساتھیوں سے بھی چھپا کر ساتھ لایا تھا

کئی تحفے
ملمع کی ہوئی انگوٹھیاں
جھوٹے نگوں کے ہار
دل آویز آویزے
کسی ماہر شکاری کی طرح
اپنی کمند و دام پہ نازاں
ہر اک پر سحر طاری تھا
بتانِ آذری کا رقص جاری تھا

ضیا حیرت میں گم
باسط زخود رفتہ
سعید افسوں زدہ
ہیں بُت
کشان بی بی کے لب
کلیوں کی صورت نیم وا
اور ہم فقط
آواز کی خوشبو سے پاگل
لذتِ معنی سے نامحرم

زبانِ یار کیلاشی و ما از بیگانہ
(ہمارے میزباں نے ترجمانی کی)
کشان بی بی یہ کہتی ہے
مرے محبوب تو اک دستۂ مُر ہے
کہ جو راتوں کو میری چھاتیوں کے درمیاں
خوشبو لٹاتا ہے
مری ہمجولیو!
بستی کے سارے نوجوانوں میں
مرا محبوب پیارا
جس طرح بن کے درختوں میں ہو نخلِ سیب استادہ
مرا محبوب
جیسے جھاڑیوں کے درمیاں کوئی گُلِ سوسن
مرا محبوب مجھ سے کل ملا تھا
اس نے مجھ سے خوب باتیں کیں
وہ کہتا تھا کہ اے میری پری
اے نازنیں
اب تو مری بستی کو میرے ساتھ چل
برسات کا موسم چلا

بادل برس کر کھل چکے
انگور اور سیبوں کی مٹی جاگ اٹھی
اے کوہساروں کی چکوری
تو نہ جانے کن پہاڑوں کی دراڑوں میں چھپی ہے
آمرے ہمراہ چل پیاری

بتانِ آذری کا رقص جاری تھا
فضا پر سحر طاری تھا
ہر اک کی آنکھ میں تِل کی طرح
وہ کافرستاں کی قلوپطرہ
نگہ ہم ہیں کوئی سبز رنہ انتوّنی
ضیا گوتم سہی
لیکن کشاں بی بی
وہ کافر جو ضیا کو بھی نہ سونپی جائے ہے مجھ سے
نہ جانے کس طرح یہ شب ڈھلی
لیکن سحر دم
جب پرندوں کے چہکنے کی صدا آئی
کشان بی بی

سیہ ملبوس میں لپٹی
جبیں پر کوڑیوں کا تاج
گالوں پر گھنی زلفیں
کنیزوں کی طرح اپنی رفیقوں کو لیے
رخصت ہُوئی ہم سے
بصد اندازِ استغناؔ و دارائی
تو ہم سارے تماشائی تھے پتھر
اور پتھر تھے تماشائی

غزل

تڑپ اُٹھوں بھی تو ظالم تری دہائی نہ دوں
میں زخم زخم ہوں پھر بھی تجھے دکھائی نہ دوں

ترے بدن میں دھڑکنے لگا ہوں دل کی طرح
یہ اور بات کہ اب بھی تجھے سُنائی نہ دوں

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے
کہ اب کبھی اسے الزامِ بے وفائی نہ دوں

مری بقا ہی مری خواہشِ گناہ میں ہے
میں زندگی کو کبھی زہرِ پارسائی نہ دوں

جو ٹھن گئی ہے تو یاری پہ حرف کیوں آئے
حریفِ جاں کو کبھی طعنِ آشنائی نہ دوں

مجھے بھی ڈھونڈ کبھی محوِ آئینہ داری
میں تیرا عکس ہوں لیکن تجھے دکھائی نہ دوں

یہ حوصلہ بھی بڑی بات ہے شکست کے بعد
کہ دوسروں کو تو الزامِ نارسائی نہ دوں

فرازؔ دولتِ دل ہے متاعِ محرومی
میں جامِ جم کے عوض کاسۂ گدائی نہ دوں

خواب جھوٹے خواب

خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی
درد کی لذّت بھی دھوکہ قرب کا غم بھی فریب
بے قراری بھی نمائش خام پایہ ائے شکیب
تشنگی کی آگ بھی قاتل شراب ناب بھی

میں نے جس دریا کی وسعت دیکھ کر چاہا اسے
وہ تو میری موجۂ غم سے بھی تھا پایاب تر
تو بڑھی جن ساحلوں کی سمت مجھ کو دیکھ کر
تشنگی ان کی بجھا سکتا نہیں سیلاب بھی

واہموں میں مبتلا ہم آج تک سمجھا کیے
تیرا آئینہ بھی سورج میرے پتھّر بھی گلاب
آؤ اب تسلیم کر لیں سب غلط باتیں کہیں
کاغذی ہیں پھول میرے تیرے دریا بھی سراب
خواب جھوٹے خواب میرے خواب تیرے خواب بھی

آئینہ

تجھ سے بچھڑا ہوں تو آج آیا مجھے اپنا خیال
ایک قطرہ بھی نہیں باقی کہ ہوں پلکیں تو نم
میری آنکھوں کے سمندر کون صحرا پی گئے
ایک آنسو کو ترستی ہے مری تقریبِ غم

میں نہ رو پایا تو سوچا مسکرا کے دیکھ لوں
شاید اس بے جان پیکر میں کوئی زندہ ہو خواب
پر لبوں کے تن برہنہ شاخچوں پہ اب کہاں
مسکراہٹ کے شگوفے خندۂ دل کے گلاب

کتنا ویراں ہو چکا ہے میری ہستی کا جمال
تجھ سے بچھڑا ہوں تو آج آیا مجھے اپنا خیال

غزل

درد کی راہیں نہیں آساں ذرا آہستہ چل
اے سبک رو اے حریفِ جاں ذرا آہستہ چل

منزلوں پر قرب کا نشہ ہوا ہو جاتے کا
ہمسفر وہ ہے تو اے ناداں ذرا آہستہ چل

نامرادی کی تھکن سے جسم پتھر ہو گیا
اب سکت کیسی دلِ ویراں ذرا آہستہ چل

جام سے لب تک ہزاروں لغزشیں ہیں خوش نہ ہو
اب بھی محرومی کا ہے امکاں ذرا آہستہ چل

ہر تھکا ہارا مسافر ریت کی دیوار ہے!
اے ہوائے منزلِ جاناں ذرا آہستہ چل

اس نگر میں زلف کا سایہ نہ دامن کی ہوا
اے غریبِ شہرِ ناپُرساں ذرا آہستہ چل

آبلہ پا تجھ کو کس حسرت سے تکتے ہیں فرازؔ
کچھ تو ظالم پاسِ ہمراہاں ذرا آہستہ چل

غزل

گلہ نہ کر دلِ ویراں کی ناسپاسی کا
ترا کرم بھی سبب بن گیا اُداسی کا

ملول کر گئی ویراں ساعتوں کی صدا
چمن میں جی نہ لگا جنگلوں کے باسی کا

بھرم کھُلا ہے کہ جب اس سے ہم کلام ہوئے
ہمیں بھی زعم تھا پیارے سخن شناسی کا

شکستِ عہد کوئی ایسا سانحہ تو نہ تھا
تجھے بھی رنج ہُوا بات اک ذرا سی کا

فرازؔ آج شکستہ پڑا ہوں بُت کی طرح
میں دیوتا تھا کبھی اک دیوداسی کا

نذرِ نذرل ؎

فنکار جو اپنے سحرِ فن سے
پتھر کو زباں بخشتا ہے
الفاظ کو ڈھال کر صدا میں
آواز کو جاں بخشتا ہے
تاریخ کو اپنا خوں دے کر
تہذیب کو شاں بخشتا ہے

فنکار خموش ہو تو جابر
ظلمت کے نشاں کھولتا ہے
ہر اہلِ نظر کو دستِ قاتل
نیزے کی انی پہ تولتا ہے
انساں بزورِ خاک و خوں میں
انساں کے حقوق رولتا ہے

فنکار اگر زباں نہ کھولے
انبارِ گہر نصیب اس کا
ورنہ ہر شہر یار دشمن
ہر شیخِ حرم رقیب اس کا
چاہے وہ فرازؔ ہو کہ نذرلؔ
بولے تو صلہ صلیب اس کا

؎ نذر الاسلام

لہولہان مسیحا

زمیں نے سانولے چہروں کی دُھند پھیلا دی
جب آفتاب نے چاہا کہ اپنے شعلوں سے
سمندروں کی تہوں کے تمام لعل و گُہر
محبّتوں کے مہکتے گلاب راکھ کرے
زمیں کے سانولے چہرے نہ سرمئی بادل
بچا سکے ہیں مرے کاسنی شگوفوں کو!
ابل رہے ہیں چٹانوں پہ رینگتے چشمے
ہر ایک سرو صنوبر، چنار کی صُورت
بھڑک اُٹھا ہے یہاں تک میرا سایہ بھی
مرے وجود کی دیوار میں سمٹ آیا!
وہ آفتاب کہ نصف النّہار پر ہے ابھی
مرے زمیں کے سلگتے ہُوئے شگوفوں کو
یقین غیر یقینی بہار پر ہے ابھی
پلٹ کے آئے نہ آئے اک آسرا ہے مگر
لہولہان مسیحا کہ دار پر ہے ابھی

غزل

صحرا تو بوند کو بھی ترستا دکھائی دے
بادل سمندروں پہ برستا دکھائی دے

اس شہرِ غم کو دیکھ کے دل ڈوبنے لگا
اپنے پہ ہی سہی کوئی ہنستا دکھائی دے

اے صدرِ بزم مے تری ساقی گری کی خیر
ہر دل بسانِ شیشہ شکستہ دکھائی دے

گر مے نہیں تو زہر ہی لاؤ کہ اس طرح
شاید کوئی نجات کا رستہ دکھائی دے

اے چشمِ یار تو بھی تو کچھ دل کا حال کھول
ہم کو تو یہ دیار نہ بستا دکھائی دے

جنسِ ہنر کا کون خریدار ہے فراز
ہیرا، کہ پتھروں سے بھی سستا دکھائی دے

غزل

یہ دل کا چور کہ اس کی ضرورتیں تھیں بہت
وگرنہ ترکِ تعلق کی صورتیں تھیں بہت

ملے تو ٹوٹ کے روئے نہ کھل کے باتیں کیں
کہ جیسے اب کے دلوں میں کدورتیں تھیں بہت

بھلا دیتے ہیں ترے غم نے دکھ زمانے کے
خدا نہیں تھا تو پتھّر کی مورتیں تھیں بہت

دریدہ پیرہنوں کا خیال کیا آتا؟
امیرِ شہر کی اپنی ضرورتیں تھیں بہت

فراؔز دل کو نگاہوں سے اختلاف رہا
وگرنہ شہر میں ہم شکل صورتیں تھیں بہت

چلو اِس بُت کو رو لیں

چلو اس بُت کو بھی رو لیں
جسے سب نے کہا پتّھر
مگر ہم نے خدا سمجھا
خدا سمجھا
کہ ہم نے پتّھروں میں عمر کاٹی تھی
خدا سمجھا
کہ ہم نے معبدوں کی خاک چھانی تھی
کہ پتّھر تو کہیں دیوارِ زنداں
اور کہیں دہلیزِ مقتل تھے
کبھی سرمایہ دامانِ خلقت
اور کبھی بختِ جنوں کیشاں
کبھی ان کا ہدف دکّانِ شیشہ گر
کبھی صورت گرِ ہنگامۂ طفلاں

کبھی بے نور آنکھوں کے نشاں
بے اشک ارماں
کبھی لوحِ مزارِ جاں
نہ چارہ گر نہ اہلِ درد کے درماں
مگر وہ بُت
چراغِ بزمِ تنہائی
مجسّم رنگ و رعنائی
فضا کی روشنی
آنکھوں کی بینائی
سکونِ جاں
وہ آنکھیں درد کی جھیلیں
وہ لب چاہت کے شعلوں سے بھرے مرجاں
وہ بُت انساں
مگر ہم نے وفورِ شوق میں
فرطِ عقیدت سے کہا یزداں
یہ ہم کافر
کہ دنیا کم نظر ناداں

سبھی لائے ہمارے سامنے اوراقِ پارینہ
کہ جن پر نقش تھے
اہلِ وفا کے عکسِ دیرینہ
شکستہ استخواں بے جان نابینا
جبیں سجدوں سے داغی
اور زخموں سے بھرا سینہ
اور ان کے بُت
مآلِ سوزِ اہلِ دل سے بے پروا
سبھی خود بین و خود آرا
ہر اک محمل نشیں تنہا
مگر مصروفِ نظارا

اور اب ہم بھی گرفتہ دل
نہ محرومی کہ سہہ پائیں
نہ بربادی چھپانے کے رہے قابل
وہ بُت مرمر کی سل
اور اہلِ سجدہ کی جبیں گھائل
سبھی کی بات سچ

اور ہم ندامت کے عرق میں تر بتر
شرمندگی کے کرب سے بسمل

چلو اب اپنے جیسے نامرادوں سے ہنسیں بولیں
جو وہ کہتے ہیں وہ ہو لیں
جبیں کے داغ آنکھوں کا لہو دھو لیں
چلو اُس بُت کو بھی رو لیں

غزل

سائے کی طرح نہ خود سے رم کر
دیوار کو اپنا ہم قدم کر

اپنے ہی لیے بہا نہ دریا
اوروں کے لیے بھی آنکھ نم کر

تکمیلِ طلب نہیں ہے منزل
طے راہِ وفا قدم قدم کر

اے پچھلی رُتوں کے رونے والے
آنے والے دنوں کا غم کر

ممکن ہو تو تیشۂ ہنر سے
ہر پارۂ سنگ کو صنم کر

ہے چشم براہ ایک دُنیا
پتّھر کی طرح نہ بیٹھ جم کر

یہ راہِ جنوں ہے اس میں پیارے
ممکن ہو تو احتیاط کم کر

اے قصرِ جہاں یہ تیرا معمار
تو ہاتھ فرازؔ کے قلم کر

غزل

دولتِ درد کو دنیا سے چھپا کر رکھنا
آنکھ میں بوند نہ ہو دل میں سمندر رکھنا

کل گئے گزرے زمانوں کا خیال آئے گا
آج اتنا بھی نہ راتوں کو منوّر رکھنا

اپنی آشفتہ مزاجی پہ ہنسی آتی ہے
دشمنی سنگ سے اور کانچ کا پیکر رکھنا

آس کب دل کو نہیں تھی ترے آجانے کی
پر نہ ایسی کہ قدم گھر سے نہ باہر رکھنا

ذکر اس کا ہی سہی بزم میں بیٹھے ہو فرازؔ
درد کیسا ہی اُٹھے ہاتھ نہ دل پر رکھنا

خوں بہا

اُجرتی قاتل کی صورت
بے حس و بے درد لمحوں کا خُدا
آج پہلی بار جیسے قتل کر کے
سخت شرمندہ ہُوا
بے گناہی کے لہو میں تر بتر
معصومیت کی راکھ میں لت پت
تڑپتی آرزو چیخی
کہ آخر کس عداوت کس ارادے
کس خطا کی یہ سزا
ایک منعم کی طرح
اُجرتی قاتل نے میرے سامنے
بکھرے ہُوئے اوراق پر
لفظوں کے کچھ لعل و گہر
یاقوت و مرجاں — رکھ دیے
لو خوں بہا
اور میں مقتول کے مجبور وارث کی طرح
چپ ہو گیا

نوحہ

اگرچہ مرگِ وفا بھی اک
سانحہ ہے لیکن یہ بے حسی
اس سے بڑھ کے جانکاہ ہے
کہ جب ہم خود اپنے ہاتھوں
سے اپنی چاہت کو نامرادی
کے ریگزاروں میں دفن
کر کے جُدا ہُوے تو نہ
تیری پلکوں پہ کوئی آنسو
لرز رہا تھا نہ میرے ہونٹوں
پہ کوئی جاں سوز مرثیہ تھا

غزل

یاد آتا ہے تو کیوں اس سے گلہ ہوتا ہے
وہ جو اک شخص ہمیں بھول چکا ہوتا ہے

ہم ترے لطف سے نادم ہیں کہ اکثر اوقات
دل کسی اور کی باتوں سے دکھا ہوتا ہے

ہاتھ پر ہاتھ نہ رکھ دل کی صداقت کو پرکھ
ورنہ پیمانِ رفاقت سے بھی کیا ہوتا ہے

مل گئے ہو تو چلو رسمِ زمانہ ہی سہی
ورنہ اب پرسشِ احوال سے کیا ہوتا ہے

اس قدر زہر نہ تھا طنزِ حریفاں پہلے
اب تو کچھ خندۂ یاراں سے سوا ہوتا ہے

سادہ دل چارہ گروں کو نہیں معلوم فرازؔ
بعض اوقات دلاسا بھی بلا ہوتا ہے

چاند اور میں

چاند سے میں نے کہا اے مری راتوں کے رفیق
تو کہ سرگشتہ و تنہا تھا سدا میری طرح
اپنے سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں گھاؤ
تو دکھاوے کے لیے ہنستا رہا میری طرح
ضو فشاں حسن ترا میرے ہنر کی صورت
اور مقدّر میں اندھیرے کی ردا میری طرح
وہی تقدیر تری میری زمیں کی گردش
وہی افلاک کا نخچیرِ جفا میری طرح
تیرے منظر بھی ہیں ویراں میرے خوابوں جیسے
تیرے قدموں میں بھی زنجیرِ وفا میری طرح
وہی صحرائے شبِ زیست میں تنہا سفری
وہی ویرانۂ جاں دشتِ بلا میری طرح
آج کیوں میری رفاقت بھی گراں ہے تجھ کو
تو کبھی اتنا بھی افسردہ نہ تھا میری طرح

چاند نے مجھ سے کہا اے میرے پاگل شاعر
تو کہ محرم ہے میرے قصۂ تنہائی کا
تجھ کو معلوم ہے جو زخم میری روح میں ہے
مجھ کو حاصل ہے شرف تیری شناسائی کا
موجزن ہے میرے اطراف میں اک بحرِ سکوت
اور چرچا ہے فضا میں تیری گویائی کا
آج کی شب میرے سینے پہ وہ قابیل اُترا
جس کی گردن پہ دمکتا ہے لہو بھائی کا
میرے دامن میں نہ ہیرے ہیں نہ سونا چاندی
اور بجز اس کے نہیں شوق تمنّائی کا
مجھ کو دُکھ ہے کہ نہ لے جائیں یہ دنیا والے
میری دنیا ہے خزانہ میری تنہائی کا

غزل

وارفتگی میں دل کا چلن انتہا کا تھا
اب بُت پرست ہے جو نہ قائل خدا کا تھا

مجھ کو خود اپنے آپ سے شرمندگی ہوئی
وہ اس طرح کہ تجھ پہ بھروسہ بلا کا تھا

وار اس قدر شدید کہ دشمن ہی کر سکے
چہرہ مگر ضرور کسی آشنا کا تھا

اب یہ کہ اپنی کشتِ تمنّا کو روئیے!
اب اس سے کیا گلہ کہ وہ بادل ہوا کا تھا

تو نے بچھڑ کے اپنے سر الزام لے لیا
ورنہ فراز کا تو یہ رونا سدا کا تھا

سہرا

یوں بھی ہوتا ہے برسوں کے دو ہمسفر
اپنے خوابوں کی تعبیر سے بے خبر
اپنے عہدِ محبّت کے نشّے میں گم !
اپنی قسمت کی خوبی پہ نازاں مگر
زندگی کے کسی موڑ پر کھو گئے
اور اک دوسرے سے جُدا ہو گئے

یوں بھی ہوتا ہے دو اجنبی راہ رو
اپنی راہوں سے منزل سے ناآشنا
ایک کو دوسرے کی خبر تک نہیں
کوئی پیمانِ الفت نہ عہدِ وفا
اتفاقات سے اس طرح مل گئے
ساز بھی بج اُٹھے پھول بھی کھِل گئے

غزل

اگا کے زخم بدن پر قبائیں دیتا ہے
یہ شہر یار بھی کیا کیا سزائیں دیتا ہے

تمام شہر ہے مقتل اسی کے ہاتھوں سے
تمام شہر اسی کو دعائیں دیتا ہے

کبھی تو ہم کو بھی بخشے گا وہ ابر کا ٹکڑا
جو آسمان کو نیلی ردائیں دیتا ہے

جدائیوں کے زمانے پھر آ گئے شاید
کہ دل ابھی سے کسی کو صدائیں دیتا ہے

غزل

چلے تھے یار بڑے زعم میں ہوا کی طرح
پلٹ کے دیکھا تو بیٹھے ہیں نقشِ پا کی طرح

مجھے وفا کی طلب ہے مگر ہر اک سے نہیں
کوئی ملے مگر اس یارِ بے وفا کی طرح

مرے وجود کا صحرا ہے منتظر کب سے
کبھی تو آ جرسِ غنچہ کی صدا کی طرح

ٹھہر گئی ہے محبّت کہاں کہ مدت سے
نہ ابتدا کی طرح ہے نہ انتہا کی طرح

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں
گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

فرازؔ کس کے ستم کا گلہ کریں کس سے
کہ بے نیاز ہوئی خلق بھی خدا کی طرح

اگر یہ سب کچھ نہیں

ملے تو ہم آج بھی ہیں لیکن
نہ میرے دل میں وہ تشنگی تھی
کہ تجھ سے مل کر کبھی نہ بچھڑوں
نہ آج تجھ میں وہ زندگی تھی
کہ جسم و جاں میں اُبال آئے
نہ خواب زاروں میں روشنی تھی
نہ میری آنکھیں چراغ کی لو
نہ تجھ میں ہی خود سپردگی تھی
نہ بات کرنے کی کوئی خواہش
نہ چپ ہی میں خوب صورتی تھی
مجسموں کی طرح تھے دونوں
نہ دوستی تھی نہ دشمنی تھی

مجھے تو کچھ یوں لگا ہے جیسے
وہ ساعتیں بھی گزر گئی ہیں
کہ جن کو ہم لازوال سمجھے
وہ خواہشیں بھی تو مر گئی ہیں
جو تیرے میرے لہو کی حدّت
کو آخرش برف کر گئی ہیں
محبّتیں شوق کی چٹانوں
سے گھاٹیوں میں اُتر گئی ہیں
وہ قربتیں وہ جدائیاں سب
غبار بن کر بکھر گئی ہیں
اگر یہ سب کچھ نہیں تو بتلا
وہ چاہتیں اب کدھر گئی ہیں

غزل

یہ کیا کہ سب سے بیاں دل کی حالتیں کرنی
فرازؔ تجھ کو نہ آئیں محبّتیں کرنی

یہ قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جُدائی کی ساعتیں کرنی

کوئی خدا ہو کے پتّھر جسے بھی ہم چاہیں
تمام عمر اسی کی عبادتیں کرنی

سب اپنے اپنے قرینے سے منتظر اس کے
کسی کو شکر کسی کو شکایتیں کرنی

ہم اپنے دل سے ہیں مجبور اور لوگوں کو
ذرا سی بات پہ برپا قیامتیں کرنی

ملیں جب ان سے تو مبہم سی گفتگو کرنا
پھر اپنے آپ سے سو سو وضاحتیں کرنی

یہ لوگ کیسے مگر دشمنی نبا ہتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبّتیں کرنی

کبھی فراز نئے موسموں میں رو دینا
کبھی تلاش پرانی رفاقتیں کرنی

غزل

فقیہہِ شہر کی مجلس سے کچھ بھلا نہ ہُوا
کہ اس سے مل کے مزاج اور کافرانہ ہُوا

ابھی ابھی وہ ملا تھا ھزار باتیں کیں
ابھی ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہُوا

وہ رات بھول چکو وہ سخن نہ دہراؤ
وہ رات خواب ہُوئی وہ سخن فسانہ ہُوا

کچھ اب کے ایسے کڑے تھے فراق کے موسم
تری ہی بات نہیں میں بھی کیا سے کیا نہ ہُوا

ہجوم ایسا کہ راہیں نظر نہیں آتیں
نصیب ایسا کہ اب تک تو قافلہ نہ ہُوا

شہیدِ شب فقط احمد فراز ہی تو نہیں
کہ جو چراغ بکف تھا وہی نشانہ ہُوا

ویت نام

مجھے یقیں ہے
کہ جب بھی تاریخ کی عدالت میں
وقت لائے گا
آج کے بے ضمیر و دیدہ دلیر قاتل کو
جس کا داماں و آستیں
خونِ بے گناہاں سے تر بتر ہے
تو نسلِ آدم
وفورِ نفرت سے روئے قاتل پہ تھوک دے گی
مگر مجھے اس کا بھی یقیں ہے
کہ کل کی تاریخ
نسلِ آدم سے یہ بھی پوچھے گی
اے مہذب جہاں کی مخلوق
کل ترے روبرو یہی بے ضمیر قاتل

ترے قبیلے کے بے گناہوں کو
جب تہہ تیغ کر رہا تھا
تو تو تماشائیوں کی صورت
خموش و بے حس
درندگی کے مظاہرے میں شریک
کیوں دیکھتی رہی ہے
تری یہ سب نفرتیں کہاں تھیں
بتا کہ اس ظلم کیش قاتل کی تیغِ برّاں میں
اور تری مصلحت کے نیزوں میں
فرق کیا ہے ؟
تو سوچتا ہوں
کہ ہم سبھی کیا جواب دیں گے ؟

جاناں جاناں

احمد فراز

ماورا پبلشرز
۳ بہاولپور روڈ
لاہور

جاناں جاناں

احمد فراز

فہرست

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں

یہ میری غزلیں یہ میری نظمیں
تمام تیری حکایتیں ہیں
یہ تذکرے تیرے لطف کے ہیں
یہ شعر تیری شکایتیں ہیں
میں سب تری نذر کر رہا ہوں
یہ ان زمانوں کی ساعتیں ہیں

۱۰

جو زندگی کے نئے سفر میں
تجھے کسی وقت یاد آئیں

تو ایک اِک حرف جی اُٹھے گا
پہن کے انفاس کی قبائیں
اُداس تنہائیوں کے لمحوں
میں ناچ اُٹھیں گی یہ اپسرائیں

مجھے ترے درد کے علاوہ بھی
اور دُکھ تھے یہ مانتا ہُوں
ہزار غم تھے جو زندگی کی
تلاش میں تھے یہ جانتا ہُوں
مجھے خبر تھی کہ تیرے آنچل میں
درد کی ریت، چھانتا ہُوں

۱۱

مگر ہر اک بار تجھ کو چھُو کر
یہ ریت رنگِ حنا بنی ہے
یہ زخم گلزار بن گئے ہیں
یہ آہِ سوزاں گھٹا بنی ہے
یہ درد موجِ صبا ہُوا ہے
یہ آگ دل کی صدا بنی ہے

اور اب یہ ساری متاعِ ہستی
یہ پھول یہ زخم سب ترے ہیں
یہ دُکھ کے نوحے یہ سکھ کے نغمے
جو کل مرے تھے وہ اب ترے ہیں
جو تیری قربت تری جدائی
میں کٹ گئے روز و شب ترے ہیں

۱۲

وہ تیرا شاعر ترا مغنّی!
وہ جس کی باتیں عجیب سی تھیں
وہ جس کے انداز خسروانہ تھے
اور ادائیں غریب سی تھیں
وہ جس کے جینے کی خواہشیں بھی
خود اس کے اپنے نصیب سی تھیں

نہ پوچھ اس کا کہ وہ دِوانہ
بہت دنوں کا اُجڑ چکا ہے
وہ کوہکن تو نہیں تھا لیکن
کڑی چٹانوں سے لڑ چکا ہے
وہ تھک چکا تھا اور اس کا تیشہ
اسی کے سینے میں گڑ چکا ہے

۱۳

○

اب کے تجدیدِ وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں ترا پیماں جاناں

یونہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بدل جاتے ہیں انساں جاناں

زندگی تیری عطا تھی سو ترے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی ترا احساں جاناں

دل یہ کہتا ہے کہ شاید ہو فسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

۱۴

— ق —

اوّل اوّل کی محبّت کے نشے یاد تو کر
بے پیے بھی ترا چہرہ تھا گلستاں جاناں

آخر آخر تو یہ عالم ہے کہ اب ہوش نہیں
رگِ مینا سلگ اُٹھی کہ رگِ جاں جاناں

مدّتوں سے یہی عالم نہ توقع نہ اُمید
دل پکارے ہی چلا جاتا ہے جاناں جاناں

ہم بھی کیا سادہ تھے ہم نے بھی سمجھ رکھا تھا
غمِ دوراں سے جدا ہے غمِ جاناں جاناں

اب کے کچھ ایسی سجی محفلِ یاراں جاناں
سر بہ زانو ہے کوئی سر بگریباں جاناں

ہر کوئی اپنی ہی آواز سے کانپ اُٹھتا ہے
ہر کوئی اپنے ہی سائے سے ہراساں جاناں

۱۵

جس کو دیکھو وہی زنجیر بپا لگتا ہے
شہر کا شہر ہُوا داخلِ زنداں جاناں

اب ترا ذکر بھی شاید ہی غزل میں آئے
اور سے اور ہُوئے درد کے عنواں جاناں

ہم کہ رُوٹھی ہُوئی رُت کو بھی منا لیتے تھے
ہم نے دیکھا ہی نہ تھا موسمِ ہجراں جاناں

ہوش آیا تو سبھی خواب تھے ریزہ ریزہ
جیسے اُڑتے ہُوئے اوراقِ پریشاں جاناں

اے خدا جو کبھی مجھے پندِ شکیبائی دے
اس کی آنکھوں کو مرے زخم کی گہرائی دے

تیرے لوگوں سے گلہ ہے مرے آئینوں کو
ان کو پتھرّ نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

جس کے ایما پہ کیا ترکِ تعلّق سب سے
اب وہی شخص مجھے طعنۂ تنہائی دے

۱۷

یہ دہن زخم کی صورت ہے مرے چہرے پر
یا مرے زخم کو بھر یا مجھے گویائی دے

اتنا بے صرفہ نہ جائے مرے گھر کا جلنا
چشمِ گریاں نہ سہی چشمِ تماشائی دے

جن کو پیراہنِ توقیر و شرف بخشا ہے
وہ برہنہ ہیں انھیں خلعتِ رسوائی دے

کیا خبر تجھ کو کہ کس وضع کا بسمل ہے فرازؔ
وہ تو قاتل کو بھی الزامِ مسیحائی دے

۱۸

○

اب کے رُت بدلی تو خوشبو کا سفر دیکھے گا کون
زخم پھولوں کی طرح مہکیں گے پر دیکھے گا کون

دیکھنا سب رقصِ بسمل میں مگن ہو جائیں گے
جس طرف سے تیر آئے گا ادھر دیکھے گا کون

زخم جتنے بھی تھے سب منسوب قاتل سے ہُوئے
تیرے ہاتھوں کے نشاں اے چارہ گر دیکھے گا کون

وہ ہوس ہو یا وفا ہو بات محرومی کی ہے
لوگ تو پھل پھول دیکھیں گے شجر دیکھے گا کون

۱۹

میری آوازوں کے سائے میرے بام و در پہ ہیں
میرے لفظوں میں اُتر کر میرا گھر دیکھے گا کون

ہم چراغِ شب ہی جب ٹھہرے تو پھر کیا سوچنا
رات تھی کس کا مقدّر اور سحر دیکھے گا کون

آ فصیلِ شہر سے دیکھیں غنیمِ شہر کو
شہر جلتا ہو تو تجھ کو بام پر دیکھے گا کون

ہر کوئی اپنی ہوا میں مست پھرتا ہے فراز
شہرِ ناپرساں میں تیری چشمِ تر دیکھے گا کون

خواب مرتے نہیں

خواب مرتے نہیں
خواب دل ہیں نہ آنکھیں نہ سانسیں کہ جو
ریزہ ریزہ ہوُئے تو بکھر جائیں گے
جسم کی موت سے یہ بھی مر جائیں گے

خواب مرتے نہیں
خواب تو روشنی ہیں نوا ہیں ہوا ہیں
جو کالے پہاڑوں سے رُکتے نہیں
ظلم کے دوزخوں سے بھی پُھکتے نہیں

۲۱

روشنی اور نوا اور ہوا کے علم
مقتلوں میں پہنچ کر بھی جھکتے نہیں
خواب تو حرف ہیں
خواب تو نور ہیں
خواب سقراط ہیں
خواب منصور ہیں

۲۲

○

ہر خواب عذاب ہو چکا ہے
اور تو بھی تو خواب ہو چکا ہے

اب تختۂ ریگ ہے یہ چہرہ
دریا تھا سراب ہو چکا ہے

اب تو ترکِ وفا کا وقت آیا
تو میرا جواب ہو چکا ہے

اب اور کوئی علاج غم کا
اب زہر شراب ہو چکا ہے

اُس رُت میں بھی بے نمو ہوں جس میں
کانٹا بھی گلاب ہو چکا ہے

۲۳

○

یوں تو پہلے بھی ہوئے اُس سے کئی بار جُدا
لیکن اب کے نظر آتے ہیں کچھ آثار جُدا

گر غمِ سود و زیاں ہے تو ٹھہر جا اے جاں
کہ اسی موڑ پہ یاروں سے ہوئے یار جُدا

دو گھڑی اُس سے رہو دور تو یوں لگتا ہے
جس طرح سایۂ دیوار سے دیوار جُدا

یہ جدائی کی گھڑی ہے کہ جھڑی ساون کی
میں جدا گریہ کناں، ابر جدا یار جُدا

کج کلاہوں سے کہے کون کہ اے بے خبرو!
طوقِ گردن سے نہیں طرّۂ دستار جُدا

کوئے جاناں میں بھی خاصا تھا طرحدار فراز
لیکن اس شخص کی سج دھج بھی سرِ دار جُدا

○

جو رنجشیں تھیں جو دل میں غبار تھا نہ گیا
کہ اب کی بار گلے مل کے بھی گلہ نہ گیا

اب اُس کے وعدۂ فردا کو بھی ترستے ہیں
کل اس کی بات پہ کیوں اعتبار آ نہ گیا

اب اس کے ہجر میں روئیں نہ وصل میں خوش ہیں
وہ دوست ہو بھی تو سمجھو کہ دوستانہ گیا

نگاہِ یار کا کیا ہے ہوئی ہوئی نہ ہوئی
یہ دل کا درد ہے پیارے گیا گیا نہ گیا

سبھی کو جان تھی پیاری سبھی تھے لب بستہ
بس اک فرازؔ تھا ظالم سے چُپ رہا نہ گیا

○

جو بھی درونِ دل ہے وہ باہر نہ آئے گا
اب آگہی کا زہر زباں پر نہ آئے گا

اب کے بچھڑ کے اس کو ندامت تھی اس قدر
جی چاہتا بھی ہو تو پلٹ کر نہ آئے گا

یوں پھر رہا ہے کانچ کا پیکر لیے ہوئے
غافل کو یہ گماں ہے کہ پتھّر نہ آئے گا

پھر بو رہا ہوں آج انھیں ساحلوں پہ پھول
پھر جیسے موج میں یہ سمندر نہ آئے گا

میں جاں بلب ہوں ترکِ تعلّق کے زہر سے
وہ مطمئن کہ حرف تو اس پر نہ آئے گا

مت سوچو

اور اس نے
مرے ساغر میں
مئے سرخ انڈیلی — تو کہا
مت سوچو!
تم یہاں آئے ہو
اس ملک کے
اس شہر کے
اس حجلۂ تسکیں میں جہاں
سب کے سب رقص کناں

۲۷

نغمہ بلبل

مست ادا — مت سوچو
جاگتی رات
کے چہرے پہ ہے خوشبو کی ردا
مت سوچو!

تم بھی کیا لوگ ہو
پردیس بھی آتے ہو
تو لے آتے ہو
بیمار شب و روز و دل افگار
عزیزانِ وطن کی یادیں
اپنی ژولیدہ و بوسیدہ قمیصوں کی طرح
جن کے دھبّوں کو تو
خود کار مشینیں بھی نہیں دھو سکتیں
یہ جو زنگار ہیں غربت کے

۲۸

خود آزاد جو تاریکیاں ذہنوں کی ہیں
آلائشیں جسموں کی ہیں
اس طرح سنبھالے ہُوئے پھرتے ہو
کہ جیسے یہ تمھارے دل و جاں ہوں
اس گھڑی تم ہو جہاں
مملکت خواب نہیں
یاں کسی سوچ کا گرداب نہیں
زندگی مے کی طرح
شوخ ہے طرّار ہے
زہراب نہیں
اپنے کشکول کو دہلیز پہ رکھ آؤ
کہ دریوزہ گری
اس جگہ نشاں آداب نہیں

مت سوچو!

پیرس ۱۹۷۶ء

○

سُنا تو ہے کہ نگارِ بہار راہ میں ہے
سفر بخیر کہ دشمن ہزار راہ میں ہے

گزر بھی جا غمِ جان و غمِ جہاں سے کہ یہ
وہ منزلیں ہیں کہ جن کا شمار راہ میں ہے

تمیز رہبر و رہزن ابھی نہیں ممکن
ذرا ٹھہر کہ بلا کا غبار راہ میں ہے

گروہ کجکلہاں کو کوئی خبر تو کرے
ابھی ہجومِ سرِ رہگزار راہ میں ہے

نہ جانے کب کا پہنچ بھی چکا سرِ منزل
وہ شخص جس کا ہمیں انتظار راہ میں ہے

فرازؔ اگرچہ کڑی ہے زمین آتش کی
"ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے"

○

سب لوگ لیے سنگِ ملامت نکل آئے
کس شہر میں ہم اہلِ محبّت نکل آئے

اب دل کی تمنّا ہے تو اے کاش یہی ہو
آنسو کی جگہ آنکھ سے حسرت نکل آئے

ہر گھر کا دِیا گل نہ کرو تم کہ نہ جانے
کس بام سے خورشیدِ قیامت نکل آئے

جو درپئے پندار ہیں اُن قتل گہوں سے
جاں دے کے بھی سمجھو کہ سلامت نکل آئے

اے ہم نفسو کچھ تو کہو عہدِ ستم کی
اِک حرف سے ممکن ہے حکایت نکل آئے

یارو مجھے مصلوب کرو تم کہ مرے بعد
شاید کہ تمہارا قد و قامت نکل آئے

اب کس کا جشن مناتے ہو!

اب کس کا جشن مناتے ہو
اُس دیس کا جو تقسیم ہُوا
اب کس کا گیت سُناتے ہو
اُس تن من کا جو دونیم ہُوا

اُس خواب کا جو ریزہ ریزہ
ان آنکھوں کی تقدیر ہُوا
اُس نام کا جو ٹکڑے ٹکڑے
گلیوں میں بے توقیر ہُوا

۳۲

اُس پرچم کا جس کی حرمت
بازاروں میں نیلام ہُوئی
اُس مٹّی کا جس کی حرمت
منسوب عدو کے نام ہُوئی

اُس جنگ کا جو تم ہار چکے
اُس رسم کا جو جاری بھی نہیں
اُس زخم کا جو سینے پہ نہ تھا
اُس جان کا جو واری بھی نہیں

اُس خون کا جو بدقسمت تھا
راہوں میں بہایا تن میں رہا
اُس پھول کا جو بے قیمت تھا
آنگن میں کھِلا یا بن میں رہا

اُس مشرق کا جس کو تم نے
نیزے کی انی مرہم سمجھا
اُس مغرب کا جس کو تم نے
جتنا بھی لُوٹا کم سمجھا!

اُن معصوموں کا جن کے لہو
سے تم نے فروزاں راتیں کیں
یا اُن مظلوموں کا جن سے
خنجر کی زباں میں باتیں کیں

اُس مریم کا جس کی عفّت
لٹتی ہے بھرے بازاروں میں
اُس عیسا کا جو قاتل ہے
اور شامل ہے غمخواروں میں

۳۴

اِن نوحہ گروں کا جن نے ہمیں
خود قتل کیا خود روتے ہیں
ایسے بھی کہیں دم ساز ہوئے
ایسے جلّاد بھی ہوتے ہیں

اُن بھوکے ننگے ڈھانچوں کا
جو رقص سرِ بازار کریں
یا اُن ظالم قزّاقوں کا
جو بھیس بدل کر وار کریں

یا اُن جھوٹے اقراروں کا
جو آج تلک ایفا نہ ہوئے
یا اُن بے بس لاچاروں کا
جو اور بھی دکھ کا نشانہ ہوئے

۳۵

اِس شاہی کا جو دست بدست
آئی ہے تمھارے حصّے میں
کیوں ننگِ وطن کی بات کرو
کیا رکھّا ہے اِس قصّے میں

آنکھوں میں چھپائے اشکوں کو
ہونٹوں پہ وفا کے بول لیے
اس جشن میں مَیں بھی شامل ہُوں
نوحوں سے بھرا کشکول لیے

۳۴

ابرِ بہار اب کے بھی برسا پرے پرے
گلشن اُجاڑ اُجاڑ ہیں جنگل ہرے ہرے

جانے یہ تشنگی ہے ہوس ہے کہ خودکشی
جلتے ہیں شام ہی سے جو ساغر بھرے بھرے

ہے دل کی موت عہدِ وفا کی شکستگی
پھر بھی جو کوئی ترکِ محبّت کرے کرے

اب اپنا دل بھی شہرِ خموشاں سے کم نہیں
سُن ہو گئے ہیں کان صدا پر دھرے دھرے

رہتے ہیں اہلِ شہر کے سائے سے دور دور
ہم آہوانِ دشت کی صورت ڈرے ڈرے

گُل بن کے پھوٹتا ہے لہو شاخسار سے
زخمِ رگِ بہار ہیں پتّے ہرے ہرے

زندہ دلانِ شہر کو کیا ہو گیا فرازؔ
آنکھیں بجھی بجھی ہیں تو چہرے مرے مرے

○

شگفتہ دل ہیں کہ غم بھی عطا بہار کی ہے
رِگُل حباب ہیں سر میں ہوا بہار کی ہے

ہجومِ جلوۂ گل پر نظر نہ رکھ کہ یہاں
جراحتوں کے چمن پر ردا بہار کی ہے

کوئی تو لالۂ خونیں کفن سے بھی پوچھے
یہ فصل چاک جگر کی ہے یا بہار کی ہے

میں تیرا نام نہ لوں پھر بھی لوگ پہچانیں
کہ آپ اپنا تعارف ہوا بہار کی ہے

شمارِ زخم ابھی سے فراز کیا کرنا
ابھی تو جان مری ابتدا بہار کی ہے

○

دل گرفتہ ہی سہی بزم سجا لی جائے
یادِ جاناں سے کوئی شام نہ خالی جائے

رفتہ رفتہ یہی زنداں میں بدل جاتے ہیں
اب کسی شہر کی بنیاد نہ ڈالی جائے

مصحفِ رُخ ہے کسی کا کہ بیاضِ حافظ
ایسے چہرے سے کبھی فال نکالی جائے

وہ مروّت سے ملا ہے تو جھکا دوں گردن
میرے دشمن کا کوئی وار نہ خالی جائے

بے نوا شہر کا سایہ ہے مرے دل پہ فراز
کس طرح سے مری آشفتہ خیالی جائے

○

سنم کا آشنا تھا وہ سبھی کے دل دکھا گیا
کہ شامِ غم تو کاٹ لی سحر ہوئی چلا گیا

ہوائے ظلم سوچتی ہے کس بھنور میں آ گئی
وہ اک دِیا بجھا تو سینکڑوں دِیے جلا گیا

سکوت میں بھی اس کے اک ادائے دل نواز تھی
وہ یارِ کم سخن کئی حکایتیں سُنا گیا

اب اک ہجومِ عاشقاں ہے ہر طرف رواں دواں
وہ ایک رہ نورد خود کو قافلہ بنا گیا

دلوں سے وہ گزر گیا شعاعِ مہر کی طرح
گھنے اُداس جنگلوں میں راستہ بنا گیا

کبھی کبھی تو یوں ہُوا ہے اس ریاضِ دہر میں
کہ ایک پھول گلستاں کی آبرو بچا گیا

شریکِ بزمِ دل بھی ہیں چراغ بھی ہیں پھول بھی
مگر جو جانِ انجمن تھا وہ کہاں چلا گیا

اُٹھو ستم زدو چلیں یہ دکھ کڑا سہی مگر
وہ خوش نصیب ہے یہ زخم جس کو راس آ گیا

یہ آنسوؤں کے ہار خوں بہا نہیں ہیں دوستو
کہ وہ تو جان دے کے قرضِ دوستاں چکا گیا

اے مرے یارِ قدح ریز!

چاند نکلا ہے مری آنکھ
مرے دل میں اُتارے ہے تجھے
آ مرے یارِ قدح ریز
مرا جام پکارے ہے تجھے

یونہی تنہائی میں بیٹھا تھا
سرِ شام بُھلائے ہُوئے ساری دنیا
یونہی اِک یاد سی جاگ اُٹھی
تو لگنے لگی پیاری دنیا

۴۳

میں تو جیسا بھی ہوں خوش وقت ہوں
کیسی ہے تمھاری دنیا
تم نے جس داؤں جیتا ہے
اسی بازی میں ہاری دنیا

آمرے یارِ قدح ریز!
مرا جام ہے خالی کب سے
مرا دل چُور ہے زخموں سے
میری آنکھ سوالی کب سے
پیشِ منظر ہیں اب آجاؤ
کہ ہیں اصنام خیالی کب سے
منتظر ہال میں بیٹھے ہُوئے لوگوں کی طرح
یوں بجاتے رہیں تالی کب سے
آمرے یارِ قدح ریز!
مرا نام ہے گالی کب سے

۴۴

○

کہا تھا کس نے کہ عہدِ وفا کرو اس سے
جو یوں کیا ہے تو پھر کیوں گلہ کرو اس سے

نصیب پھر کوئی تقریبِ قرب ہو کہ نہ ہو
جو دل میں ہوں وہی باتیں کہا کرو اس سے

یہ اہلِ بزم تنک حوصلہ سہی پھر بھی
ذرا فسانۂ دل ابتدا کرو اس سے

یہ کیا کہ تم ہی غمِ ہجر کے فسانے کہو
کبھی تو اس کے بہانے سنا کرو اُس سے

فرازؔ ترکِ تعلق تو خیر کیا ہوگا!
یہی بہت ہے کہ کم کم ملا کرو اُس سے

○

تجھ سے بچھڑ کے ہم بھی مقدّر کے ہو گئے
پھر جو بھی در ملا ہے اسی در کے ہو گئے

پھر یوں ہُوا کہ غیر کو دل سے لگا لیا
اندر وہ نفرتیں تھیں کہ باہر کے ہو گئے

کیا لوگ تھے کہ جان سے بڑھ کر عزیز تھے
اب دل سے محو نام بھی اکثر کے ہو گئے

۴۶

اے یادِ یار تجھ سے کریں کیا شکایتیں
اے دردِ ہجر ہم بھی تو پتھّر کے ہو گئے

سمجھا رہے تھے مجھ کو سبھی ناصحانِ شہر
پھر رفتہ رفتہ خود اسی کافر کے ہو گئے

اب کے نہ انتظار کریں چارہ گر کہ ہم
اب کے گئے تو کوئے ستم گر کے ہو گئے

روتے ہو اک جزیرۂ جاں کو فراز تم
دیکھو تو کتنے شہر سمندر کے ہو گئے

ہر تماشائی فقط ساحل سے منظر دیکھتا
کون دریا کو اُلٹتا، کون گوہر دیکھتا

وہ تو دنیا کو مری دیوانگی خوش آگئی
تیرے ہاتھوں میں وگرنہ پہلا پتھّر دیکھتا

آنکھ میں آنسو جڑے تھے پر صدا تجھ کو نہ دی
اس توقّع پر کہ شاید تو پلٹ کر دیکھتا

میری قسمت کی لکیریں میرے ہاتھوں میں نہ تھیں
تیرے ماتھے پر کوئی میرا مقدّر دیکھتا

زندگی پھیلی ہوئی تھی شامِ ہجراں کی طرح
کس کو اتنا حوصلہ تھا کون جی کر دیکھتا

ڈوبنے والا تھا اور ساحل پہ چہروں کا ہجوم
پل کی مہلت تھی میں کس کو آنکھ بھر کر دیکھتا

تُو بھی دل کو اک لہو کی بوند سمجھا ہے فرازؔ
آنکھ اگر ہوتی تو قطرے میں سمندر دیکھتا

سحر کے سورج

سحر کے سورج
میں رو رہا ہوں
کہ میرا مشرق لہو لہو ہے
وہ میرا مشرق
جو میرا بازو ہے
میرا دل ہے
مری نمو ہے
جو میرے اطراف کا نشاں

میری آبرُو ہے
لہُو لہُو ہے
سحر کے سورج
میں نصف تاریک
نصف روشن ہوں

کیا ہُوا ہے
تجھے گہن لگ گیا
کہ میرا وجود ٹکڑوں میں بٹ گیا ہے
تری شعاعوں کا نور اندھیروں میں
گھٹ گیا ہے
کہ آج ہر رشتۂ رفاقت ہی کٹ گیا ہے
سحر کے سورج
میں اپنے پیکر کی نصف تصویر ہو گیا ہوں
میں آپ ہی آج اپنی تحقیر ہو گیا ہوں

میں اسمِ تصغیر ہو گیا ہوں
میں اپنا آدھا بدن لیے کس طرف کو جاؤں
کسے دکھاؤں
یہ شیشۂ جاں کی کرچیاں
اپنے خواب ریزے کہاں چھپاؤں
میں اپنی وحدت کہاں سے لاؤں
سحر کے سورج
ستم کی آندھی رُکے
تو میں یہ اُجاڑ آنکھیں جھپک سکوں گا
لہو کی بارش تھمے
تو میں اس دُکھی بدن کو تھپک سکوں گا
ابھی تو میں جانکنی کے دُہرے عذاب میں ہوں
جو بجھ چکے وہ چراغ دیکھوں
کہ اپنے ماتھے کا داغ دیکھوں

سحر کے سُورج

مری نظر میں تو اُن رفیقوں کے قافلے ہیں
جو گھر سے نکلے تھے سر اُٹھائے
قدم جمائے
جو منتظر تھے
کہ رزم گاہِ طلب بلائے
جو آزمائش کی ہر گھڑی میں
یقین کی مشعلیں جلائے
وطن کی ناموس کے لیے
بے شمار بازو علم اُٹھائے
چلے تھے گھر سے
یہ عہد کر کے
کہ ان کی جانیں رہیں کہ جائیں
مگر وفا پہ نہ حرف آئے

سحر کے سُورج

مری نظر میں انھیں رفیقوں کے قافلے ہیں
کہ جن کا پندار ریزہ ریزہ
کہ جن کے ماتھے عرق عرق ہیں
جو پا بہ زنجیر
منفعل گردنیں جھکائے
عدو کے نرغے میں
ان اندھیروں کی سرزمیں کی طرف رواں ہیں
جہاں حقارت کے طعن
نفرت کے سنگ
رسوائیوں کے بازار
منتظر ہیں
وہاں جہاں سومنات کے پتھروں سے
کتنے ہی میرے محمود غزنوی سنگسار ہوں گے

وہاں

جہاں میری ساری تاریخ کے ورق شرمسار ہوں گے
سحر کے سورج
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تُو نہ دیکھے
یہ غازیوں کی نظر نہ دیکھے
یہ جانثاروں شہید یاروں کا
چھپتا لہو نہ دیکھے
یہ میں نہ دیکھوں
یہ تُو نہ دیکھے

۱۶ ردسمبر سنہ ۱۹۷۱ء

وہ تو سب درد کے لمحے تھے

وہ تو اِک خواب پریشاں تھا جو میں نے دیکھا
وہ تو سب درد کے لمحے تھے
جو مجھ پہ گزرے

میرے ویران مہ و سال
مرے شام و سحر
میری مجروح محبت۔ مری درماں طلبی
سرِ دہلیزِ رقیباں
مری دریوزہ گری

آنکھ میں اشکِ ندامت کے
تو چہرے پہ فشارِ دل و جاں
میرا ماضی بھی اندھیرا
مرا فردا بھی دھواں
میں کہاں ڈھونڈتا
کھوئی ہوئی ہستی کے نشاں
تُو یہاں تھا نہ وہاں
میں یہاں تھا نہ وہاں
وہ تو سب درد کے لمحے تھے
جو مجھ پہ گزرے
پھر یہ کیوں ہے
کہ میرا جسم مرا خوں
نہ ہُوا خاکستر
کون اس درد کے دوزخ میں

مہ و سال تلک جل کے بھی
استادہ رہا
زندہ رہنے پر مصر
اور نئی زیست کا دلدادہ رہا
نئی سج دھج سے بسر کرنے پہ آمادہ رہا
بس اسی درد کے دوزخ کا رہا ہوں ایندھن
اب جو ابھرا ہوں تو اس آگ سے کندن ہو کر
میں نے اس حسن کو پایا ہے بہت کچھ کھو کر
اپنے بکھرے ہوئے پندار
کا ریزہ ریزہ
چُن رہا ہوں شب صحرا سے ستاروں کی طرح
اپنے ملبوس دریدہ کے پریشاں ٹکڑے
جنبش سوزن اُمید کی خیاطی سے
سی رہا ہوں کہ مرا اسم برہنہ نہ رہے

۵۸

میرے دیرینہ حریفوں کے لبوں پر کوئی طعنہ نہ رہے

مجھ پہ قرضِ جان و غمِ دنیا نہ رہے

وہ تو سب درد کے لمحے تھے

جو مجھ پر گزرے

اور اب میں نئے موسم میں

کسی شعلۂ بے باک کسی پرچمِ پرّاں کی طرح

کرۂ خاک میں لہرانے لگا ہوں پھر سے

اے مرے لمحۂ آئندہ مرے شوق کے فردا

تری منزل کی طرف آنے لگا ہوں پھر سے

اپنے خاشاک کو

انگار سے چمکانے لگا ہوں پھر سے

۵۹

○

سوئے فلک نہ جانبِ مہتاب دیکھنا
اس شہرِ دلنواز کے آداب دیکھنا

تجھ کو کہاں چھپائیں کہ دل پر گرفت ہو
آنکھوں کو کیا کریں کہ وہی خواب دیکھنا

وہ موجِ خوں اُٹھی ہے کہ دیوار و در کہاں
اب کے فصیلِ شہر کو غرقاب دیکھنا

ان صورتوں کو ترسے گی چشمِ جہاں کہ آج
کمیاب ہیں تو کل ہمیں نایاب دیکھنا

۶۰

پھر خونِ خلق و گردنِ مینا بچائیو
پھر چل پڑا ہے ذکرِ مئے ناب دیکھنا

آباد کوئے چاکِ گریباں ہو پھر ہُوا
دستِ رقیب و دامنِ احباب دیکھنا

ہم لے تو آئے ہیں تجھے اک بیدلی کے ساتھ
اس انجمن میں اے دلِ بیتاب دیکھنا

حد چاہیے فراز وفا میں بھی اور تمہیں
غم دیکھنے نہ دل کی تب و تاب دیکھنا

۶۱

ستم گری کا ہر انداز محرمانہ لگا
میں کیا کہ وں مرا دشمن مجھے بُرا نہ لگا

ہر اک کو زعم تھا کس کس کو ناخدا کہتے
بھلا ہُوا کہ سفینہ کنارے جا نہ لگا

مرے سخن کا قرینہ ڈبو گیا مجھ کو
کہ جس کو حال سُنایا اسے فسانہ لگا

برونِ در نہ کوئی روشنی نہ سایہ تھا
سبھی فسانہ مجھے اندرونِ خانہ لگا

میں تھک گیا تھا بہت پے بہ پے اُڑانوں سے
جبھی تو دام بھی اس بار آشیانہ لگا

اس عہدِ ظلم میں مَیں بھی شریک ہوں جیسے
مرا سکوت مجھے سخت مجرمانہ لگا

وہ لاکھ زود فراموش ہو فرازؔ مگر
اسے بھی مجھ کو بھُلانے میں اک زمانہ لگا

جو سزا ہم کو ملے ......

اور ہمیں درد کی منزل پہ پہنچنے والے
کہہ رہے ہیں کہ اسے اور بھی آسان کرو
تاکہ ہم اپنے پرائے کو بھی پہچان سکیں
اور کچھ دوست اسی راہ میں قربان کرو

شام آئی ہے ہمیشہ یہی لالی لے کر
جو کبھی خونِ تمنّا کبھی گلزار لگے
اتنی آشفتہ نہ تھی خواہشِ یاراں پہلے
اب تو ہر جذبۂ آسودہ بھی تلوار لگے

۶۴

تو کہ تنہا ہے مری طرح تو مجبور نہ بن
کارواں اتریں گے اس کوہِ ندا سے کتنے
شمعیں بجھ جائیں گی اور خورشید ابھر آئیں گے
اور اسی ساحلِ امید سے پیاسے کتنے

یوں پکاریں گے کہ یہ بوند سمندر کر دے
آج مصلوب جو ہو اس کو پیمبر کر دے
یہ جو ہونا ہے تو ہم یونہی گنہگار رہیں
جو سزا ہم کو ملے اس کے سزاوار رہیں

آزردگانِ شہر کا جیسا بھی حال ہو
اے یارِ خوش دیار تجھے کیوں ملال ہو

اب بات دوستی کی نہیں حوصلے کی ہے
لازم نہیں کہ تو بھی میرا ہم خیال ہو

اب کے وہ درد دے کہ رہیں رُوٹھ عمر تمام
اب کے لگا وہ زخم کہ جینا محال ہو

پہلے وہ اضطراب تجھے کس طرح بھلائیں
اب یہ عذاب کیسے طبیعت بحال ہو

خود میرا ہاتھ جب مری بربادیوں میں تھا
تیری جبیں پہ کیوں عرقِ انفعال ہو

پھر تُونے چھیڑ دی ہے گئی ساعتوں کی بات
وہ گفتگو نہ کر کہ تجھے بھی ملال ہو

میری ضرورتوں سے زیادہ کرم نہ کر
ایسا سلوک کر کہ مرے حسبِ حال ہو

ٹوٹا تو ہُوں مگر ابھی بکھرا نہیں فرازؔ
میرے بدن پہ جیسے شکستوں کا جال ہو

○

تری یادوں کا وہ عالم نہیں ہے
مگر دل کی اُداسی کم نہیں ہے

ہمیں بھی یاد ہے مرگِ تمنّا
مگر اب فرصتِ ماتم نہیں ہے

ہوائے قربِ منزل کا بُرا ہو
فراقِ ہمسفر کا غم نہیں ہے

جنونِ پارسائی بھی تو ناصح
مری دیوانگی سے کم نہیں ہے

یہ کیا گلشن ہے جس گلشن میں لوگو
بہاروں کا کوئی موسم نہیں ہے

قیامت ہے کہ ہر مے خوار پیاسا
مگر کوئی حریفِ جم نہیں ہے

صلیبوں پر کھنچے جاتے ہیں لیکن
کسی کے ہاتھ میں پرچم نہیں ہے

فرازؔ اس قحط زارِ روشنی میں
چراغوں کا دھواں بھی کم نہیں ہے

برسوں کے بعد دیکھا اک "شخص دلربا سا"
اب ذہن میں نہیں ہے پر نام تھا بھلا سا

ابرو کھچے کھچے سے آنکھیں جھکی جھکی سی
باتیں رکی رکی سی لہجہ تھکا تھکا سا

الفاظ تھے کہ جگنو آواز کے سفر میں
بن جائے جنگلوں میں جس طرح راستہ سا

۷۰

خوابوں میں خواب اس کے یادوں میں یاد اُس کی
نیندوں میں گھُل گیا ہو جیسے کہ رتجگا سا

پہلے بھی لوگ آئے کتنے ہی زندگی میں
وہ ہر طرح سے لیکن اوروں سے تھا جدا سا

اگلی محبّتوں نے وہ نامرادیاں دیں!
تازہ رفاقتوں سے دل تھا ڈرا ڈرا سا

کچھ یہ کہ مُدّتوں سے ہم بھی نہیں تھے روئے
کچھ زہر میں بُجھا تھا احباب کا دلاسا

پھر یُوں ہُوا کہ ساون آنکھوں میں آ بسے تھے
پھر یُوں ہُوا کہ جیسے دل بھی تھا آبلہ سا

اب سچ کہیں تو یارو ہم کو خبر نہیں تھی
بن جائے گا قیامت اک واقعہ ذرا سا

۱۷

تیور تھے بے رُخی کے انداز دوستی کے
وہ اجنبی تھا لیکن لگتا آشنا سا

ہم دشت تھے کہ دریا، ہم زہر تھے کہ امرت
ناحق تھا زعم ہم کو جب وہ نہیں تھا پیاسا

ہم نے بھی اس کو دیکھا کل شام اتفاقاً
اپنا بھی حال ہے اب لوگو فراز کا سا

○

جسم شعلہ ہے جبھی جامۂ سادہ پہنا
میرے سورج نے بھی بادل کا لبادہ پہنا

سلوٹیں ہیں مرے چہرے پہ تو حیرت کیوں ہے
زندگی نے مجھے کچھ تم سے زیادہ پہنا

خواہشیں یوں ہی برہنہ ہوں تو جل بجھتی ہیں
اپنی چاہت کو کبھی کوئی ارادہ پہنا

یار خوش ہیں کہ انھیں جامۂ احرام ملا
لوگ ہنستے ہیں کہ قامت سے زیادہ پہنا

یارِ پیماں شکن آئے اگر اب کے تو اسے
کوئی زنجیرِ وفا اے شبِ وعدہ پہنا

غیرتِ عشق تو مانع تھی مگر میں نے فراز
دوست کا طوقِ سرِ محفلِ اعدا پہنا

سچ بھی جھوٹا ہے

سچ بھی جھوٹا ہے
کہ اس کے بھی کئی چہرے ہیں
ایک چہرہ کہ ترے قرب کی ساعت میں مجھے
نہ کوئی خواہشِ آغوش رسی
اور نہ تمنّائے وصال
ایک چہرہ کہ
ترے جسم کی حرمت کی قسم کھا کے
ہر اک دیدۂ مشکوک کو سمجھاتا رہا

آسمانوں کے صحیفوں سے اُتارے ہُوئے
الفاظ کو دُہراتا رہا

ایک چہرہ
کہ ترے پاس سے اُٹھا ہوں
تو خود سوچتا ہوں
کہ مرا سرد لہُو
گرمیٔ شوق سے اور آتشِ محرومی سے
کیوں چھلکتا ہے

اور بدن
نشے کے عالم میں بھی کیوں دُکھتا ہے

میں نے آغاز سے انجامِ سفر جانا ہے
سب کو دو چار قدم چل کے ٹھہر جانا ہے

غم وہ صحرائے تمنّا کہ بگولے کی طرح
جس کو منزل نہ ملی اس کو بکھر جانا ہے

تیری نظروں میں مرے درد کی قیمت کیا تھی
میرے دامن نے تو آنسو کو گہر جانا ہے

اب کے بچھڑے تو نہ پہچان سکیں گے چہرے
میری چاہت ترے پندار کو مر جانا ہے

۷۶

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم پکارو بھی تو کب اُس کو ٹھہر جانا ہے

تیز سورج میں چلے آتے ہیں میری جانب
دوستوں نے مجھے صحرا کا شجر جانا ہے

زندگی کو بھی ترے در سے بھکاری کی طرح
ایک پل کے لیے رُکنا ہے گزر جانا ہے

اپنی افسردہ مزاجی کا بُرا ہو کہ فراز
واقعہ کوئی بھی ہو آنکھ کو بھر جانا ہے

○

میں کہ پھر دشتِ رفاقت کا سفر کر آیا
کیا کہوں کتنی اذیت سے گزر کر آیا

ہر کوئی ہم سے ملا عمرِ گریزاں کی طرح
وہ تو جس دل سے بھی گزرا وہیں گھر کر آیا

تم نے اِک سنگ اُٹھایا مرے آئینے پر
اور ہر شخص کو میں آئینہ گر کر آیا

۷۸

مجھ سے کیا پوچھتے ہو شہرِ وفا کیسا ہے
ایسے لگتا ہے صلیبوں سے اُتر کر آیا

صرف چہرے ہی اگر کرب کے آئینے ہیں
کیوں نہیں دل کا لہو آنکھ میں بھر کر آیا

اب جو اس شہر کی تقدیر ہوئیں تو لوگو
در و دیوار پہ حسرت کی نظر کر آیا

ہم تو سمجھے تھے محبّت کا پیمبر ہے فرازؔ
اور وہ بے مہر بھی توہین ہنر کر آیا

○

ہاتھ اُٹھائے ہیں مگر لب پہ دعا کوئی نہیں
کی عبادت بھی تو وہ جس کی جزا کوئی نہیں

یہ بھی وقت آنا تھا، اب تو گوش بر آواز ہے
اور میرے بربطِ دل میں صدا کوئی نہیں

آکہ اب تسلیم کر لیں، تو نہیں تو میں سہی
کون مانے گا کہ ہم میں بے وفا کوئی نہیں

وقت نے وہ خاک اُڑائی ہے کہ دل کے دشت سے
قافلے گزرے ہیں پھر بھی نقشِ پا کوئی نہیں

خود کو یُوں محصور کر بیٹھا ہوں اپنی ذات میں
منزلیں چاروں طرف ہیں راستہ کوئی نہیں

کیسے رستوں سے چلے اور کس جگہ پہنچے فراز
یا ہجومِ دوستاں تھا ساتھ یا کوئی نہیں

تو بہتر ہے یہی

یہ تری آنکھوں کی بیزاری یہ لہجے کی تھکن
کتنے اندیشوں کی حامل ہیں یہ دل کی دھڑکنیں
پیشتر اس کے کہ ہم پھر سے مخالف سمت کو
بے خدا حافظ کہے چل دیں جھکا کر گردنیں

آؤ اس دکھ کو پکاریں جس کی شدت نے ہمیں
اس قدر اک دوسرے کے غم سے وابستہ کیا
وہ جو تنہائی کا دکھ تھا تلخ محرومی کا دکھ
جس نے ہم کو درد کے رشتے میں پیوستہ کیا

وہ جو اُس غم سے زیادہ جاں گسل قاتل رہا
وہ جو اک سیلِ بلا انگیز تھا اپنے لیے
جس کے پل پل میں تھے صدیوں کے سمندر موجزن
چیختی یادیں لیے اُجڑے ہُوئے سپنے لیے

میں بھی ناکامِ وفا تھا تو بھی محرُومِ مراد
ہم یہ سمجھے تھے کہ دردِ مشترک راس آگیا
تیری کھوئی مسکراہٹ قہقہوں میں ڈھل گئی
میرا گم گشتہ سکوں پھر سے مرے پاس آگیا

تپتی دوپہروں میں آسودہ ہُوئے بازو مرے
تیری زلفیں اس طرح بکھریں گھٹائیں ہوگئیں
تیرا برفیلا بدن بے ساختہ لَو دے اُٹھا
میری سانسیں شام کی بھیگی ہوائیں ہوگئیں

۸۲

زندگی کی ساعتیں روشن ہیں شمعوں کی طرح
جس طرح سے شام گزرے جگنوؤں کے شہر میں
جس طرح مہتاب کی وادی میں دو سائے رواں
جس طرح گھنگھرو چھنک اٹھیں نشے کی لہر میں

آؤ یہ سوچیں بھی قاتل ہیں تو بہتر ہے یہی
پھر سے ہم اپنے پرانے زہر کو امرت کہیں
تو اگر چاہے تو ہم اک دوسرے کو چھوڑ کر
اپنے اپنے بے وفاؤں کے لیے روتے رہیں

○

یہ جو نشے ہیں سفر کے نہ اُتر جائیں کہیں
کوئی منزل نہ سہی سامنے پر جائیں کہیں

اس کی محفل نہ سہی ہجر کا صحرا ہی سہی
خواب و خوشبو کی طرح آؤ بکھر جائیں کہیں

تجھ کو یہ دُکھ کہ مری چارہ گری کیسے ہو
مجھ کو یہ غم ہے مرے زخم نہ بھر جائیں کہیں

اس جنوں میں تو زمیں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
کوئی قلزم ہو کہ دلدل ہو اُتر جائیں کہیں

گھر سے نکلے تھے کہ دنیا نے پکارا تھا فرازؔ
اب جو فرصت ملے دنیا سے تو گھر جائیں کہیں

○

آنسو نہ روک دامنِ زخمِ جگر نہ کھول
جیسا بھی حال ہو نگہِ یار پر نہ کھول

جب شہر لُٹ گیا ہے تو کیا گھر کو دیکھنا
کل آنکھ نم نہیں تھی تو اب چشمِ تر نہ کھول

چاروں طرف ہیں دامِ شنیدن بچھے ہوئے
غفلت میں طائرانِ معانی کے پر نہ کھول

کچھ تو کڑی کٹھور مسافت کا دھیان کر
کوسوں سفر پڑا ہے ابھی سے کمر نہ کھول

عیسیٰ نہ بن کہ اس کا مقدّر صلیب ہے
انجیلِ آگہی کے ورق عمر بھر نہ کھول

امکاں میں ہے تو بند و سلاسل پہن کے چل
یہ حوصلہ نہیں ہے تو زنداں کے در نہ کھول

میری یہی بساط کہ فریاد ہی کروں
تو چاہتا نہیں ہے تو بابِ اثر نہ کھول

تو آئینہ فروش و خریدار کور چشم
اس شہر میں فراز دکانِ ہنر نہ کھول

○

عجب جنونِ مسافت میں گھر سے نکلا تھا
خبر نہیں ہے کہ سورج کدھر سے نکلا تھا

یہ کون پھر سے انھیں رستوں میں چھوڑ گیا
ابھی ابھی تو عذابِ سفر سے نکلا تھا

یہ تیر دل میں مگر بے سبب نہیں اُترا
کوئی تو حرف لبِ چارہ گر سے نکلا تھا

یہ اب جو آگ بنا شہر شہر پھیلا ہے
یہی دُھواں مرے در و دیوار سے نکلا تھا

میں رات ٹوٹ کے رویا تو چین سے سویا
کہ دل کا زہر مری چشمِ تر سے نکلا تھا

یہ اب جو سر ہیں خمیدہ کلاہ کی خاطر
یہ عیب بھی تو ہم اہلِ ہنر سے نکلا تھا

وہ قیس اب جسے مجنوں پکارتے ہیں فراز
تری طرح کوئی دیوانہ گھر سے نکلا تھا

ترچ میر

ترچ میر!
میں تیرے قدموں میں
اِک بے وقر سنگ ریزے کی صورت
تری جاں رُبا رفعتوں کی طرف دیکھتا ہوں
تری چوٹیاں
برف کے تاج پہنے
ازل سے اسی تمکنت سے ستادہ ہیں
سورج کی لالی میں ڈوبے ہُوئے ابر

ان کا لبادہ ہیں
اور آسمانی ہواؤں کی مانند
مشرق سے مغرب تلک
ان کے دامن کشادہ ہیں
اے آسمانی ہواؤں کے مسکن
تری آنکھ نے
روز و شب کے سپید و سیہ
اَن گنت قافلوں کا تماشا کیا ہے
تری بے صدا گھاٹیوں سے
کئی فاتحوں کے جری لشکروں نے گزرتے ہوئے
صاف و شفّاف چشموں کا پانی پیا ہے
کُنر
وقت کی آبجُو کی طرح
تیرے پہلو میں بہتا ہے

اور ان کی تاریخ کہتا ہے
جو اب عدم کا سفر کر چکے ہیں
جو تیرے مکینوں کی مانند
زندہ ہیں
پر مر چکے ہیں
میں اُن کی صدا سُن رہا ہوں
تو کیا
اپنے مردوں کی پرچھائیاں
صرف غیظ و غضب جانتی ہیں
تو کیا قہر ہی
ان کی برحق عدالت کا دستور ہے
صرف ادبار کی بجلیاں
ان کا سارا اثاثہ ہیں
اور اپنی درگاہ کے سائلوں میں

ہمیشہ عذابوں کی خیرات ہی بانٹتے ہیں
قیامت ہے
اسے اپنے آبا کی روحوں کے مسکن
کہ وادی کے ہر کھیت پر بانجھ پن کی نحوست ہے
اور مرد و زن، ڈھور ڈنگر
سبھی بھوک سے ادھ مُوئے ہو رہے ہیں
ہمارے سیہ بخت بچّے فلاکت کے غاروں میں دبکے ہُوئے
تیرے سُورج کی ضو کو ترستے ہیں
پالے کی شدّت سے ہر اک چراگاہ
صحرا کی مانند سوکھی پڑی ہے
اندھیرے گھنے جنگلوں کے درندوں
کی خونخوار آنکھیں ہمیں حرص سے
دیکھتی ہیں
ترے موسموں اور گھٹاؤں کی بخشش

قحط قحط ہے
قہر ہے
غیض ہے
اے نزج میر
تو کتنا بے فیض ہے!

○

طعنہ زن تھا ہر کوئی ہم پر دلِ ناداں سمیت
ہم نے چھوڑا شہرِ رسوائی درِ جاناں سمیت

اس قدر افسردہ خاطر کون محفل سے گیا
ہر کسی کی آنکھ پُر نم ہے دل آزاراں سمیت

اک قہقہہِ شہر کو کیا دوش دیجے جب سبھی
میکدے کے دشمنوں میں ہوں قدح خواراں سمیت

جشنِ مقتل تھا بپا اور صرف بسمل تھے ہمیں
ہم نے سوچا تھا کہ دیکھیں گے یہ دن یاراں سمیت

یہ رعونت تا بکے اے دل فگاراں دیکھنا
اب گرے گا طرۂ سلطاں سرِ سلطاں سمیت

وہ تو کیا آتے شبِ ہجراں تو کیا کٹتی فراز
بجھ گئیں آخر کو سب شمعیں چراغِ جاں سمیت

○

میں تو لب کھول کے پابندِ سلاسل ٹھہرا
تیری بات اور ہے تو صاحبِ محفل ٹھہرا

کیا کہوں کس نے قبیلہ مرا تقسیم کیا
آج یوں ہے کوئی بسمل، کوئی قاتل ٹھہرا

خوابِ آوارہ کسی آنکھ کی تقدیر نہ بن
کسی منزل پہ کبھی قافلۂ دل ٹھہرا

۹۵

مجھ کو بھی تیری اُداسی دلِ ویراں سی لگی
میں بھی اے شہرِ جدائی ترے قابل ٹھہرا

کیا گِلہ تجھ سے کہ آشوبِ جہاں ایسا ہے
میں بھی اے یار تری یاد سے غافل ٹھہرا

خوشنوایانِ چمن سب ہیں اسیرانِ قفس
اب کے زنداں بھی تو گلزارِ عنادل ٹھہرا

کتنے ہی سخت مقام آئے مگر جانِ فراز
نہ ترا درد ہی ٹھہرا نہ مرا دل ٹھہرا

○

اس دورِ بے جنوں کی کہانی کوئی لکھو
جسموں کو برف، خون کو پانی کوئی لکھو

کوئی کہو کہ ہاتھ قلم کس طرح ہوئے
کیوں رُک گئی قلم کی روانی کوئی لکھو

کیوں اہلِ شوق سر بگریباں ہیں دوستو
کیوں خوں بہ دل ہے عہدِ جوانی کوئی لکھو

کیوں سرمہ در گلو ہے ہر اک طائرِ سخن
کیوں گلستاں قفس کا ہے ثانی کوئی لکھو

ہاں تازہ سانحوں کا کرے کون انتظار
ہاں دل کی واردات پرانی کوئی لکھو

قلم سرخرو ہے

قلم سرخرو ہے
کہ جو اس نے لکھا
وہی آج میں ہوں
وہی آج تو ہے
قلم نے لکھا تھا
کہ جب بھی زبانوں پہ پہرے لگے ہیں
تو بازو سناں تولتے ہیں
کہ جب بھی لبوں پر خموشی کے تالے پڑے ہوں

تو زنداں کے دیوار و در بولتے ہیں
کہ جب حرفِ زنجیر ہوتا ہے
شمشیر ہوتا ہے آخر
تو آمر کی تقدیر ہوتا ہے آخر
کہ جو حرف ہے زیست کی آبرو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم نے لکھا تھا
یہ دھرتی اسی کی ہے، جو
ظلم کے موسموں میں
کھلے آسمانوں تلے
اس کی مٹی میں اپنا لہو گھولتا ہے
جو اپنے لہو کی تمازت سے
زلفِ نمو کی گرہ کھولتا ہے
وہی جس کی پوروں کے مَس سے

سکوتِ زمیں بولتا ہے
مگر جس نے بویا تھا کاٹا تھا
اس کے مقدّر میں نانِ جویں تک نہ تھی
جس کا پیکر مشقّت سے پتھرّا گیا
اور جس کے لبوں پر نہیں تک نہ تھی
اسی سے عبارت یہ سب رنگ و بُو ہے
قلم سرخرو ہے
قلم سرخرو ہے
کہ اس نے لکھا تھا
وہ بازو
جو پتھّر سے ہیرے تراشیں
مگر بے نشاں اُن کے گھر
بے کفن اُن کی لاشیں
وہی کوہکن

جن کے تیشے پہاڑوں کے دل چیر ڈالیں
مگر خسروانِ جہاں ان کی شیریں چُرا لیں
وہی جن کے جسموں کے پیوند
اہلِ ہوس کی قبائیں لگے تھے
وہی سادہ دل
جن کی نظریں فلک پر جمی تھیں
تو لب منعموں کی ثنائیں لگے تھے
اب ان کی ثنا چار سُو ہے
قلم سرخرو ہے

آئے تری محفل میں تو بے تاب بہت تھے
جو اہلِ وفا واقفِ آداب بہت تھے

اس شہرِ محبّت میں عجب کال پڑا ہے
ہم جیسے سبک لوگ بھی نایاب بہت تھے

کچھ دل ہی نہ مانا کہ سبک سر ہوں وگرنہ
آسودگیٔ جاں کے تو اسباب بہت تھے

مجبور تھے لے آئے کنارے پہ سفینہ
دریا جو ملے ہم کو وہ پایاب بہت تھے

اب دیکھ یہ حسرت بھری اُجڑی ہوئی آنکھیں
دنیا ترے بارے میں مرے خواب بہت تھے

ہیں کیوں نہ فراز اُن کی طرح مہر بلب تھا
اس بات سے ناخوش مرے احباب بہت تھے

○

وفا کے خواب محبّت کا آسرا لے جا
اگر چلا ہے تو جو کچھ مجھے دیا لے جا

مقامِ سود و زیاں آ گیا ہے پھر جاناں
یہ زخم میرے سہی تیر تو اُٹھا لے جا

یہی ہے قسمتِ صحرا یہی کرم تیرا
کہ بُوند بُوند عطا کر گھٹا گھٹا لے جا

غرورِ دوست سے اتنا بھی دل شکستہ نہ ہو
پھر اس کے سامنے دامانِ التجا لے جا

ندامتیں ہوں تو سر بارِ دوش ہوتا ہے
فرازؔ جاں کے عوض آبرو بچا لے جا

○

دوست بھی دشمن نہ تھے دل بھی عدو میرا نہ تھا
یہ تو مجھ پر اب کھُلا ظالم کہ تو میرا نہ تھا

اس طرح خوش ہو رہا ہوں جشنِ مقتل دیکھ کر
جس طرح ہر نوکِ خنجر پر لہُو میرا نہ تھا

اپنے اپنے بے وفاؤں نے ہمیں یکجا کیا
ورنہ میں تیرا نہیں تھا اور تو میرا نہ تھا

وہ کہیں بھی چھوڑ جاتا کیا گِلہ اس سے کہ وہ
اک مسافر تھا شریکِ جستجو میرا نہ تھا

اب تو خود سے بولتے میں خوف آتا ہے فراز
اتنا دل آزار طرزِ گفتگو میرا نہ تھا

خٹک ناچ

اک ہاتھ میں رُومال ہے اک ہاتھ میں تلوار
پشتون کا کردار

جو پیار کرے پیار ملے وار کرے وار کرے
ہر بات پہ تیار

کہسار کے سورج کی طرح گرم و شفق رُو
خیبر کی ہواؤں کی طرح تند و تنک خُو
یہ نغمۂ دلدار کبھی — شعلۂ بیدار
پشتون کا کردار

یہ مردِ کہستاں جو چٹانوں میں ڈھلا ہے
شاہیں صفت آزاد فضاؤں میں پلا ہے
رقصندہ و رخشندہ و تابندہ و طرّار

پشتون کا کردار

یہ رقص وفا کا بھی، جنوں کا بھی یہی رقص
جینے کی ادا گردشِ خوں کا بھی یہی رقص
وہ جنگ کا میدان ہو یا امن کا دربار

پشتون کا کردار

جو پیار کرے پیار ملے، وار کرے وار کرے

ہر بات پہ تیار

پشتون کا کردار

○

جس سمت بھی دیکھوں نظر آتا ہے کہ تم ہو
اے جانِ جہاں یہ کوئی تم سا ہے کہ تم ہو

یہ خواب ہے خوشبو ہے کہ جھونکا ہے کہ پل ہے
یہ دُھند ہے، بادل ہے کہ سایا ہے کہ تم ہو

اس دید کی ساعت میں کئی رنگ ہیں لرزاں
میں ہوں کہ کوئی اور ہے دنیا ہے کہ تم ہو

دیکھو یہ کسی اور کی آنکھیں ہیں کہ میری
دیکھوں یہ کسی اور کا چہرہ ہے کہ تم ہو

یہ عمرِ گریزاں کہیں ٹھہرے تو یہ جانوں
ہر سانس میں مجھ کو یہی لگتا ہے کہ تم ہو

ہر بزم میں موضوعِ سخن دل زدگاں کا
اب کون ہے شیریں ہے کہ لیلا ہے کہ تم ہو

اِک درد کا پھیلا ہُوا صحرا ہے کہ میں ہوں
اِک موج میں آیا ہُوا دریا ہے کہ تم ہو

وہ وقت نہ آئے کہ دلِ زار بھی سوچے
اس شہر میں تنہا کوئی ہم سا ہے کہ تم ہو

آباد ہم آشفتہ سروں سے نہیں مقتل
یہ رسم ابھی شہر میں زندہ ہے کہ تم ہو

اے جانِ فراز اتنی بھی توفیق کسے تھی
ہم کو غمِ ہستی بھی گوارا ہے کہ تم ہو

○

نوحہ گروں میں دیدۂ تر بھی اُسی کا تھا
مجھ پر یہ ظلم بارِ دگر بھی اُسی کا تھا

دیکھا مجھے تو ترکِ تعلّق کے باوجود
وہ مسکرا دیا یہ ہنر بھی اُسی کا تھا

آنکھیں کشاد و بست سے بدنام ہو گئیں
سورج اُسی کا خوابِ سحر بھی اُسی کا تھا

خنجر در آستیں ہی ملا جب کبھی ملا
وہ تیغ کھینچتا تو یہ سر بھی اُسی کا تھا

نشتر چبھے ہُوئے تھے رگِ جاں کے آس پاس
وہ چارہ گر تھا اور مجھے ڈر بھی اُسی کا تھا

محفل میں کل فراز ہی شاید تھا لب کُشا
مقتل میں آج کاسۂ سر بھی اُسی کا تھا

○

زلف راتوں سی ہے رنگت ہے اُجالوں جیسی
پر طبیعت ہے وہی بھولنے والوں جیسی

اِک زمانے کی رفاقت پہ بھی رم خوردہ ہے
اُس کم آمیز کی خُو بُو ہے غزالوں جیسی

ڈھونڈتا پھرتا ہوں لوگوں میں شباہت اُس کی
کہ وہ خوابوں میں بھی لگتی ہے خیالوں جیسی

کس دل آزار مسافت سے میں لوٹا ہوں کہ ہے
آنسوؤں میں بھی تپک پاؤں کے چھالوں جیسی

اس کی باتیں بھی دل آویز ہیں صورت کی طرح
میری سوچیں بھی پریشاں مرے بالوں جیسی

اس کی آنکھوں کو کبھی غور سے دیکھا ہے فراز
رونے والوں کی طرح جاگنے والوں جیسی

عید کارڈ

تجھ سے بچھڑ کر بھی زندہ تھا
مر مر کر یہ زہر پیا ہے
چپ رہنا آسان نہیں تھا
برسوں دل کا خوں کیا ہے
جو کچھ گزری جیسی گزری
تجھ کو کب الزام دیا ہے

اپنے حال پہ خود رو دیا ہوں
خود ہی اپنا چاک سِیا ہے
کتنی جانکاہی سے ہم نے
تجھ کو دل سے محو کیا ہے
سنّاٹے کی جھیل میں تُو نے
پھر کیوں پتّھر پھینک دیا ہے

○

نہ دل سے آہ نہ لب سے صدا نکلتی ہے
مگر یہ بات بڑی دور جا نکلتی ہے

ستم تو یہ ہے کہ عہدِ ستم کے جاتے ہی
تمام خلق مری ہم نوا نکلتی ہے

وصالِ ہجر کی حسرت میں جُوئے کم مایہ
کبھی کبھی کسی صحرا میں جا نکلتی ہے

میں کیا کروں مرے قاتل نہ چاہنے پر بھی
ترے لیے مرے دل سے دعا نکلتی ہے

وہ زندگی ہو کہ دُنیا فراز کیا کیجے
کہ جس سے عشق کرو بے وفا نکلتی ہے

○

ہنسے تو آنکھ سے آنسو رواں ہمارے ہوئے
کہ ہم پہ دوست بہت مہرباں ہمارے ہوئے

بہت سے زخم ہیں ایسے جو اُن کے نام کے ہیں
بہت سے قرض سرِ دوستاں ہمارے ہوئے

کہیں تو آگ لگی ہے وجود کے اندر
کوئی تو دُکھ ہے کہ چہرے دُھواں ہمارے ہوئے

گرج برس کے نہ ہم کو ڈبو سکے بادل
تو یہ ہُوا کہ وہی بادباں ہمارے ہوئے

فراز منزلِ مقصود بھی نہ تھی منزل
کہ ہم کو چھوڑ کے ساتھی رواں ہمارے ہوئے

○

فراز اب کوئی سودا کوئی جنوں بھی نہیں
مگر قرار سے دن کٹ رہے ہوں یوں بھی نہیں

لب و دہن بھی ملا گفتگو کا فن بھی ملا
مگر جو دل پہ گزرتی ہے کہہ سکوں بھی نہیں

نہ جانے کیوں مری آنکھیں برسنے لگتی ہیں
جو سچ کہوں تو کچھ ایسا اُداس ہوں بھی نہیں

مری زباں کی لکنت سے بدگمان نہ ہو
جو تو کہے تو تجھے عمر بھر ملوں بھی نہیں

دُکھوں کے ڈھیر لگے ہیں کہ لوگ بیٹھے ہیں
اسی دیار کا میں بھی ہوں اور ہوں بھی نہیں

فراز جیسے دیا قربتِ ہوا چاہے
وہ پاس آئے تو ممکن ہے میں رہوں بھی نہیں

میورکا

(سپین کا ایک خوب صورت جزیرہ)

میورکا کے ساحلوں پہ کس قدر گلاب تھے
کہ خوشبوئیں تھی بے طرح کہ رنگ بے حساب تھے

تنک لباسیاں شناوروں کی تھیں قیامتیں
تمام سیم تن شریکِ جشنِ شہرِ آب تھے

شعاعِ مہر کی ضیا سے تھے جگر جگر بدن
قمر جمال جن کے عکس روشنی کے باب تھے

کھلی فضا کی دھوپ وہ کہ جسم سانولے کرے
بُتانِ آذری کہ مست غسلِ آفتاب تھے

یہیں پتہ چلا کہ زیست حسن ہے بہار ہے
یہیں خبر ہُوئی کہ زندگی کے دُکھ سراب تھے

یہیں لگا کہ گردشوں کے زاویے بدل گئے
نہ روز و شب کی تلخیاں نہ وقت کے عذاب تھے

مرے تمام دوست اجنبی رفاقتوں میں گم
مری نظر میں تیرے خد و خال تیرے خواب تھے

میں دُوریوں کے باوجود تیرے آس پاس تھا
میورکا کے ساحلوں پہ میں بہت اُداس تھا

○

تھی مرے جام میں دُردِ مئے تنہائی بہت
کل کسی یارِ قدح ریز کی یاد آئی بہت

نہ کوئی مونسِ دل تھا نہ کوئی دشمنِ جاں
پہلے پہلے تو طبیعت مری گھبرائی بہت

کیٹس کی قبر پہ پہنچا تو بھر آئی آنکھیں
اُس جواں مرگ سے جیسے تھی شناسائی بہت

نشہ اُترا تو بدن یوں تھا شکستہ جیسے
بادہ پیمائی تھی کم بادیہ پیمائی بہت

اب تو رشک آتا ہے یاروں کی جوانمرگی پر
زندگی میں بھی کبھی تھا ترا شیدائی بہت

رومؔ کا حسن بہت دامنِ دل کھینچتا ہے
اے مری خاکِ پشاور تری یاد آئی بہت

اوّلِ عشق کی بات اور تھی جو بھی ہوتا
اب تو ملنے کہ نہ ملنے میں ہے رسوائی بہت

اب فرازؔ اپنے مسیحا سے بھی امید نہ رکھ
وہ تنک دل ہے ترے زخم میں گہرائی بہت

○

جو قربتوں کے نشے تھے وہ اب اُترنے لگے
ہوا چلی ہے تو جھونکے اداس کرنے لگے

گئی رُتوں کا تعلّق بھی جان لیوا تھا
بہت سے پھول نئے موسموں میں مرنے لگے

وہ مُدّتوں کی جُدائی کے بعد ہم سے ملا
تو اس طرح سے کہ اب ہم گریز کرنے لگے

غزل میں جیسے ترے خدوخال بول اُٹھیں
کہ جس طرح تری تصویر بات کرنے لگے

بہت دنوں سے وہ گھمبیر خامشی ہے فراز
کہ لوگ اپنے خیالوں سے آپ ڈرنے لگے

○

انھیں خوش گمانیوں میں کہیں جاں سے بھی نہ جاؤ
وہ جو چارہ گر نہیں ہے اسے زخم کیوں دکھاؤ

یہ اداسیوں کے موسم یونہی رائیگاں نہ جائیں
کسی یاد کو پکارو کسی درد کو جگاؤ

وہ کہانیاں ادھوری جو نہ ہو سکیں گی پوری
انھیں میں بھی کیوں سناؤں انھیں تم بھی کیوں سناؤ

یہ جدائیوں کے رستے بڑی دور تک گئے ہیں
جو گیا وہ پھر نہ آیا مری بات مان جاؤ

کسی بے وفا کی خاطر یہ جنوں فرازؔ کب تک
جو تمھیں بھلا چکا ہے اسے تم بھی بھول جاؤ

○

طعنہ زن کیوں ہے مری بے سروسامانی پر
اِک نظر ڈال ذرا شہر کی ویرانی پر

واعظو میں نے بھی انساں کی عبادت کی ہے
پر کوئی نقش نہیں ہے مری پیشانی پر

ان کے ملبوس میں پیوند مرے جسم کے ہیں
اور یاروں کی نظر ہے مری عریانی پر

وقت رُکتا ہی نہیں خواب ٹھہرتے ہی نہیں
پاؤں جمتے ہی نہیں بہتے ہُوئے پانی پر

کشتیٔ جاں ہے کہ ڈوبے چلی جاتی ہے فرازؔ
اور ابھی درد کا دریا نہیں طغیانی پر

اہلِ تاشقند کے نام

(ایک مجسمہ دیکھ کر)

کانسی کے مجسّمے میں کیا کیا
اظہار ہے، کرب ہے، نمو ہے

انسان کے عزم کی علامت
فطرت کے ستم کے روبرو ہے

ہاتھوں میں غضب کا حوصلہ ہے
ماتھوں پہ جلال آبرو ہے

۱۲۵

آنکھوں میں وقارِ فاتحانہ
چہروں پہ گلاب سا لہو ہے

ہر بار بلا کا رَن پڑا تھا
ہر بار حیات سرخرو ہے

جیسے کہ مجسّمے میں مَیں ہُوں
جیسے کہ مجسّمے میں تُو ہے

تاشقند - ۶ - ۱۹ء

خود آپ اپنی نظر میں حقیر میں بھی نہ تھا
اس اعتبار سے اُس کا اسیر میں بھی نہ تھا

بنا بنا کے بہت اُس نے جی سے باتیں کیں
میں جانتا تھا مگر حرف گیر میں بھی نہ تھا

نبھا رہا ہے یہی وصفِ دوستی شاید
وہ بے مثال نہ تھا بے نظیر میں بھی نہ تھا

سفر طویل سہی گفتگو مزے کی رہی
وہ خوش مزاج اگر تھا تو میر میں بھی نہ تھا

میں برگِ آخرِ شہرِ خزاں تھا خاک ہُوا
کھُلا کہ موسمِ گُل کا سفیر میں بھی نہ تھا

میں کہہ رہا تھا رفیقوں سے جی کڑا رکھو
چلا جو درد کا اِک اور تیر میں بھی نہ تھا

ستم کے عہد میں چُپ چاپ جی رہا ہوں فرازؔ
سو دوسروں کی طرح باضمیر میں بھی نہ تھا

یوں تو محرومِ نوا کب سے دہن میرا تھا
پھر بھی چرچا ہُوا جس کا وہ سخن میرا تھا

مَیں نے کس نشّہ و نخوت میں کماں کھینچی تھی
تیر جس جسم میں اُترا وہ بدن میرا تھا

تُو کبھی غور سے دیکھ اپنی قبائے ریشم
تیرے خلعت میں کوئی تارِ کفن میرا تھا

اب تو مجھ کو بھی ندامت ہے وفا پر اپنی
مختلف کتنا زمانے سے چلن میرا تھا

آخری شامِ خزاں ٹوٹ کے یاد آتی ہے
پھر نشیمن ہی مرا تھا نہ چمن میرا تھا

میری آنکھوں نے جو دیکھا مرے لب پر آیا
میری تقصیر ہی بے ساختہ پن میرا تھا

تھی اُفق تا بہ اُفق یوں تو مری خاکِ فراز
کس قدر تنگ مگر مجھ پہ وطن میرا تھا

۱۳۰

ہوا کے زور سے پندارِ بام و در بھی گیا
چراغ کو جو بچاتے تھے اُن کا گھر بھی گیا

پکارتے رہے محفوظ کشتیوں والے
میں ڈوبتا ہُوا دریا کے پار اُتر بھی گیا

اب احتیاط کی دیوار کیا اُٹھاتے ہو
جو چور دل میں چھپا تھا وہ کام کر بھی گیا

میں چُپ رہا کہ اسی میں عافیت جاں کی تھی
کوئی تو میری طرح تھا جو دار پر بھی گیا

۱۳۱

سلگتے سوچتے ویران موسموں کی طرح
کڑا تھا عہدِ جوانی مگر گزر بھی گیا

جسے بُھلا نہ سکا اس کو یاد کیا رکھتا
جو نام لب پہ رہا ذہن سے اُتر بھی گیا

پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں سے یوں نہ دیکھ مجھے
تجھے تلاش ہے جس شخص کی وہ مر بھی گیا

مگر فلک کو عداوت اسی کے گھر سے تھی
جہاں فراز نہ تھا سیلِ غم اُدھر بھی گیا

ہر دوا درد کو بڑھا ہی دے
اب تو اے دل اسے بھلا ہی دے

لُٹنے والے سے یوں گریز نہ کر
کیا خبر وہ تجھے دعا ہی دے

جس کے چہرے پہ میری آنکھیں ہیں
وہ مجھے طعنِ کم نگاہی دے

یہ بھی اک شیوۂ رفاقت ہے
جانے والوں کو راستا ہی دے

جانکنی کے عذاب سے نکلوں
آخری تیر بھی چلا ہی دے

اب تو جیسے فراز بادِ مراد
زندگی کا دیا بجھا ہی دے

کہا نہیں تھا

کہا تھا
اس شہر کو نہ جاؤ
اب اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے ہو
تو رو رہے ہو
کہ اب وہاں تم نہیں
نئے لوگ بس گئے ہیں
کہا تھا
اب شہرِ آرزو

دہشتِ جاں رُبا ہے

گئے زمانوں کی خوشبوئیں کب سے مر چکی ہیں
جُدائیاں کام کر چکی ہیں
تمہارے نغموں کے نرم پودے
نئی رُتوں کی شدید لُو سے جھلس گئے ہیں
گلاب کے سرخ سرخ پھُولوں کو
کاسنی سانپ ڈس گئے ہیں
وہ گفتگوؤں کی آبجُوئیں
سکوت کے ریگزار میں دفن ہو گئی ہیں
اُفق کے اُس پار کھو گئی ہیں
کہا تھا — وہ ساعتیں نہ لوٹیں گی
جو گئی ہیں

کہا تھا
نم قرب کے نشے میں

انا کے مینار چُن رہے ہو
کہا تھا
تم انس و وفا کے صحرا میں
اپنی آواز سُن رہے ہو
ڈراؤنے خواب بُن رہے ہو
تمھیں بڑا زعم تھا
کہ آنکھوں کے آئینوں کو
ہر انجمن کو سجا رہے تھے
تمھیں غرور اپنی ذات پر تھا
کہ اپنا سب کچھ لُٹا رہے تھے
کہا تھا
ان آئینوں کو اب دیکھنے نہ جاؤ
کہ ان میں اوروں کے عکس ہوں گے
کہا تھا

ان راستوں پہ اب تم نہ گنگناؤ
کہ دوسرے محوِ رقص ہوں گے
یہ آئینے
جو ہر ایک دیوار پر سجے ہیں
تمھارے اشکوں کی کانچ ہے بس
یہ برف کے پیکروں کے شعلے
تمھارے سانسوں کی آنچ ہے بس
فراق کی بات ہی جُدا ہے
یہاں تو آنکھوں سے آئینوں سے
جو عکس اوجھل ہُوا
تو پھر وہ کہیں نہیں تھا
پلٹ کے آئے تو کیا
نہ آئے تو کیا
کہ آنکھیں تو آئینے ہیں

اور آئینوں کو غرض نہیں ہے
کہ کون چہرہ نظر نشیں تھا
وہ کوئی پتھّر تھا یا نگیں تھا
کہا نہیں تھا

○

قامت کو تیرے سرو صنوبر نہیں کہا
جیسا بھی تو تھا اس سے تو بڑھ کر نہیں کہا

اس سے ملے تو زعمِ تکلّم کے باوجود
جو سوچ کر گئے وہی اکثر نہیں کہا

اتنی مروّتیں تو کہاں دشمنوں میں تھیں
یاروں نے جو کہا مرے منہ پر نہیں کہا

مجھ سا گنہگار سرِ دار کہہ گیا
واعظ نے جو سخن سرِ منبر نہیں کہا

برہم بس اس خطا پہ امیرانِ شہر ہیں
ان جوہڑوں کو میں نے سمندر نہیں کہا

یہ لوگ میری فردِ عمل دیکھتے ہیں کیوں
میں نے فراز خود کو پیمبر نہیں کہا

○

اِتنا بے رنگ دُکھ کو نہیں جانیئے، ہر رگِ جاں شعاعِ بدن ہوے گی
لوگ پھر سے اُچھالیں گے اپنا لہو اور گلگوں قبائے وطن ہوے گی

تا بکے یونہی اختر شماری کرو، جوئے خوں اپنی رگ رگ سے جاری کرو
اور کچھ روز سینہ فگاری کرو، بزمِ خاموش بزمِ سخن ہوئے گی

تم نے ہونٹوں پہ مُہریں لگا دیں تو کیا، تم نے شمعیں نوا کی بُجھا دیں تو کیا
جو حکایت سُنی اَن سُنی ہو گئی، اب وہی انجمن انجمن ہوئے گی

اب تلاشِ مسیحا عبث دوستو، اب جو قاتل ہے بس جستجو اس کی ہو
ورنہ نامِ خدا ناسزا ہوئے گا، اور خلقِ خدا بے کفن ہوئے گی

رُت کو آخر بدلنا تو ہے دوستو، اس قیامت کو ٹلنا تو ہے دوستو
اس طرف ہم کو چلنا تو ہے دوستو، جس طرف فصلِ دار و رسن ہوئے گی

میں ترا قاتل ہُوں

میں ترا قاتل ہُوں
اے مشرق مجھے مصلوب کر
مَیں جو عیسا کے لبادے
مَیں ترے بیمار فرزندوں کے گھر
آیا تھا
کل چارہ گری کے واسطے
میں نے ان سے کیا کیا
میں کہ درماں بن کے آیا تھا

ترے ناسور زخموں کے لیے
بارود کا مرہم لیے
بندوق کا پرچم لیے
میرے بوجھل بُوٹ
جن کی چاپ
تیرے چوبداروں سی تھی
اب کی بار ایسے زلزلے لائے
کہ تیرے ہنستے بستے شہر ملبے بن گئے
(اور در و دیوار کے ڈھیروں میں
کُرلاتا ہُوا
گونگے مکینوں کا لہو)
خاک و خوں کے اس گلابے سے
میں اپنے بھاری بوٹوں کو نکالوں کس طرح
یہ مری بندوق میرے دوش پر اک بوجھ ہے

اور زمیں مجھ کو نگلتی جا رہی ہے دم بدم
میرے مشرق
جانکنی کے اس مسلسل کرب سے
مجھ کو بچا میرے لہو میں ڈوب کر
میں ترا قاتل
ترا عیسا
مجھے مصلوب کر

○

جو سر بھی کشیدہ ہو اُسے دار کرے ہے
اغیار تو کرتے تھے سو اب یار کرے ہے

وہ کون ستمگر تھے کہ یاد آنے لگے ہیں
تُو کیسا مسیحا ہے کہ بیمار کرے ہے

اب روشنی ہوتی ہے کہ گھر جلتا ہے دیکھیں
شعلہ سا طوافِ در و دیوار کرے ہے

کیا دل کا بھروسہ ہے یہ سنبھلے کہ نہ سنبھلے
کیوں خود کو پریشاں مرا غمخوار کرے ہے

ہے ترکِ تعلّق ہی مداوائے غمِ جاں
پر ترکِ تعلّق تو بہت خوار کرے ہے

اس شہر میں ہو جنبشِ لب کا کسے یارا
یاں جنبشِ مژگاں بھی گنہگار کرے ہے

تو لاکھ فراز اپنی شکستوں کو چھپائے
یہ چپ تو ترے کرب کا اظہار کرے ہے

○

کشیدہ سر سے توقع عبث جھکاؤ کی تھی
بگڑ گیا ہوں کہ صورت یہی بناؤ کی تھی

وہ جس گھمنڈ سے بچھڑا گلہ تو اس کا ہے
کہ ساری بات محبّت میں رکھ رکھاؤ کی تھی

وہ مجھ سے پیار نہ کرتا تو وار کیا کرتا
کہ دشمنی میں بھی شدّت اسی لگاؤ کی تھی

مگر یہ دردِ طلب بھی سراب ہی نکلا
وفا کی لہر بھی جذبات کے بہاؤ کی تھی

اکیلے پار اُتر کر یہ ناخدا نے کہا
مسافرو یہی قسمت شکستہ ناؤ کی تھی

چراغِ جاں کو کہاں تک بچا کے ہم رکھتے
ہوا بھی تیز تھی، منزل بھی چل چلاؤ کی تھی

میں زندگی سے نبرد آزما رہا ہوں فراز
میں جانتا تھا یہی راہ اک بچاؤ کی تھی

ہر کوئی جاتی ہوئی رُت کا اشارہ جانے
"گُل نہ جانے بھی تو کیا باغ تو سارا جانے"

کس کو بتلائیں کہ آشوبِ محبّت کیا ہے
جس پہ گزری ہو وہی حال ہمارا جانے

جان نکلی کسی بسمل کی نہ سورج نکلا
بجھ گیا کیوں شبِ ہجراں کا ستارا جانے

جو بھی ملتا ہے ہمیں سے وہ گلہ کرتا ہے
کوئی تو صورتِ حالات خدارا جانے

دوست احباب تو رہ رہ کے گلے ملتے ہیں
کس نے خنجر مرے سینے میں اُتارا جانے

تجھ سے بڑھ کر کوئی ناداں نہیں ہو گا کہ فراز
دشمنِ جاں کو بھی تو جان سے پیارا جانے

میں اکیلا کھڑا ہوں

پیمبر!
تری بارگاہِ معلّٰی میں
عصیاں کے انبار سے سرنگوں
اِک گنہگار انساں کھڑا ہے

نہ اُس کے بدن پر عبا و قبا ہے
نہ ہاتھوں میں اُس کے تسبیح کا سلسلہ ہے
نہ ماتھے پہ محرابِ داغِ ریا ہے

یہ وہ بد مقدّر ہے
جس کا بدن بارشِ سنگِ خلقت سے
غربال ہے
جس کی گردن میں طوقِ ملامت پڑا ہے
یہ زندہ گڑا ہے

یہ مجرم ہے
ان دائمی اور سفّاک سچائیوں کا
کہ جو تُو نے کاذب جہاں کو عطا کیں

یہ مجرم ہے
ان بے غرض جراُتوں کا
جو تُو نے ہر اک ناتواں کو عطا کیں
یہ کہتا ہے

اے دائمی حکمتوں کے پیمبر
کہ انساں سب برابر ہیں
ان میں کوئی کم نسب کوئی برتر نہیں ہے
یہ کہتا ہے
الفاظ سب مقدّس ہیں
اور حرف کی روشنی سے
کوئی نور بڑھ کر نہیں ہے
یہ سرکش
مقدّر کو انساں کا راہوار کہتا ہے
آدم کو نقاشِ ہستی کا شہکار کہتا ہے
کیا کچھ یہ ظالم گنہگار کہتا ہے
اے روشنی کے پیمبر
یہ شوریدہ سر
حرف زن ہے

کہ محراب و منبر سے
فتوہ گر و فتنہ پردازِ دیں
حرفِ حق بیچتے ہیں
فقیہانِ مسند نشیں
حرصِ دینار و درہم میں
تیرے صحیفے کا اِک اِک ورق بیچتے ہیں
یہ خلقت کا خوں
اور اپنی جبیں کا عرق بیچتے ہیں

پیمبر!
مجھے حوصلہ دے
کہ میں ظلم کی قوّتوں سے
اکیلا لڑا ہوں
کہ میں اس جہاں کے جہنّم کدے میں
اکیلا کھڑا ہوں

سلام اُس پر!

حسینؑ!
اے میرے سر بریدہ
بدن دریدہ
سدا ترا نام برگزیدہ
میں کربلا کے لہو لہو دشت میں تجھے
دشمنوں کے نرغے میں
تیغ در دست دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں

کہ تیرے سارے رفیق
سب ہمنوا
سبھی جانفروش
اپنے سروں کی فصلیں کٹا چکے ہیں
گلاب سے جسم اپنے خوں میں نہا چکے ہیں
ہوائے جانکاہ کے بگولے
چراغ سے تابناک چہرے بجھا چکے ہیں
مسافرانِ رہِ وفا لُٹ لٹا چکے ہیں
اور اب فقط تو
زمین کے اس شفق کدے میں
ستارۂ صبح کی طرح
روشنی کا پرچم لیے کھڑا ہے

یہ ایک منظر نہیں ہے

اِک داستاں کا حصّہ نہیں ہے
اِک واقعہ نہیں ہے
یہیں سے تاریخ
اپنے تازہ سفر کا آغاز کر رہی ہے
یہیں سے انسانیت
نئی رفعتوں کو پرواز کر رہی ہے

میں آج اسی کربلا میں
بے آبرُو — نگوں سر
شکست خوردہ خجل کھڑا ہوں
جہاں سے میرا عظیم ہادی
حسینؑ کل سرخرو گیا ہے

میں جاں بچا کر

فنا کے دلدل میں جاں بلب ہوں
زمین اور آسمان کے عزّ و فخر
سارے حرام مجھ پر
وہ جاں لُٹا کر
منارۂ عرش چھُو گیا ہے

سلام اُس پر
سلام اُس پر

○

گلیوں میں کیسا شور تھا کیوں بھیڑ سی مقتل میں تھی
کیا وصف اس شاعر میں تھا کیا بات اس پاگل میں تھی

ایسا ستم کیا ہو گیا اِک راہرو تھا کھو گیا
پھر زندگی کی شام تھی اور شام بھی جنگل میں تھی

کیا کیا ہوا چلتی رہی، یہ لَو مگر جلتی رہی
کیا زور اُس آندھی میں تھا کیا تاب اس مشعل میں تھی

شعلہ بہ دل آتش بجاں پھرتا رہا وہ بے اماں
ورنہ صبا زلفوں میں تھی ورنہ گھٹا کاجل میں تھی

ترسی ہوئی آنکھوں میں کن کن ساحلوں کے خواب تھے
پر کشتیٔ عمرِ رواں حالات کی دلدل میں تھی

خلقت نے آوازے کسے طعنے دیئے فتوے جڑے
وہ سخت جاں ہنستا رہا گو خودکشی پل پل میں تھی

اپنی کشیدِ جاں سے ہی پیتا رہا جیتا رہا
نشہ کہاں ساغر میں تھا مستی کہاں بوتل میں تھی

ماورا پبلشرز
۳ بہاول پور روڈ
لاہور

شب خون

جنگِ ستمبر ۶۵ء سے متعلّق

احمد فراز

باذوق لوگوں کے لیے
ہماری کتابیں
خوبصورت کتابیں

تزئین و اہتمام اشاعت

خالد شریف

ماورا

ضابطہ

ناشر : خالد شریف
مطبع : فضل حق پرنٹرز، لاہور
اشاعت : اپریل ۱۹۸۹ء
قیمت : ۳۵ روپے

گمنام شہیدوں کے نام ....

ترتیب

گریزد از صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد، از قبیلۂ ما نیست

اے مری ارضِ وطن!

اے مری ارضِ وطن، پھر تری دہلیز پہ میں
یوں نگوں سار کھڑا ہوں کوئی مجرم جیسے
آنکھ بے اشک ہے برسے ہوئے بادل کی طرح
ذہن بے رنگ ہے اُجڑا ہوا موسم جیسے
سانس لیتے ہوئے اس طرح لرز جاتا ہوں
اپنے ہی ظلم سے کانپ اُٹھتا ہے ظالم جیسے

○

تو نے بخشا تھا مرے فن کو وہ اعجاز کہ جو
سنگِ خارا کو دھڑکنے کی ادا دیتا ہے
تو نے وہ سحر مرے حرفِ نوا کو بخشا
جو دلِ قطرہ میں قلزم کو چھپا دیتا ہے
تُو نے وہ شعلۂ ادراک دیا تھا مجھ کو
جو کفِ خاک کو انسان بنا دیتا ہے

○

اور میں مستِ مئے رامش و رنگِ ہستی
اتنا بے حس تھا کہ جیسے کسی قاتل کا ضمیر
یہ قلم تیری امانت تھا مگر کس کو مِلا؟
جو لُٹا دیتا ہے نشے میں سلف کی جاگیر
جیسے میزانِ عدالت کسی کج فہم کے پاس
جیسے دیوانے کے ہاتھوں میں برہنہ شمشیر

○

تجھ پہ ظلمات کی گھنگھور گھٹا چھائی تھی
اور میں چپ تھا کہ روشن ہے مرے گھر کا چراغ
تیرے میخانے پہ کیا کیا نہ قیامت ٹوٹی
اور میں خوش تھا سلامت ہے ابھی میرا باغ
میں نے اپنے ہی گنہگار بدن کو چوما
گرچہ جویائے محبّت تھے ترے جسم کے داغ

○

جملۂ ذات میں آئینے جڑے تھے اتنے
کہ میں مجبور رہا گرچہ خود آرائی تھا
تیری روتی ہوئی مٹّی پہ نظر کیا جمتی
کہ میں ہنستے ہوئے جلووں کا تمنّائی تھا
ایک پل آنکھ اُٹھائی بھی اگر تیری طرف
میں بھی اوروں کی طرح صرف تماشائی تھا

○

اور اب خواب سے چونکا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں
ایک اک حرف مرا تیرِ ملامت ہے مجھے
تُو اگر ہے تو مرا فن بھی مری ذات بھی ہے
ورنہ یہ شامِ طرب صبحِ قیامت ہے مجھے
میری آواز کے دُکھ سے مجھے پہچان ذرا
میں تو کہہ بھی نہ سکوں کتنی ندامت ہے مجھے

○

آج سے میرا ہُنر پھر سے اثاثہ ہے ترا
اپنے افکار کی نس نس میں اُتاروں گا تجھے
وہ بھی شاعر تھا کہ جس نے تجھے تخلیق کیا
میں بھی شاعر ہوں تو خوں دے کے سنواروں گا تجھے
اے مری ارضِ وطن اے مری جاں اے مرے فن
جب تلک تابِ تکلّم ہے پکاروں گا تجھے

میں کیوں اُداس نہیں

لہو لہان مرے شہر میرے یار شہید
مگر یہ کیا کہ مری آنکھ ڈبڈبائی نہیں
نظر کے زخم جگر تک پہنچ نہیں پائے
کہ مجھ کو منزلِ اظہار تک رسائی نہیں
میں کیا کہوں کہ پشاور سے چاٹگام تلک
میرے دیار نہیں تھے کہ میرے بھائی نہیں

○

وہی ہوں میں مرا دل بھی وہی جنوں بھی وہی
کسی پہ تیر چلے جاں فگار اپنی ہو
وہ ہیرو شیما ہو، ویتنام ہو کہ بٹ مالو (۱)
کہیں بھی ظلم ہو آنکھ اشکبار اپنی ہو
یہی ہے فن کا تقاضا یہی مزاج اپنا
متاعِ درد سبھی پر نثار اپنی ہو

○

نہیں کہ درد نے پتھّر بنا دیا ہے مجھے
نہ یہ کہ آتشِ احساس سرد ہے میری
نہیں کہ خونِ جگر سے تہی ہے میرا قلم
نہ یہ کہ لوحِ وفا برگِ زرد ہے میری
گواہ ہیں مرے احباب میرے شعر ثبوت
کہ منزلِ رسن و دار گرد ہے میری

(۱) کشمیر کا ایک قصبہ

○

بجا کہ امن کے بربط اُٹھائے آج تلک
ہمیشہ گیت محبّت کے گائے ہیں میں نے
عزیز ہے مجھے معصوم صورتوں کی ہنسی
بجا کہ پیار کے نغمے سنائے ہیں میں نے
چھڑک کے اپنا لہو اپنے آنسوؤں کی پھوار
ہمیشہ جنگ کے شعلے بجھائے ہیں میں نے

○

میں سنگدل ہوں نہ بیگانۂ وفا یارو
نہ یہ کہ میں ہوں کسی خواب زار میں کھویا
تمھیں خبر ہے کہ دل پر خراش جب بھی لگے
تو بند رہ نہیں سکتا مرا لبِ گویا
وہ مرگِ ہم نفساں پر حزیں نہیں ہے تو کیوں
جو فاطمی و لوممبا کی موت پر رویا

○

دلاورانِ وفا کیش کی شہادت پر
مرا جگر بھی لہو ہے پہ وقفِ یاس نہیں
سیالکوٹ کے مظلوم ساکنوں کے لیے
جز آفریں کہ کوئی لفظ میرے پاس نہیں
میں کیسے خطّۂ لاہور کے پڑھوں نوحے
یہ شہرِ زندہ دلاں آج بھی اُداس نہیں

○

جنوں فروغ ہے یار و عدو کی سنگ زنی
ہزار شکر کہ معیارِ عشق پست نہیں
مناؤ جشن کہ روشن ہیں مشعلیں اپنی
دریدہ سر ہیں تو کیا غم شکستہ دست نہیں
مرے وطن کی جبیں پر دمک رہا ہے جو زخم
وہ نقشِ فتح ہے داغِ غمِ شکست نہیں

○

گریز داز صفِ ما ہر کہ مردِ غوغا نیست
کسے کہ کشتہ نشد، از قبیلۂ ما نیست

غزل

کب یاروں کو تسلیم نہیں کب کوئی عدو انکاری ہے
اس کوئے طلب میں ہم نے بھی دل نذر کیا جاں واری ہے

جب سازِ سلاسل بجتے تھے ہم اپنے لہو میں سجتے تھے
وہ رِیت ابھی تک باقی ہے یہ رسم ابھی تک جاری ہے

کچھ اہلِ ستم کچھ اہلِ حَشم مے خانہ گرانے آئے تھے
دہلیز کو چوم کے چھوڑ دیا دیکھا کہ یہ پتھّر بھاری ہے

جب پرچمِ جاں لے کر نکلے ہم خاک نشیں مقتل مقتل
اُس وقت سے لے کر آج تلک جلّاد پہ ہیبت طاری ہے

زخموں سے بدن گلزار سہی پر ان کے شکستہ تیر گِنو
خود ترکش والے کہہ دیں گے یہ بازی کس نے ہاری ہے

کس زعم میں تھے اپنے دشمن شاید یہ اُنھیں معلوم نہ تھا
یہ خاکِ وطن ہے جاں اپنی اور جان تو سب کو پیاری ہے

اے مرے شہر!

"جنگ ۱۹۶۵ء میں ۱۳ ستمبر کو کوہاٹ پر بھارت کی
وحشیانہ بمباری کی وجہ سے بیشمار معصوم جانیں تلف ہوئی تھیں۔"

مرے شہر!
میں تجھ سے نادم ہوں
اس خامشی کے لیے
جب عدو تیری خوابیدہ گلیوں پہ
بھیگی ہوئی رات میں
آگ برسا رہا تھا
میں چپ تھا

مرے شہر!
میں تیرا مجرم ہوں
اس بے حسی کے لیے
جب ترے بام و در
طاق و دہلیز و دیوار
تیرے مکینوں کے
خونِ خنا رنگ سے
تر بتر ہو رہے تھے
تو میں چشم بستہ تھا

اے مرے آباء کے مسکن!
میں تیرا گنہگار ہوں
جب ترے آئینہ رنگ چشموں سے
اک جوئے خوں آملی تھی
تو مرے لبوں پہ
کوئی حرفِ ماتم نہ آیا
کہ جب تیرے زرناب خرمن پہ

سفّاک بجلی گری تھی
تو میں تیری جلتی ہوئی کھیتیوں کی طرف
با دلِ چاک و با چشمِ پُر نم نہ آیا

میں شرمندہ ہوں
اے مرے برگزیدہ بزرگوں کی بستی
کہ اس درد کی فصل میں
تیرے فرزند شاعر کی نوکِ قلم پر
ترا اسمِ اعظم نہ آیا

یہ سب کچھ بجا ہے —
یہ سب کچھ بجا ہے
مگر اے مقدّس زمیں!
تیری مٹّی نے جب میری صورت گری کی
تو ورثے میں تُو نے
مجھے ایسا دل دے دیا تھا
جو اپنے دُکھوں کے سمندر نہ دیکھے

مگر دوسروں کے نمِ چشم سے باخبر ہو
مجھے تیری گِل نے وہ احساس بخشا
جو اپنے عزیزوں کی لاشوں پہ
پتھّر بنا دم بخود ہو
مگر کاہشِ دیگراں پر
سدا نوحہ گر ہو

مرے شہر!
جب تیرے سینے سے
مینارِ خوں اُٹھ رہا تھا
میں اُس وقت
غافل نہیں تھا
میں بے حِس نہیں تھا
مگر اس گھڑی میرا سارا وطن
ظلم کی زد میں تھا
میرا سارا چمن
آگ کی حد میں تھا
ساری دنیا کی مظلومیت، میری آہوں میں تھی

ساری دنیا ہی میری نگاہوں میں تھی
اس سمے
تو ہی تو تھا
پشاور کا
لاہور کا
اور
بنگال کا نام، کوہاٹ تھا
کاشمیر
کوریا
ہیروشیما کا ویتنام کا نام، کوہاٹ تھا
ساری مظلوم دنیا کے ہر شہر کا نام کوہاٹ تھا

اے مرے شہر
میرا قلم اپنے کردار پر
تجھ سے نادم سہی
خود سے نادم نہیں
تو مرا شہر ہے
پر مرا شہر تو آج ساری زمیں ہے
فقط تو نہیں ہے

نیا کشمیر

میری فردوس گُل و لالہ و نسرین کی زمیں
تیرے پھولوں کی جوانی ترے باغوں کی بہار
تیرے چشموں کی روانی ترے نظّاروں کا حُسن
تیرے کہساروں کی عظمت ترے نغموں کی پھوار
کب سے ہیں شعلہ بداماں و جہنّم بکنار

تیرے سینے پہ محلّات کے ناسوروں نے
تیری شریانوں میں اک زہر سا بھر رکھا ہے
تیرا ماحول تو جنّت سے حسیں تر ہے مگر
تجھ کو دوزخ سے سوا وقت نے کر رکھا ہے
تجھ کو غیروں نے سدا دست نگر رکھا ہے

مہ و انجم سے تراشے ہوئے تیرے باسی
ظلم و ادبار کے شعلوں سے جہاں سوختہ ہیں
قحط و افلاس کے گرداب میں غرقاب عوام
جن سے تقدیر کے ساحل بھی برافروختہ ہیں
سالہا سال سے لب بستہ زباں دوختہ ہیں

اُن کی قسمت میں رہی محنتِ دریوزہ گری
اور شاہی نے تری خلد کو تاراج کیا
تیرے بیٹوں کا لہو زینتِ ہر قصر بنا
تجھ پہ نمرود کی نسلوں نے سدا راج کیا
ان کا مسلک تھا کہ پامال کیا راج کیا

لیکن اب اے مری شاداب چناروں کی زمین
انقلابات نئے دور ہیں لانے والے
حشر اُٹھانے کو ہیں اب ظلم کے ایوانوں میں
جن کو کہتا تھا جہاں بوجھ اُٹھانے والے
پھر تجھے ہیں گل و گلزار بنانے والے

یہ پرچمِ جاں......

(تحریکِ آزادیٔ کشمیر کی نذر)

جنّت میں بھڑک رہے تھے شعلے
پھولوں کی جبیں جھلس گئی تھی
شبنم کو ترس گئی تھیں شاخیں
گلزار میں آگ بس گئی تھی

نغموں کا جہاں تھا ریزہ ریزہ
اک وحشتِ درد کُو بکُو تھی
ہر دل تھا بجھا چراغ گویا
ہر چشمِ طلب لہو لہو تھی

میں اور میرے رفیق برسوں
خاموش و فسردہ دل کھڑے تھے
پر جاں کا زیاں قبول کس کو
منزل کے تو راستے بڑے تھے

لیکن یہ سکوتِ مرگ آسا
تا دیر نہ رہ سکا فضا میں
اک شور سا چار سمت اُٹھا
کچھ مشعلیں جل اُٹھیں ہوا میں

اک رقص جنوں ہُوا ہے جاری
یہ رقصِ جنوں نہ رُک سکے گا
یہ شمعِ نوا نہ بجھ سکے گی
یہ پرچمِ جاں نہ جھک سکے گا

چلو پھر ہم صف آرا ہوں

چلو ہم پھر صف آرا ہوں
صف آرا ہوں
کہ دشمن چار سُو آئے
کہ قاتل رُو برُو آئے
کہ ان کے کاسہ خالی ہیں
کچھ اپنا لہو آئے

کہ بجھ جائے ہر اک مشعل
تو ظلمت کوبکو آئے

کہ اہلِ صدق و ایماں بے سہارا ہوں
چلو ہم پھر صف آرا ہوں

صف آرا ہوں کہ پہلے بھی
ستم ایجاد آئے تھے
نشانِ ظلم اُٹھائے تھے
لہو سے تر بتر غنچہ
قباؤں میں چھپائے تھے
ہوس کی تند آندھی نے
دیے کیا کیا بجھائے تھے
جواب دستِ ستم اُٹھے
مثالِ سنگِ خارا ہوں
چلو ہم پھر صف آرا ہوں
صف آرا ہوں کہ پھر آئیں
تو قاتل سرنگوں جائیں
پشیمان و زبوں جائیں

گنوا کر اپنے جسم و جاں
بہا کر اپنا خوں جائیں
عدو سفّاک ارادوں سے
اگر آئیں تو یوں جائیں
کہ شرمندہ دوبارہ ہوں
چلو ہم پھر صف آرا ہوں

سپاہی

اور

موت

کردار:-

- زخمی سپاہی
- پہلا سپاہی
- دوسرا سپاہی
- موت

○

(ہوائی جہازوں کی بمباری۔ مورچے، لڑائی کا منظر۔ آہستہ آہستہ
کیمرہ ایک پہاڑ کی طرف رُخ پھیر لیتا ہے جہاں برف سے ڈھکی چوٹی
پر ایک زخمی سپاہی برف میں دبا پڑا ہے۔)

سپاہی ۔ کہاں ہوں۔
مرے جسم پر بوجھ کیسا ہے۔
کیا میں پہاڑوں کے نیچے دبا ہوں
مری سانس کیوں رُک رہی ہے
یہ ٹھنڈک رگ و پے میں کیوں ہے
مرے بازوؤں میں سکت ہے
نہ ہونٹوں میں جنبش کا یارا
نہ آنکھوں میں ہی روشنی ہے

چٹانوں کی صورت گرانبار پلکیں اُٹھانے سے عاری
تو کیا میری بینائی بھی جاچکی ہے؟
نہ چہرے، نہ منظر
نہ کوئی صدا ہے؟
یہ کیا ہے؟
مجھے اپنی آواز بھی اجنبی لگ رہی ہے
فقط دھند ہی دھند
اور برف کے بیکراں سائباں چار سُو ہیں
یہ سکرات کا پل ہے
یا مجھ پہ کابوس سایہ کناں ہے
...... یہ کیا؟
میرے بازو میں کیوں درد کی لہر اُٹھی
میں زندہ ہوں
لیکن
بدن برف میں دفن ہے
اور چہرہ مرا
زمہریری ہواؤں سے سُنّ ہو چکا ہے

کسی کو خبر تک نہ ہوگی
کہ میں اس پہاڑی کی چوٹی پہ زخموں سے چھلنی پڑا ہوں
کوئی مہرباں ہاتھ ..... ہمدرد بازو نہیں ہے
جو اس کرۂ مرگ سے مجھ کو باہر نکالے

نہ جانے بہادر رفیقوں کے دستے کہاں ہیں
تو کیا میں یہاں
کس مپرسی کے عالم میں دم توڑ دوں گا
تو کیا اس پہاڑی کی چوٹی پہ میرے تجسّس میں کوئی
نہ آئے گا
کوئی نہ آئے گا
کوئی ......
موت - مگر میں سپاہی
فقط میں - اجل - موت
ازل سے ابد تک
تری غمگسار اور ساتھی
اکیلے دکھی بے نواؤں کی واحد مسیحا

کہ جو زندگی کی جفاؤں سے تنگ آ چکے ہوں
کہ جو زندگی کی کڑی اور لمبی مسافت سے اُکتا چکے ہوں
کہ جو زندگی کے سرابوں سے،
پھیلے خرابوں سے گھبرا چکے ہوں
سبھی نامرادوں کو میں نے ہی آخر سہارا دیا ہے
جنھیں زندگی تج گئی ہو
انھیں صرف میں نے گوارا کیا ہے
ادھر آ..... مجھے ہاتھ دے
میں تری آخری چارہ گر ہوں
تری ہمسفر ہوں
تری راہبر ہوں (موت ہاتھ بڑھاتی ہے)
ادھر آ سپاہی ۔ مرے ساتھ چل
یہی وقت ہے
جبکہ تو اک چراغِ سحر کی طرح
رہگزارِ عدم کا مسافر ہے
آ تجھ کو اپنی حفاظت میں
اس برف کے تند طوفان سے لے چلوں میں

تجھے کیا خبر
کیسی قاتل ہواؤں کے جھکڑ
ہمارے تعاقب میں ہیں
اے سپاہی میرے ساتھ چل

(ہواؤں کا شور)

سپاہی - کون ہے تو —
اجل
فاحشہ!
تجھ کو کس نے پکارا کہ تو
بن بلائے یہاں آ گئی ہے
میں زندہ ہوں
میری نقاہت سے تو نے یہ سمجھا
کہ میں زندگی سے مفر چاہتا ہوں
مری غیر ہموار سانسوں سے تو نے یہ جانا
کہ میں نزع میں ہوں
پرے ہٹ مرے جسم سے اپنی پرچھائیں کو دور لے جا

موت - ترا جسم بے حس ہے

اور تیری آنکھوں پہ کہرا جما ہے
تجھے اس کا احساس بھی تو نہیں ہے
کہ تو صرف کہنے کو زندہ ہے
ورنہ اگر تو یہ دیکھے
کہ تیرا لہو کس قدر بہہ چکا ہے
اگر تو یہ دیکھے
کہ یہ لعل و یاقوت
جو تیرے پہلو میں بکھرے پڑے ہیں
ترے ہی لہو کی وہ بوندیں ہیں
جو برف پر جم گئی ہیں
تو جانے
کہ اب زندہ رہنے کی خواہش عبث ہے
چلو میں نے مانا
کہ تجھ میں ابھی زندگی کی رمق ہے
مگر کس قدر
صرف دو چار سانسوں کی مہلت
تری بے بسی اور نقاہت کا یہ حال ہے کہ

ترے زرد رخسار پر برف کی تہہ جمی ہے
مگر تجھ میں اتنی بھی ہمّت نہیں ہے
کہ چہرے سے اس کو کھرچ دے

. . . .

تیرے سامنے جو اندھیرے ہیں ان سے نہ ڈر
بے خبر
رات بھی دن سے کچھ مختلف تو نہیں ہے

سپاہی ۔ چلو میں نے مانا
مگر تو بتا مجھ سے کیا چاہتی ہے

موت ۔ زیادہ نہیں ۔
صرف اتنا کہ تو مان لے
زندگی اک مسلسل اذیّت ہے
تو جس سے تنگ آچکا ہے ۔

سپاہی ۔ تو . . . . .
تو یوں کہہ کہ میں تیرے آگے سپر ڈال دوں

موت ۔ کیوں نہیں
اور یہ الزام بھی خود پہ لینے کو راضی ہوں میں

سپاهی ۔ دور ہٹ فاحشہ!
زندگی سے مجھے پیار ہے

موت ۔ باؤلے!
اتنا پاگل نہ بن
تو جو مانے تو کیا
اور نہ مانے تو کیا
اب ترے سامنے دوسرا راستہ ہی نہیں
اپنے ہاتھوں کی پیلاہٹیں دیکھ لے
اپنے ہونٹوں کی نیلاہٹیں دیکھ لے
اپنی آنکھوں کی دھندلاہٹیں دیکھ لے
تو جو مانے تو کیا
اور نہ مانے تو کیا

سپاہی ۔ دشمنِ جاں!

موت ۔ ضد نہ کر دیکھ
اب تیری منزل
تری رات ہر لمحہ نزدیک تر آرہی ہے
تری ضد

تیری بیچارگی
کرب و اندوہ کو طول دے گی
جانکنی زندگی تو نہیں
چل میرے ساتھ چل
زندگی کے کڑے مرحلے بھول کر
چل —

سپاہی - نہیں - میں نہیں جاؤں گا
میں ترے ساتھ ہرگز نہیں جاؤں گا

موت - اپنا دشمن نہ بن
تیرے پیکر میں تیرا لہو منجمد ہو رہا ہے
ترا یخ زدہ جسم
طوفان کی یورشوں سے نہیں بچ سکے گا
ادھر آ تجھے اپنا آنچل اوڑھا دوں
جو تجھ کو قیامت تلک گرم رکھے گا
او ناسمجھ نوجواں
میرے سینے کی حدّت
ترے یخ زدہ جسم کو

سرمدی امن بخشے گی
آ تجھ کو اپنے گلے سے لگا لوں۔
یقیں کر!
کہ تو کہ بنا کی کی   سے نالہ کناں ہے
تری بے کسی اور فرماں پذیری
مجھے حوصلہ دے رہی ہے

سپاهی ۔ فریبی!
مجھے اپنی حیلہ گری اور مکاریوں سے
تہہِ دام لانے کی کوشش نہ کر
کذب گو
میں تو سردی کی شدّت سے بیکل ہوں
تجھ سے تو خائف نہیں۔

موت ۔ خواہ آنسو خوشی کے ہوں یا کرب کے
ایک ہی بات ہے
بے خبر!
شام ڈھلنے کو ہے
اور میدان میں

شب کی پرچھائیاں خیمہ زن ہو رہی ہیں
کسے کیا خبر ہے
کہ تو
اس پہاڑی پہ گھائل پڑا ہے
تری کھوج پہلے تو مشکل ہے
اور اتفاقاً اگر تیرے ساتھی
تجھے ڈھونڈ بھی لیں
تو حاصل؟
تجھے کیا سکوں مل سکے گا؟
اگر تو کوئی روز تک اور زندہ رہا بھی تو کیا
پھر سے دنیا کے دُکھ
زندگانی کے جھنجال تیرا تعاقب کریں گے
تری بہتری ہے اسی میں
کہ بے حیل و حجّت
یہاں پُر سکوں موت مر جا

سپاہی ۔ ریا کار!
تو اپنی عیّاریوں سے مجھے دام میں پھانسنا چاہتی ہے۔

میں زندہ رہا ہوں
میں زندہ ہوں
زندہ رہوں گا
مجھے تو ہراساں نہیں کر سکے گی
ابھی مجھ کو جینا ہے

موت۔ گر تو جیا بھی تو پھر کیا؟
تجھے زندگانی کے بارے میں خوش فہمیاں ہیں
اگر تو جیا بھی
تو کیا تو سمجھتا ہے
اس زندگی سے محبّت کرے گا
جو کھٹھرن ہے ذلّت ہے بیچارگی ہے
ذرا سوچ اے بے خبر
زندگی بسترِ گُل نہیں
پھر ذرا سوچ

سپاهی۔ کیا سوچنا
میں تو ہستی کے ہر زیر و بم سے ہوں واقف
مگر تو بھلائے ہوُئے ہے

کہ یہ جنگ ہے

موت - باؤلے!

میں نے مانا کہ تو جنگ میں

سرخرو ہو چکا ہے

وطن کی حفاظت کا حق

جان پر کھیل کر تو ادا کر چکا ہے

مگر تجھ کو اک مرتبہ اپنے گھر اور عزیزوں کے دکھ پھر سے تڑپائیں گے

سب زمانے کے غم تجھ کو کھا جائیں گے

سپاہی - جبھی تو مجھے اس قدر بے کلی ہے

کہ میں حملہ آور غنیموں کو جلدی ٹھکانے لگا لوں

تو پھر گھر کو جاؤں

مرے گھر کی دہلیز ہر دم مری منتظر ہے

موت - بجا ہے

اگر گھر ترا منتظر ہو

اگر تیرے گھر کے در و بام باقی رہے ہوں؟

اگر صرف اینٹوں کے انبار اور راکھ کے ڈھیر گھر ہیں

تو پھر وہ ترے منتظر ہیں

(قہقہہ)

کھنڈر چار جانب کھنڈر ہیں

سپاھی ۔ تو پھر کیا

مرے بازوؤں میں توانائی ہے

میرے کندھوں سے بندوق اُترے تو پھر میرے بازو

کدالوں کے اور بیلچوں کے رفیقِ سفر ہیں

سپاہی خرابوں کو تعمیر کرتا رہا ہے

موت ۔ زمیں جل چکی ہے ۔

سپاھی ۔ میں پہلے بھی ویران خطّوں کو زرخیزیاں دے
چکا ہوں

موت ۔ مگر اب یہ ممکن نہیں ہے

کہ پانی کے چشمے ۔ کنویں اور نہریں

بموں کی لگاتار بارش سے اب خشک اور بے نشاں

ہو چکے ہیں

درانتی ۔ ہتھوڑے ۔ سلاخیں ۔ کدالوں کے پھل اور

ہل - گویا سب تیرے اوزار - ہتھیار تڑمڑ چکے ہیں

سپاهی - مگر نا بجے

میں سپاہی ہوں
گر بخت نے یاوری کی
اور اک بار میرے قدم
اپنے شہروں میں پہنچے
تو پھر سے
یہ مسمار گھر
منہدم کارخانے
جلی کھیتیاں
اور خاموش بازار
یوں جی اُٹھیں گے
کہ جیسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا

موت - بجا
پر یہ اُس وقت ممکن ہے

سپاهی - لیکن .....

موت - ٹھہر تو مری بات سُن

یہ تو اُس وقت ممکن ہے جب

تیرے بازو سلامت ہوں اور جسم کا کوئی حصہ نہ بیکار ہو

مگر ایسے عالم میں بھی

تیری خوش فہمیاں تجھ کو بہکا رہی ہیں

ہلاکت کی آندھی ترے جسم کا ریزہ ریزہ اُڑا نے کو پر

تولتی ہے

ابھی وقت ہے سوچ لے۔

سپاہی ۔ (ٹھنڈی آہ بھرتے ہُوئے اپنے آپ سے) تو کیا کوئی

قوت بھی ایسی نہیں ہے

کہ جو موت کے زعم و پندار کو چُور کر دے

کوئی ایسی صورت نہیں

جس سے میں قلعۂ مرگ کو منہدم کر سکوں

نہیں ..... آج تک موت پر کس کو قدرت ملی

اگر یونہی ہوتا رہا ہے

تو پھر کیوں نہ میں خود کو اس کے حوالے ہی کر دوں

کشاکش کا حاصل؟

فقط نزع کا طول — اور پھر

ہزیمت شکستِ نفس
(موت کی طرف دیکھتے ہوئے)

موت!
میں صرف اک شرط پر زندگی کی متاعِ گراں تیرے قبضے میں
دینے کو تیار ہوں

موت۔ شرط!
(قہقہہ لگاتی ہے)
بھلا موت سے بھی کسی نے کوئی شرط منوائی ہے؟

سپاہی۔ جانتا ہوں کہ میں
دوسروں سے کسی طرح بہتر نہیں ہوں
اگر آج تک کوئی تجھ سے نہ جیتا
تو مجھ کو بھی مرنے میں پھر عذر کیوں ہو
مگر دشمنِ زندگی
صرف اک شرط پر

موت۔ کونسی شرط۔

سپاہی۔ بس یہ کہ جب جنگ کا خاتمہ ہو تو اک روز کے واسطے
تو مجھے چھوڑ دے گی

بس اک روز کے واسطے
تاکہ میں اپنے غازی رفیقوں کی صف میں کھڑا،
فتح کے گیت گاؤں
ظفرمند پرچم کھلے تو
سلامی کی تقریب میں
دوسرے جانثاروں کے ہمراہ میں بھی کھڑا ہوں
مرے کان بھی یومِ نصرت کی توپوں کی گونجار سے گونج اُٹھیں گے
اور اس وقت
جب فتح و نصرت کے نغمات سے
سرزمینِ وطن کی فضا رقص میں ہو
میں عجلت سے گھر جا کے دیکھوں
وہ محبوب چہرے
جو میرے لیے اپنی آنکھوں میں خوشیوں کے آنسو تو
ہاتھوں میں پھولوں کے کنٹھے لیے راستوں پر مرے منتظر ہوں
مرے گاؤں والے
مرے یار احباب مجھ کو

ظفرمند پرچم کی مانند اُٹھالیں ۔۔۔۔۔

اور میں

ان کے اس خیر مقدم کو

مغرور آنکھوں کی چپ مسکراہٹ سے دیکھوں

فقط اس قدر

اے مری مسکراہٹ کی دشمن !

موت ۔ [illegible] اعتنا ہے

سپاھی ۔ تو پھر بیسوا !

"دور ہو ۔ میں سپاہی ہوں

اور زندگی کی چمکتی دمکتی ہوئی آگ میرے بدن

میں ابھی ہے

میں زندہ ہوں اور زندہ رہوں گا

موت ۔ مگر کب تلک

سپاھی ۔ جب تلک میری آواز میں زندگی کی لپک ہے

مرا دل دھڑکتا رہے گا

موت ۔ مگر تا بکے ۔

سپاھی ۔ تابکے؟

جب تلک یہ مرا زخم زدہ جسم ان آسمانوں کی مانند نیلا
نہ ہو جائے

میں فلۂ کوہ پر
اس پہاڑی کی چوٹی پہ دم توڑ دوں گا
مگر تیرے آگے نہ ہرگز جھکوں گا
یہ ممکن نہیں ہے
کہ میں تیرے آگے سپر ڈال دوں

موت ۔ حوصلہ! حوصلہ!

اے سپاہی یہ جذباتیت بے اثر اور عبث ہے
اگر مجھ سے تُو ہار تسلیم کر لے
تو یہ زندگی کے اُسی ضابطے ہی کی تائید ہوگی
جو روزِ ازل سے ابد تک رہا ہے
رہے گا
نہ اس سے زیادہ نہ کمتر
نہ اس سے زیادہ نہ کمتر

(قدموں کی چاپ سنائی دینے لگتی ہے۔
کچھ دور سپاہیوں کے چہرے جن میں
سے ایک کے کندھے پر برف ہٹانے والی
کدال اور دوسرے کے کندھے پر نمکین
سٹیچر دھرا ہے۔)

سپاہی ۔ ٹھہر!
مرے ہی رفیقوں کے قدموں کی مانوس آواز میری طرف
بڑھ رہی ہے عجب کیا کہ یہ زخمیوں کے تجسس میں ہی
آرہے ہوں

موت ۔ کہاں بے وقوف

سپاہی ۔ اس طرف

موت ۔ (دیوانہ وار ہنستی ہے ــــ قدموں کی چاپ قریب تر
آجاتی ہے)
باؤلے یہ جماعت تو وہ ہے جو لاشیں ٹھکانے لگاتی ہے
سُن تو!

(کدالوں اور بیلچوں کے کھڑکنے کی آواز)

یہ تیرے دورماں نہیں گورکن ہیں

سپاھی ۔ وہ کچھ بھی ہوں زندہ تو ہیں اور زندوں کے دشمن نہیں

یہ مرے شیر دل ہموطن ہیں

(کیمرہ بلندی سے گھاٹی پہ مرکوز ہوتا ہے)

پہلا سپاھی ۔ بہت تھک گئے

اس پہاڑی پہ چڑھنا غضب تھا۔

دوسرا سپاھی ۔ یہاں چند سانسوں کو ستانے کے بعد آگے بڑھیں گے

کہ اب اور چلنے کی طاقت نہیں ہے

پہلا سپاھی ۔ تھکن سے مری ہڈیاں

ریزہ ریزہ ہوئی جا رہی ہیں

پہلا ۔ تیرے پاس کھانے کو ہے کچھ؟

دوسرا - کہاں - چند سگریٹ بچے ہیں - اگر تم .....

پہلا - غنیمت ہے یہ بھی - قیامت کی سردی ہے

دوسرا - چائے پیوگے ؟ اُبلتی ہُوئی گرم چائے پہ بالائی کی تہہ جمی ہوتی تو کیسی رہے گی -

پہلا - چلو اک پیالہ - نہیں دو سہی

دوسرا - یہاں کون زخمی ملے گا ؟

(دونوں ہنستے ہیں)

پہلا - تصوّر کی جادوگری خوب ہے

دوسرا - ہاں خیالی پلاؤ کی خوشبو سے بھی کچھ تسلّی ہُوئی ہے

(سپاہی کے کراہنے کی آواز آتی ہے)

سپاهی - میں زندہ ہوں - زندہ ہوں

اس بدنفس کو مرے سامنے سے ہٹاؤ

یہ ظالم چڑیل

اپنے بازو پسارے
نا معلوم کب سے مری گھات میں ہے
میں زندہ ہوں
زندہ ہوں
مجھ کو بچا لو

پہلا سپاہی ۔ سنو جیسے کوئی یہیں پاس ہی ہو
دوسرا سپاہی ۔ تیرا واہمہ ہے ۔ یہاں کون ہوگا
سپاہی ۔ میرے پاس آؤ رفیقو
میرے سر پر یہ بے حیا گدھ کی مانند منڈلا رہی ہے
پہلا سپاہی ۔ سنی تم نے آواز
دوسرا سپاہی ۔ ہاں وہ ...... ادھر ۔ برف میں
دفن لاشہ

پہلا سپاہی ۔ چلو ۔ بیلچہ لو ۔ وہ زندہ ہے
دوسرا سپاہی ۔ حیرت
اگر اس جگہ لاش ہوتی تو میں اتنا حیراں نہ ہوتا

مگر ایک زندہ سپاہی
یہاں معجزہ ہے

پہلا سپاہی ۔ تو جلدی کرو ۔ رات ہونے کو ہے

(دونوں سپاہی زخمی سپاہی
کے قریب آجاتے ہیں)

دوسرا سپاہی ۔ (چھوتے ہوئے) واقعی اس میں جاں ہے ابھی

سنو تم میں اتنی سکت ہے
کہ اس کو اٹھا کر ہم اپنے ٹھکانے تلک جاسکیں

پہلا سپاہی ۔ اگرچہ تھکن سے مری ہڈیاں کڑکڑانے لگی ہیں

مگر اس سپاہی کو دستِ اجل سے بچانا مقدّم ہے
آؤ اسے ہاتھ دیں ۔

دوسرا سپاہی ۔ اچھا ہوا ہم ادھر آگئے

ورنہ اس بادو باراں کے طوفاں میں زخموں سے گھائل
مجاہد کبھی بچ نہ سکتا
شہیدوں کی فہرست میں یہ بھی ہوتا۔

پہلا سپاھی ۔ بس اب وقت ضائع نہ ہو
بیلچے سے تہیں برف کی تم ہٹاؤ
میں اتنے میں کوئی دوا دیکھتا ہوں

دوسرا سپاہی ۔ خدایا — ! ذرا اس کے یخ جسم کو چھو کے دیکھو

پہلا سپاہی ۔ نا معلوم یہ اب تلک کیسے زندہ بچا ہے

موت ۔ (اپنے آپ سے) یہ کچھ بھی کریں ۔ میرے چنگل سے اس کو نہیں چھین سکتے
یہ نخچیر میرا ہے ۔ میں اس کو جانے نہ دوں گی
یہ ہمدرد
دو چار سانسوں کے ساتھی
اسے راہ میں پھینک جائیں گے یا خود بھی بھوک اور تھکن ہی سے دم توڑ دیں گے

میں ان کا تعاقب کروں گی
میں ان کا تعاقب کروں گی
یہ نخچیر میرا ہے
میرا ہے
میرا ہے

(دونوں سپاہی ادھر اُدھر سے برف
ہٹاتے ہیں اور زخمی سپاہی کو اُٹھا کر
کندھے پر ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں
ہوا کا شور اور برف باری کی شدّت
بڑھ جاتی ہے۔)

پہلا سپاہی۔ ذرا ہاتھ دو تا کہ میں اس کو کندھے پر آرام
سے ڈال لوں
سپاہی کا ہمدرد ساتھی سپاہی ہی ہوتا ہے۔ آؤ ذرا
تم ادھر سے

(زخمی سپاہی کراہتا ہے)

زخمی سپاہی ۔ میرے ساتھیو! تم کو تکلیف ہوگی

یہ رستہ اندھیرا ہے اور پُر خطر ہے

ذرا دیکھ کر......

میرا کیا ہے کہ میں تو

فقط چند سانسوں کا مہمان ہوں......

پر تمھارے لیے زندگی کے مہ و سال کی بے کراں

وادیاں ہیں

پہلا سپاہی ۔ نہیں تم سلامت رہو گے ۔ ہمارے

وطن کے سپاہی

تم اب زندگانی کی محفوظ رہ میں قدم رکھ چکے ہو

(چلنے لگتے ہیں)

زخمی سپاہی ۔ مگر ظلمتوں سے سبھی راستے ڈھک چکے ہیں

یہ گھاٹی نہایت خطرناک ہے

اپنی جانیں میری زندگی کے لیے مت گنواؤ

دوسرا سپاہی - یہی زندگی ہے سپاہی ہمیشہ سپاہی ہی رہتا ہے

اس کے لیے ہی خطرناک رستے بنے ہیں
ہماری مسرّت یہی ہے
کہ ہم تم کو زندہ سلامت - گجر دم وہاں لے چلیں
جس جگہ اس مقدس زمینِ وطن کے زن و مرد -
پیر و جواں
یومِ نصرت کے موقع پر غازی سپوتوں کو
فخر و عقیدت سے دیکھیں گے -
توپوں کی گونج ہیں ان بہادر جوانوں پہ
تکریم کے پھول برسیں گے
جو جنگ سے سرخرو ہو کے آئے

زخمی سپاہی -- میرے واسطے اس سے بڑھ کر کوئی بھی تمنّا نہیں ہے

کہ میں بھی وہاں ہوں

مگر دوستو

چند لمحے تو سستا بھی لو ـــ تم بہت تھک

چکے ہو

پہلا سپاہی ۔ تھکن؟

تم ہماری نہ پروا کرو

ایک بے جان لاشے کو دو گام بھی کھینچنا سخت اذیّت

ہے

پر ایک زندہ سپاہی کو کندھوں پر ڈالے اگر سینکڑوں

میل کا بھی سفر ہو تو کچھ بھی نہیں۔

دوسرا سپاہی ۔ اور سپاہی اگر یوں تھکے تو سپاہی نہیں

پہلا سپاہی ۔ ہوائیں بہت سرد ہیں اور تمھارے ٹھٹھرتے

ہُوئے ہاتھ ....اُف کس قدر زخم زدہ ہیں

یہ دستانے لو ـــ میرے ہاتھوں میں کافی حرارت ہے

زخمی سپاہی ۔ لیکن ۔

دوسرا سپاہی ۔ سنو! یہ تکلّف کا موقع نہیں

پہلا سپاھی - بس یہ ڈھلوان اب ختم ہونے کو ہے
اور ہم اپنی منزل کے نزدیک تر آچکے ہیں -

موت - یہ مخلوق کیسی ہے
اک دوسرے سے انھیں کس قدر اُنس ہے
یہ مجھے مات دے کر
"اُسے"
میرے نخچیر کو
مجھ سے چھیننے لیے جا رہے ہیں
یہ کیسے سپاہی ہیں کتنے نڈر ہیں
کہ میں تھک گئی
اور یہ جا رہے ہیں
مجھے مات دے کر
مجھے مات دے کر
مجھے مات دے کر

(موت منہ کے بل گر پڑتی ہے)

خیال: ترادو وسکی

شہدائے جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء
کے نام

تم نے جس دن کے لیے اپنے جگر چاک کیے
سو برس بعد سہی دن تو وہ آیا آخر

تم نے جس دشتِ تمنّا کو لہو سے سینچا
ہم نے اس کو گل و گلزار بنایا آخر

نسل در نسل رہی جہدِ مسلسل کی تڑپ
ایک اک بوند نے طوفان اُٹھایا آخر

تم نے اک ضرب لگائی تھی حصارِ شب پر
ہم نے ہر ظلم کی دیوار کو ڈھایا آخر

وقت تاریک خرابوں کا وہ عفریت ہے جو
ہر گھڑی تازہ چراغوں کا لہو پیتا ہے

زلفِ آزادی کے ہر تار سے زلفِ ایام
حریت کیش جوانوں کے کفن سیتا ہے

تم سے جس دورِ المناک کا آغاز ہُوا
ہم پہ وہ عہدِ ستم ایک صدی بیتا ہے

تم نے جو جنگ لڑی ننگِ وطن کی خاطر
مانا اس جنگ میں تم ہارے عدو جیتا ہے

لیکن اے جذبِ مقدّس کے شہیدانِ عظیم
کل کی ہار اپنے لیے جیت کی تمہید بنی

ہم صلیبوں پہ چڑھے زندہ گڑے پھر بھی بڑھے
وادیٔ مرگ بھی منزل گہہِ اُمّید بنی

ہاتھ کٹتے رہے پر مشعلیں تابندہ رہیں
رسم جو تم سے چلی باعثِ تقلید بنی

شب کے سفّاک خداؤں کو خبر ہو کہ نہ ہو
جو کرن قتل ہوئی شعلۂ خورشید بنی

—— تمام ——

دیکھنا یہ ہے

آج اغیار کے تیروں سے بدن پر میرے
پھر وہی زخم چمکتے ہیں ستاروں کی طرح
پھر اسی دشمنِ جاں دشمنِ دیں کے ہاتھوں
پیرا ملبوس ہے گلرنگ بہاروں کی طرح
پھر مرے دیس کی مٹی سے لہو رِستا ہے
پھر در و بام ہوئے سینہ فگاروں کی طرح

میرے دشمن، میرے قاتل نے ہمیشہ کی طرح
پھر سے چاہا کہ شکستِ مرا پندار کرے
جس طرح رات کا سفّاک شکاری چاہے
کہ وہ سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرے
یا چراغِ سرِ دیوار کو تنہا پا کر
جس طرح تند تند ہوا ٹوٹ کے یلغار کرے

میرے دشمن نے یہ سوچا ہی نہیں تھا شاید
یہ دیا بادِ فنا سے بھی بھڑک سکتا ہے
اس کو قوت پہ تکبّر ہے مگر مجھ کو یقیں
دستِ حق بازوئے قاتل کو جھٹک سکتا ہے
میرے جلّاد کو معلوم نہیں ہے شاید
میرا دل دستِ اجل میں بھی دھڑک سکتا ہے

جانے کس زعم میں آیا تھا مقابل میرے
وہ اندھیروں کا پجاری وہ اُجالے کا عدو
اس نے اک مشعلِ تاباں کو بجھانا چاہا!
اور فضا میں لپک اُٹھے ہیں کروڑوں بازو
میرا مشرق ہو کہ مغرب، میرے سارے اطراف
میری قوت، میرا پیکر، میری جاں میرا لہو

دیکھنا یہ ہے کہ اس باطل و حق کے رَن میں
رات مرتی ہے کہ زنجیرِ سحر ہوتی ہے
آخری فتح مری ہے میرا ایمان ہے یہ
جس طرح ڈوبنے سورج کو خبر ہوتی ہے
میں تو سو بار اسے اپنا مقدّر کر لوں
جس شہادت سے مری ذات امر ہوتی ہے

ترانہ

دائم آباد تیری حسیں انجمن
اے وطن — اے وطن

تیرے کھیتوں کا سونا سلامت رہے
تیرے شہروں کا سکھ تا قیامت رہے
تا قیامت رہے یہ بہارِ چمن
اے وطن — اے وطن

تیری آباد گلیاں مہکتی رہیں
تیری راہیں فضائیں چمکتی رہیں
مسکراتے رہیں تیرے کوہ و دمن

اے وطن — اے وطن

تیرے بیٹے تری آبرو کے لیے
یوں جلائیں گے اپنے لہو کے دِیے
پھوٹ نکلے گی تاریکیوں سے کِرن

اے وطن — اے وطن
دائم آباد تیری حسیں انجمن

میری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ

۱۷ر دسمبر ۶۷۲

آج کے دن
مرا چہرہ مری آنکھیں لاؤ
کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں
تو رو دیتا ہوں

وہی آنکھیں
جو گئے سال گئی تھیں تو نہ واپس آئیں
جو سرافراز ہی لوٹی ہیں نہ بے بس آئیں

وہی چہرہ
جو شفق بن کے کھِلا تھا
نہ بنا صبح کا سورج
نہ مری شام کا پیوند ہُوا
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگار سا چہرہ لاؤ
کہ مرے ہاتھ مرا دل
مرے بازو مرے ارماں
مرا سارا پیکر
خود کو پہچان سکے
وہ جو بھونچال کل آیا تھا
جو گزری تھی قیامت
اسے نیرنگِ نظر جان سکے

میں ابھی زندہ ہوں
موجود ہوں
یہ میری انا مان سکے
آج کے دن ہی گئے تھے
میرے ساتھی
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگارہ سا چہرہ لے کر
ان اندھیروں کے سمندر کی طرف
جہاں مرتی ہوئی شمعوں کی ضیا چیختی تھی
جہاں نفرت سے حقارت سے
ہر اک موجِ بلا چیختی تھی
کشتیاں کرب سے کُرلاتی تھیں
ساحل کی ہوا چیختی تھی

مجھ کو معلوم تھا

بے جان ہیں رجز کے نغمے

میرے لفظوں میں فنا چیختی تھی

اب نئے سال کی تقویم کا پہلا دن ہے

اور مرے پاس نہ شعلہ بھری آنکھیں ہیں

نہ کہ انگار سا چہرہ کہ ہے کہ میں

اپنے یاروں سے کہوں

تم تہِ دام سسکتے ہو

کہ ہم بھی سرِ شاخِ چمن

دل گرفتہ ہیں کہ

یارانِ صبا کب آئیں

ہم بھی ہر پھول کو ہر خار کو

سینوں سے لگائیں

گلُ و گلشن کو سجائیں
وہ جوانانِ چمن جب آئیں
نئی تقویم کے اوراق چمک اُٹھیں
اور آئینوں میں
عکس بچھڑے ہوئے یاروں کے نظر سب آئیں

اے اسیرانِ عدو!
تم تو اس دیس کی مٹی ہو کہ جو
جس قفس میں بھی ہو
زنداں کی فضا مہکے گی
اب اسیری کے نامعلوم زمانوں کو مقدّر کر لو
کون جانے کہ کب
آزردہ پرندوں کی زباں
چہکے گی!

جانے کس روز مرے شہر کو لوٹے گی:۔
وہ غربت کی بہار
جس میں فصلِ گل و لالہ
نئی شمعوں کی طرح لہکے گی
اور فضا اس طرح دہکے گی
کہ محشر میں جہنم جیسے
ہر طرف آگ کے دریاؤں میں
شعلوں کا تلاطم جیسے
میری تقویم کے نوروز
پھر اٹھیں گے
مرے زخم کا پرچم
مری شعلہ بھری آنکھیں
مرا انگار سا چہرہ لے کر

سرِ میدانِ وفا تم جیسے
آج لیکن مری مانند
ہر اک صحن
ہر اک کھیت
ہر اک راہ میں
مفلوج ادھورا پیکر
چیختا ہے
مری آنکھیں مرا چہرہ لاؤ
کہ میں آئینوں کو تکتا ہوں
تو رو دیتا ہوں

یہ کھیت یہ کھلیان

یہ کھیت ہمارے ہیں یہ کھلیان ہمارے
پُورے ہُوئے اِک عمر کے ارمان ہمارے
ہم وہ جو کڑی دھوپ میں جسموں کو جلائیں
ہم وہ ہیں کہ صحراؤں کو گلزار بنائیں
ہم اپنا لہو خاک کے تودوں کو پلائیں
اس پر بھی گھروندے رہے ویران ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

ہم روشنی لائے تھے لہو اپنا جلا کر
ہم پھول اُگاتے تھے پسینے میں نہا کر
لے جاتا مگر اور کوئی فصل اُٹھا کر
رہتے تھے ہمیشہ تہی داماں ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

اب دیس کی دولت نہیں جاگیر کسی کی
اب ہاتھ کسی کے نہیں تقدیر کسی کی
پاؤں میں کسی کے نہیں زنجیر کسی کی
بھولے گی نہ دنیا کبھی احسان ہمارے
یہ کھیت ہمارے ہیں، یہ کھلیان ہمارے

سید الشہداء

دشتِ غربت میں صداقت کے تحفظ کے لیے
تُو نے جاں دے کے زمانے کو ضیا بخشی تھی
ظلم کی وادیٔ خوں میں قدم رکھا تھا
حق پرستوں کو شہادت کی ادا بخشی تھی
آتشِ دہر کو گلزار بنایا تو نے
تو نے انساں کی عظمت کو بقا بخشی تھی

اور وہ آگ وہ ظلمت وہ ستم کے پرچم
بڑے ایثار ترے عزم سے شرمندہ ہُوئے
جرأت و شوق و صداقت کی نواز نخ کے باب
تری عظمت، ترے کردار سے تابندہ ہُوئے
ہو گیا نذرِ فنا دبدبۂ شمر و یزید
کشتگانِ رہِ حق مر کے مگر زندہ ہُوئے

لیکن اے سیّدِ کونین حسینؑ ابنِ علیؑ
آج پھر دہر میں باطل کی صف آرائی ہے
آج پھر حق کے پرستاروں کا انعام ہے دار
زندگی پھر اسی وادی میں اُتر آئی ہے
آج پھر مدِّ مقابل ہیں کئی شمر و یزید
صدق نے جن کو مٹانے کی قسم کھائی ہے

دل کہ ہر سال ترے غم میں لہو روتے ہیں
یہ اسی عہدِ جنوں کیش کی تجدید تو ہے
جاں بکف حلقۂ اعدا میں جو دیوانے ہیں
ان کا مذہب ترے کردار کی تقلید تو ہے
جب سے اب تک اسی زنجیرِ وفا کا رشتہ
بیعتِ دستِ جفا کار کی تردید تو ہے

ترانہ

لبوں پہ اہلِ امن کے

لہو ترنگ ہی سہی

عدو سے جنگ ہی سہی

چلو کہ دشمنوں کا یہ گھمنڈ

توڑ دیں

جو ہاتھ ہم پہ ظلم کا اُٹھے

اُسے مروڑ دیں

غنیم پر یہ عرصۂ حیات

تنگ ہی سہی

عدو سے جنگ ہی سہی

جنگ ہی سہی

کہاں گیا ہے تو

مرے دیارِ پاک کو پکار کر

جو حوصلہ ہے کچھ تو سامنے سے وار کر

اگر جواب خشت سنگ ہے

تو سنگ ہی سہی

عدو سے جنگ ہی سہی

جنگ ہی سہی

نہ چاہتے تھے ہم مگر

یہ امتحاں بھی ہو چلے

کہاں ہے لشکرِ ستم
کہ آ گئے ہیں منچلے
اسی کی خاک اسی کے خون سے
لالہ رنگ ہی سہی
عدو سے جنگ ہی سہی

ترانہ

اِن چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو
درد کی راتوں کو ڈھلنا ہے ہوا جیسی ہو
شوق کی آگ کو مدھم نہ کرو دیوانو
اپنی آواز کی لَو کم نہ کرو دیوانو
پھر سے سورج کو نِکلنا ہے گھٹا جیسی ہو
ان چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو

یہی مٹی تھی تمہیں جان سے بڑھ کر پیاری
آج اسی خاک سے اک چشمۂ خوں ہے جاری
راہ کتنی ہو کڑی رات ہو کتنی بھاری
ہم نے اس دشت میں چلنا ہے فنا جیسی ہو
ان چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو

اپنے زخموں کو سجائے ہوئے تاروں کی طرح
پرچمِ جاں کو لیے سینہ فگاروں کی طرح
اِس بیاباں سے گزرنا ہے بہاروں کی طرح
ان چراغوں کو تو جلنا ہے ہوا جیسی ہو
درد کی رات کو ڈھلنا ہے فضا جیسی ہو

ترانہ

اے وطن
جگ جگ جیے تو
اے وطن — اے وطن
تو مری جان مرا دل مرا لہو
میرا بدن — اے وطن
تیرے آئینے بھی سورج تیرے کانٹے بھی گلاب
تیرے ویرانے بھی جنّت کی فضاؤں کا جواب

تو نے بخشا زندگی کو زندگی کا بانکپن

اے وطن

اے وطن جگ جگ جیے تو

اے وطن

تو کسی کا خواب بھی ہے خواب کی تعبیر بھی

تو مرا نغمہ، مرا پرچم، مری شمشیر بھی

رنگ و خوشبو سے گل و گلزار تیرا پیراہن

اے وطن

تیرے دریاؤں سے نغموں کی کھنک آتی رہے

تیرے کہساروں سے پھولوں کی مہک آتی رہے

تیرے پتھّر بھی ہیں موتی تیرے صحرا بھی چمن

اے وطن

اے وطن جگ جگ جیے تو

اے وطن۔ اے وطن

ترانہ

مرا بدن لہو لہو

مرا وطن لہو لہو

مگر عظیم تر — مگر عظیم

یہ ارض پاک ہو گئی

اسی لہو سے

سرخرو

وطن کی خاک ہو گئی

مرا بدن لہو لہو
بجھا جو اک دیا یہاں
تو روشنی کے کارواں
رواں دواں رواں دواں
وفا کی مشعلیں لیے نکل پڑے
یہ سر فروش جاں نثار چل پڑے
یہاں تلک کہ ظلم کی
فصیل چاک ہو گئی
عظیم تر یہ ارضِ پاک ہو گئی

مرا بدن لہو لہو
غنیم کس گماں میں تھا
کہ اس نے وار کر دیا
اسے خبر نہ تھی ذرا

کہ جب کبھی ہم بڑھے
تو پھر رُکے نہیں
یہ سر اُٹھے تو کٹ گرے
مگر جھکے نہیں
اسی ادا سے رزم گاہ تابناک ہوگئی
عظیم تر یہ ارضِ پاک ہوگئی

مرا بدن لہو لہو
مرا وطن لہو لہو
ہر ایک زخم فتح کا نشان ہے
وہی تو میری آبرو ہے آن ہے
جو زندگی وطن کی راہ میں ہلاک ہوگئی

تیرے بعد

پھول روتے ہیں کہ آئی نہ صدا تیرے بعد
غرقۂ خوں تھی بہاروں کی ردا تیرے بعد

آندھیاں خاک اُڑاتی ہیں سرِ صحنِ چمن
لالہ و گل ہوئے شاخوں سے جُدا تیرے بعد

جاہ و منصب کے طلبگاروں نے یوں ہاتھ بڑھائے
کوئی دامن بھی سلامت نہ رہا تیرے بعد

جن کو اندازِ جنوں تونے سکھائے تھے کبھی
وہی دیوانے ہیں زنجیر بپا تیرے بعد

کس سے آلامِ زمانہ کی شکایت کرتے
واقفِ حال کوئی بھی تو نہ تھا تیرے بعد

اب پکاریں تو کسے، زخم دکھائیں تو کسے
ہم سے آشفتہ سر و شعلہ نوا تیرے بعد

پھر بھی مایوس نہیں آج ترے دیوانے
گو ہر اک آنکھ ہے محرومِ ضیا تیرے بعد

راستے سخت کٹھن منزلیں دشوار سہی!
گامزن پھر بھی رہے آبلہ پا تیرے بعد

جب کبھی ظلمتِ حالاتِ قضا پر برسی
مشعلِ راہ بنی تیری صدا تیرے بعد

آج پھر اہلِ وطن انجم و خورشید بکف
ہیں رواں تیری دکھائی ہوئی منزل کی طرف

سبھی شریکِ سفر ہیں

یہ مملکت تو سبھی کی ہے خواب سب کا ہے
یہاں یہ قافلۂ رنگ و بُو اگر ٹھہرے
تو حسنِ خیمۂ برگِ گلاب سب کا ہے
یہاں خزاں کے بگولے اُٹھیں تو ہم نفسو!
چراغ سب کے بُجھیں گے عذاب سب کا ہے

ہمیں خبر ہے کہ جنگاہ جب پُکارتی ہے
تو غازیانِ وطن ہی فقط نہیں جاتے
تمام قوم ہی لشکر کا روپ دھارتی ہے
محاذِ جنگ پہ مردانِ حُر تو شہروں میں
تمام خلق بدن پر زرہ سنوارتی ہے

ملوں میں چہرۂ مزدور تمتماتا ہے
تو کھیتوں میں کساں اور خون بھرتے ہیں
وطن پہ جب بھی کوئی سخت وقت آتا ہے
تو شاعرانِ دل افگار کا غیور قلم
مجاہدانِ جری کے رجز سناتا ہے

چلیں گے ساتھ سبھی کیمیا سبھی ہوں گے
اور اب جو آگ لگی ہے مرے دیاروں میں
تو اس بلا سے نبرد آزما سبھی ہوں گے
سپاہیوں کے علم ہوں کہ شاعروں کے قلم
مرے وطن تیرے درد آشنا سبھی ہوں گے

کب تک فگارِ دل کو تو آنکھوں کو نم کریں
آؤ حکایتِ شبِ ہجراں رقم کریں

رندو اُٹھاؤ جام کہ بس ہو چکی بہت
تا چند پاسِ بیعتِ شیخِ حرم کریں

زخموں سے چور زخم بنائیں نشانِ راہ
جو ہاتھ کٹ چکے ہیں اِنھیں کو عَلم کریں!

آنکھوں کے طاقچوں میں جلا کر چراغِ دل
خونِ جگر ودیعتِ لوح و قلم کریں

تا چند جشنِ مرگ رفیقاں منا کے ہم
اسبابِ دلنوازیٔ قاتل بہم کریں

اتنے دیئے بجھا کے صبا کس طرف گئی
گلشن کے پاسباں سے تقاضا تو ہم کریں

مرے
خواب
ریزہ ریزہ

خواب

ریزہ ریزہ

احمد فراز

ترتیب :

روشنیوں کا شہر

ساحل کی ریت

موم کے پتّھر

آخرِ شب کے ہمسفر

نصرت عظیم کے نام

روشنیوں

کا

شہر

پہلا منظر

(گھڑیال سات بجاتا ہے اور پھر کسی آباد بازار کی مختلف آوازیں فیڈ اِن ہوتی ہیں۔ اِن آوازوں میں محض کاروں کے ہارن، گھنٹیاں، قہقہے، اور بال روم کی موسیقی ہے)

بوڑھا: (کھانستے ہوئے، اپنے آپ سے)

اُف یہ جاڑے کی خنک شام،
یہ ٹھنڈے جھونکے — جسم مفلوج ہُوا جاتا ہے
جیسے شریانوں میں تھم جائے لہو کی گردش
یہ بڑھاپا، یہ خزاں کا موسم
دونوں بے رنگ، حرارت سے تہی — دونوں محرومِ تپش
جل چکا کب سے بڑھاپے کے جہنّم میں گنہگار بدن کا ایندھن
اب تو اک پیکرِ خاکستر ہوں
زندگی راکھ کا ڈھیر
اب کوئی آگ اسے حدّتِ جاں تاب نہیں دے سکتی
اُف یہ جاڑے کی خنک شام

یہ ٹھنڈے جھونکے

(لہجہ بدل کر) خالدہ!

بند کر دے یہ دریچے کے کواڑ

کتنی بے رحم ہے بیٹی تو بھی

میں چراغِ سحری، اور تجھے

طلبِ بادِ شماں

کیا اسی دن کے لیے تجھ کو جواں ہونا تھا؟

(اپنے آپ سے)

کاش اس دخترِ بے فیض کے بدلے قدرت

بے ثمر رکھتی مرا نخلِ حیات!

آمنہ: (قدرے دور سے — سن رسیدہ آواز)

کیا ہوا؟ کیوں بلا وجہ پریشان ہوئے جاتے ہو؟

اک ذرا صبر کرو

آگ روشن کیے دیتی ہوں ابھی

تم کو زیبا نہیں ہر وقت جواں بیٹی کو

ایسے مطعون کرو

خالدہ بیٹوں سے بڑھ کر مری پیاری بیٹی

کس قدر نیک ہے، معصوم ہے، سنجیدہ ہے

ہم کہ اب ٹوٹتی گرتی ہوئی دیواریں ہیں

اس کا معصوم سہارا بھی بہت ہے ہم کو
جو شب و روز جوانی کے تقاضوں کو نچھاور کر کے
ہم پہ قربان ہوئی جاتی ہے
بوڑھے ماں باپ کی خدمت پہ کمر بستہ ہے
بوڑھا: آمنہ، کتنی کم فہم ہے تو
تیری کوتاہ نظر
صرف امروز کی مجرم ہے مگر
تجھ کو فردا کی خبر کچھ بھی نہیں
آہ میں کیسے کہوں، کیسے تجھے سمجھاؤں
خالدہ کس لیے ہر شام کئی پہر دن تک
اپنے ماحول سے بیگانہ کسی دھیان میں گم
اس دریچے میں کھڑی رہتی ہے
آمنہ: یونہی اگر ہے بھی تو پھر
کونسا ظلم ہوا!
دن بھر اسکول پڑھانا بھی تو کچھ سہل نہیں
نوکری ایک اذیت ہے، کوئی کھیل نہیں
اور وہ بیچاری، تھکن کی ماری
شام کے وقت کبھی اپنے دریچے میں کھڑی
خود کو بہلائے اگر شہر کے نظاروں سے

تو یہ معصوم سی تفریح بھی ہے جرمِ عظیم
کتنے خود غرض ہیں احسان فراموش ہیں ہم
کتنے بے درد ستم کوش ہیں ہم
(دھیمے اور اُداس لہجے میں)
خالدہ! کتنی بدبخت ہے تُو
کتنی بے رنگ ہے معصوم جوانی تیری
تیری قسمت میں نہیں ہے شاید
کہ تری مانگ میں افشاں کے ستارے چمکیں
کہ ترے ہاتھوں میں گلزارِ حنا کے مہکیں
تیری تقدیر میں محنت کے بیاباں ہیں فقط
اور ماں باپ کی بوڑھی لاشیں
کتنی بدبخت ہے تو!
(سسکیاں لینے لگتی ہے۔ دُور سے خالدہ کے گنگنانے کی آواز آتی ہے)
سُن یہ آواز کہ ہے اس میں نہاں
تیری بیٹی کا سسکتا فردا
غم فشاں، نوحہ کناں!
خالدہ میری نظر میں بھی ہے معصوم مگر
مجھ کو اس ہنستے ہوئے شہر سے خوف آتا ہے
اس کے ہنگاموں سے، رعنائیوں سے

جگمگاتی ہوئی راہوں سے، چمکتے ہوئے بازاروں سے
قہقہوں اور بھٹکتی ہوئی خوشبوؤں سے
اس کے نغموں سے، حسیں رنگوں سے
اس کی دیواروں سے نظّاروں سے خوف آتا ہے
تو نہیں جانتی
اس شہر کی یہ روشنیاں
چھین لے جائیں گی اک روز ترے اور مرے گھر کا یہ ننّھا سا یہ معصوم چراغ
آنکھ کا نور، بڑھاپے کا سکوں۔ خالدہ

خالدہ: اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر
سورج ڈوب چلا تو کتنے دیپ جلے
شام کے سائے روشنیوں میں ڈوب چلے
یہ خوشبو کے بوجھل جھونکے
یہ کرنوں کی نہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

بہ ہوئیوں کے ہنستے ارمانوں کے روپ
رات ہوئی تو دمک اٹھی پھر دن کی دھوپ
میرے دل میں کیوں ہے اک
انجانے درد کی لہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

تیرے ہنگاموں کی دنیا نور ہی نور
میرے دھیان میں تاریکی ہے، میں مجبور
میں کیا جانوں میں کیا سمجھوں
تو امرت یا زہر

اے روشنیوں کے شہر
اے روشنیوں کے شہر

(نغمہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے اور موسیقی سے منظر بدلنے کا تاثر پیدا ہوتا ہے
ہال میں ایک مصور کی تصویروں کی نمائش ہے، ہجوم کی ملی جلی آواز کے اثرات)

دوسرا منظر

آواز ۱ : خوب تصویریں ہیں
۲ : کتنی ترتیب سے آویزاں ہیں

ع۱ : ہاں کسی فن کی نمائش بھی تو اک فن ہے
ع۲ : ذرا دیکھو تو
ع۱ : اس طرف دیکھو یہ تصویر
ع۲ : "غزالِ صحرا" فن کی معراج ہے یہ۔ جس طرح قاف کی آوارہ
پری ہو کوئی
ع۱ : اے مصوّر ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں
ع۲ : خوب تصویر بنائی مرے بہلانے کو
ع۱ : "صبحِ نو"
ع۲ : قابلِ داد ہے ان رنگوں کی آمیزش بھی
ع۱ : کتنے موزوں ہیں یہ باریک خطوط
ع۲ : نور و ظلمت کی کشاکش کا عجب منظر ہے
ع۱ : جس طرح شب کی قبا چاک ہوئی جاتی ہو
ع۲ : آبشار کلۂ کوہ سے گھرتا ہوا دریا، توبہ!
ع۱ : کتنی بپھری ہوئی ہر موج نظر آتی ہے
جیسے ہر سنگِ گراں ٹوٹ کے بہہ جائے گا
جو بھی تصویر ہے شہکار ہے، فن پارہ ہے
سلمیٰ : ارے زاہدہ تم بھی موجود ہو
زاہدہ : کون؟ سلمیٰ . . . یونہی بس چلی آئی تھی
اس مصوّر کے فن سے عقیدت ہے مجھ کو

سلمیٰ : بڑی خوبصورت تصاویر ہیں
زاہدہ : واقعی فن کے شہکار ہیں
سلمیٰ : جس کو دیکھو وہی نقش پائے مصوّر میں گم، بُت بنا ہے
اے! خالدہ اور یہاں
زاہدہ : کیوں۔ اسے دیکھ کر تم کو حیرت ہُوئی
سلمیٰ : بچاری کی تقدیر میں صرف اسکول ہے اور گھر ہے
زاہدہ : مگر آج تو وہ نمائش میں آئی ہُوئی ہے
خدا جانے کیسے بچاری کا مفلوج باپ اور معذور ماں
دونوں اس کے سہارے پہ زندہ ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
اور خالدہ خود بھی اس عمر میں فلسفی بن چکی ہے
کہ جیسے کسی اور دنیا کی باسی یہاں آگئی ہو
اسے آرٹ سے ہے لگاؤ
مگر زندگی کے کسی اور رُخ سے محبّت نہیں ہے
زاہدہ : بچاری اکیلی کھڑی ہے
چلو اس سے باتیں کریں
سلمیٰ : زاہدہ تم نہیں جانتیں
اس کی دنیا انھیں سرد تنہائیوں ہی سے آباد ہے
دیکھ لو ایک تصویر کے سامنے، کیسے مبہوت ہے
زاہدہ : اور ہاں اس کے ہونٹوں کی جنبش کہ جیسے کوئی خود سے محوِ سخن ہو

سلمٰی : چلو اب چلیں لوگ جانے لگے ہیں

(ہجوم کی آوازیں فیڈ آوٹ ہو جاتی ہیں)

خالدہ : (اپنے آپ سے) یہ تصویر کس شہر کی ہے ؟ سماں
کتنا مانوس ہے
جیسے میری نگاہیں اسے روز و شب دیکھتی ہوں
یہ اُونچی عمارات یہ جگمگاتے در و بام ۔ روشن دریچے
یہ شفاف سڑکیں، بھڑکتے لبادوں میں خوش باش انساں
حسیں رقص گاہوں میں یہ قمقمے ، قہقہے
زندگی ، روشنی ۔ زندگی ، روشنی
اور یہ ایک گوشے کے سائے میں ڈوبا مکاں
نیم وا اک دریچہ
یہ کیوں روشنی کے سمندر کی قربت میں بھی
اِک کرن سے بھی محروم ہے ۔۔کیوں ؟
نہیں ، یہ چمکتا ہُوا شہر۔۔
اور یہ اندھیروں میں ڈوبا مکاں
جیسے میرا ہی شہر اور ۔۔ میرا مکاں ہو
مصوّر
مصوّر ! یہ کس کا مکاں ہے ؟

مصوّر: یہ کس کا مکاں ہے؟ یہ کس کا مکاں ہے،
مجھے خود نہیں علم یہ روشنی سے چمکتا ہُوا جگمگاتا ہُوا شہر کس کا ہے
اور یہ اندھیرے میں ڈوبا مکاں خود مرے واسطے اجنبی ہے
خالدہ: (چونک کر) کون؟
مصوّر: خاتون! میں ہی وہ مجرم مصوّر ہوں جس کی پریشان تصویر نے آپ
کے ذہن کو اِتنا الجھا دیا ہے،
سبھی لوگ میری بنائی ہُوئی ان تصاویر کو دیکھ کر جا چکے ہیں
مگر ان کی آنکھیں
فقط شوخ رنگوں، چمکتی لکیروں، فسوں کار قوسوں میں کھوئی رہی ہیں
سبھی نے فقط جگمگاتے ہُوئے شہر کا نور دیکھا
مگر بھول کر بھی کوئی اس اندھیرے مکاں تک نہ پہنچا
یہ سایوں کی دُنیا، اندھیروں کا مسکن
مصوّر کا اک نقشِ نوحہ کناں ہے
یہ ناکام کاوش!
مری ناتمام آرزو اس ہجومِ فراواں میں بھی
اک نگاہِ کرم کو ترستی رہی ہے
یہ توہین فنکار کی موت ہے
ہاں یہ توہین — فنکار کی موت ہے
خالدہ: مصوّر مگر اس کی ..... قیمت؟

مصوّر : فقط قدردانی

خالدہ : مرا مدّعا ہے . . . . اگر میں اسے لینا چاہوں

مصوّر : نہیں یہ ابھی نامکمّل ہے

خالدہ : وہ کس طرح ؟

مصوّر : اس اندھیرے مکاں کا دریچہ
ابھی منتظر ہے کسی ایسے پیکر کا
جس کے رگ و پے میں یہ جگمگاتا ہُوا شہر طوفاں اُٹھا لے
مگر اس کے قدموں میں ساحل کی زنجیرِ ظلمت پڑی ہو
یہی نور و ظلمت کی پیہم کشاکش
مرے شاہ پارے کو تکمیل کا رنگ دے گی
مجھے اس خیالی ہیولے کی، اس پیکرِ خواب کی جستجو ہے
نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی
نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی
(اپنے آپ میں کھوئے ہُوئے لہجے میں)
یہ خاتون تصویر میں کس قدر کھو گئی ہے
یہ بکھری ہُوئی ہوئی زلف ۔ جیسے زمانے کا دُکھ اس پہ سایہ فگن ہو
یہ غمگین آنکھیں ـــ کہ جیسے کسی خواب گوں جھیل میں
دو کنول شامِ ہستی کے کہرے میں لپٹے ہُوئے ہوں
یہ گلنار لب جیسے باغِ جوانی کی کلیاں بہاروں کے انجام سے باخبر ہوں

یہ معصوم چہرہ کہ جیسے کسی جگمگاتے ہوئے شہر پر دھند سی چھا گئی ہو
مسلسل اُداسی میں ڈوبی ہوئی نوجوانی
خموشی میں بھی نوحہ گر ہے
یہ پیکر وہی ہے جسے میں نے
مغموم صبحوں میں، خاموش شاموں میں، ویران راتوں میں ڈھونڈا
مجھے مل گیا میرے تاریک و تنہا مکاں کا مکیں
(قریب آتے ہوئے) اجنبی نیک خاتون! میں آپ کی قدر دانی کا مشکور ہوں
میرے فن کا تقاضا بھی یہ ہے کہ میں آپ کی نذر کر دوں یہ تصویر
لیکن اگر آپ کچھ روز اس نامکمّل ہیولے کی تکمیل تک ایک زحمت اُٹھائیں

خالدہ: وہ کیسے؟

مصوّر: مری آرزو ہے کہ میں اس اندھیرے مکاں کے دریچے میں
اس روشنی کی کرن کھینچ لاؤں
جو اس جگمگاتے ہوئے شہر کی تابناکی سے تابندہ تر ہو
اگر آپ کچھ روز تک شام کو چند لمحے
مرے سامنے آ کے بیٹھیں
تو میں آپ کو اپنی تصویر کے اس دریچے کی زینت بنا دوں
یہ شہکار جس دن مکمّل ہو — بس آپ کا ہے

خالدہ: مصوّر — مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے
گر میری موجودگی تیرے فن کے کسی کام آئے

تو بیں ..... خواہ کچھ ہو۔ یہاں روز آتی رہوں گی
ارے شام ڈھلنے کو ہے ..... لوگ سب جا چکے
مجھ کو لازم ہے اب ... ۔می جاؤں

مصوّر: تو کل شام؟

خالدہ: ہاں، میں ضرور آؤں گی

تیسرا منظر

(وہی جو پہلے منظر میں ہے)

بوڑھا: آمنہ!
ہو چکی شام مگر خالدہ اسکول سے اب تک نہیں واپس آئی
وسوسے مجھ کو پریشان کیے دیتے ہیں

آمنہ: آج کچھ دیر سے آنے کے لیے اس نے کہا تھا مجھ سے
اس کے اسکول کے پاس
اک نمائش تھی — وہیں آج اسے جانا تھا
ابھی آتی ہو گی

بوڑھا: ہوں، تو اب
اس کو بھی اس شہر کی رنگینیاں بھکانے لگیں
آخر اس پر بھی یہ پرچھائیاں اب چھانے لگیں

آہ اس شہر کی یہ روشنیاں !
کتنے معصوم چراغوں کو بجھا دیتی ہیں
کتنے تاریک مکانوں کو لٹا دیتی ہیں
آہ اِس شہر کی یہ روشنیاں !

آمنہ : جانے کیوں واہمے بدظن کیے دیتے ہیں تمھیں
خود سے، ماحول سے، بیٹی سے، سبھی دنیا سے !
واہمے کتنے گناہوں کو جنم دیتے ہیں
آدمی اپنے تراشے ہوئے بُت پوجتا ہے
ہم کہ اب عمر کی اس منزلِ تاریک میں ہیں
جس میں اک شمع کی موہوم سی ضو
ایک ہلکی سی کرن
خیرہ کر دیتی ہے آنکھوں کو — وہاں
تابِ نظارگیٔ مشعلِ خورشید کسے
اپنی محرومی کا احساس ہے، اس تنگ نگاہی کا سبب
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بجھاتے ہیں چراغ

بوڑھا : ٹھیک کہتی ہو مگر
یہ مرے واہمے وہ تلخ حقائق ہیں جنھیں
میری بے نور نگاہیں ہی فقط دیکھتی ہیں
یہ نظر سوز نظارے یہ بھڑکتے منظر

یہ چکا چوند، یہ جلووں کا ہجوم
رنگ و آہنگ کا طوفان — یہ سیلِ انوار
اک ملمّع ہے، نمائش ہے، دکھاوا ہے جیسے
اک فسوں کار نے ہر سمت سجا رکھا ہے
ہائے اس سادہ و معصوم نظر کی قسمت
جو فقط ظاہری جلووں سے ہو مسحور مگر
موت کے دام سے بیگانہ رہے
اپنے انجام سے بیگانہ رہے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

آمنہ: خالدہ آگئی۔ بہتر ہے کہ خاموش رہیں

بوڑھا: میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا
میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا

چوتھا منظر

مصور کا کمرہ، چاروں طرف نامکمل تصویریں بکھری پڑی ہیں، جن پر گرد کی تہہ جم چکی ہے، مصوّر "روشنیوں کے شہر" کی تصویر ایزل پہ رکھے اس کے سامنے بیٹھا کام کر رہا ہے۔ اب اک تصویر میں تاریک مکان کی جگہ روشن مکان نے لے لی ہے۔

مصوّر: تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
میرا دل میری تمنّا، مری جاں ہو جیسے

چشمِ نرگس کو میں کچھ اور بھی حیراں کر دوں
زلفِ آوارہ کو کچھ اور پریشاں کر دوں
حُسن کو پیرہنِ رنگ میں پنہاں کر دوں
جھیل میں پرتوِ مہتاب رواں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

جلوہ افروز ہو پردوں میں بھی افسونِ شباب
جس طرح شیشۂ مے سے نہ چھپے عکسِ شراب
آپ سے آپ کھلے جاتے ہیں ہونٹوں کے گلاب
آمدِ صبحِ بہاراں کا سماں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

کس قدر سادہ و رنگیں ہے جوانی تیری
میرے ہر نقش میں پنہاں ہے کہانی تیری
فن کی معراج ہے تصویر بنانی تیری
ہر مصوّر تری جانب نگراں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے

(خالدہ کے قدموں کی چاپ ۔ کمرے کا دروازہ
کھُلتا ہے اور مصوّر خاموش ہو جاتا ہے)

مصوّر: کون؟ تم خالدہ، آؤ بیٹھو

خالدہ: مصوّر، بڑے خوش نظر آ رہے ہو

کہ جیسے جہاں بھر کی دولت تمھیں مل گئی ہو

مصوّر: بہت خوش ہوں میں، واقعی۔ جس طرح ایک دریوزہ گر کو
کوئی بخش دے ہفت اقلیم کی بادشاہت

خالدہ: ذرا ہم بھی جانیں کہ وہ کون حاتم ہے اور کونسی بادشاہت
ہے جس کے سبب تم وفورِ مسرّت سے نغمہ بلب تھے

مصوّر: سخاوت اگر ہو تو ایسی
کہ دستِ کرم اپنی بخشش سے خود بے خبر ہو
مرے سامنے ہیں وہ بخشندہ و بادشاہت

خالدہ: (مسرّت سے) مصوّر!

مصوّر: مری نا تمام آرزو آج پوری ہوئی ہے
یہ تصویر میری تمنّا کی معراج
دیکھو۔ اندھیرے مکاں کے دریچے میں
یہ روشنی کی کرن۔ کس قدر ضو فشاں ہے

خالدہ: تو کیا یہ اندھیروں میں ڈوبا مرا ہی مکاں تھا
جہاں آج تابانیاں موجزن ہیں؟

مصوّر: نہیں تم تو خود روشنی ہو
ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں
یہ ظلمت میں ڈوبا مکاں
ایک فنکار کا غمکدہ، اک مصوّر کا تصویر خانہ تھا جس پر

زمانے کی بے اعتنائی کے سائے پر افشاں رہے ہیں
کسی نے تمھارے سوا یہ نہ دیکھا
کہ اس سیلِ رنگ و طرب میں بھی آخر کوئی نوحہ گر ہے
تمھارا کرم تھا کہ تم حسبِ وعدہ
مرے فن کی تکمیل کو میرے ظلمت کدے میں کئی روز تک
روشنی لے کے آتی رہی ہو

خالدہ: تو کیا اے مصوّر، تمھارا مکاں بھی اندھیروں میں گم تھا؟
تو کیا ہر مکاں تیرہ و تار سایوں میں ڈوبا ہُوا ہے؟
یہ سب روشنی پھر کہاں کھو گئی ہے؟
کہاں ہے وہ خورشید، وہ منبعِ نُور؟
وہ روشنی کا سمندر
کہ جس کے لیے تیرہ و تار دُنیائیں شام و سحر منتظر ہیں
مصوّر تمھیں روشنی کی ضرورت نہیں ہے،
تمھیں روشنی کی ضرورت نہیں
میرا تاریک گھر اک کرن کو ترستا ہے
اور یہ کرن .... یہ کرن؟

مصوّر: ہاں تمھاری ہے اور حسبِ وعدہ یہ تصویر حاضر ہے
اب اس مکاں میں اندھیرا نہیں
یہ بھی اس جگمگاتے ہُوئے شہر کا ایک حصّہ ہے

یہ تودۂ تیرگی سیلِ انوار میں گھُل گیا۔ مل گیا
روشنی تو ملی — روشنی تو ملی

خالدہ: اچانک تمہاری نگاہوں میں کس سوچ کے اژدرے تیرنے لگ گئے ہیں؟
یکایک مسرّت کی لہروں میں کن حسرتوں کے بھنور پڑ گئے
جس طرح تم سے پل بھر میں ہی چھن گئی ہفت اقلیم کی بادشاہت
کہو.... چپ ہو کیوں.... کچھ تو بولو، مصوّر

مصوّر: نہیں کچھ نہیں، سوچتا ہوں کہ جب چاند تارے بھی محتاج ہیں روشنی کے

تو پھر میں اندھیروں کا باسی
کہ جس کے مقدّر میں تاریکیاں ہیں اندھیرے ہیں
کیوں آرزوئے ضیا میں۔ اُجالوں سے شکوہ کناں ہوں
مجھے میری تاریکیاں چاہئیں، صرف تاریکیاں، صرف تاریکیاں
مجھے جگمگاتے ہوُئے شہر نے کتنا دھوکا دیا ہے
کہ میں اپنے فن کا گلا گھونٹ کر سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا
مصوّر کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے
اسے جگمگاتے ہوُئے شہر سے کیا؟
تو.... خاتون.... کل شام میں آپ کے شہر کو چھوڑ جاؤں گا
کل شام، اسی وقت

خالدہ: تو کیا واقعی تم مرے شہر کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟

مصوّر نہ جاؤ.... نہ جاؤ مصوّر،

مصوّر: مجھے صرف فن سے محبّت ہے
شہروں سے، لوگوں سے، صبحوں سے، شاموں سے نسبت نہیں ہے
مجھے آپ سے آپ کا عکس پیارا ہے
جو میں نے خونِ جگر سے سجایا ہے، روشن کیا ہے
اسی کے لیے میں یہاں چند دن رک گیا تھا
اور اب جب مکمل ہے یہ نقش —میں جارہا ہوں
ابھی جانے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں
ابھی جانے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

پانچواں منظر

(وہی جو پہلا منظر ہے)

بوڑھا: آمنہ! ہو چکی شام مگر خالدہ گھر آئی نہیں
جانے کیا بات ہے۔ کیوں آج پریشاں ہے طبیعت میری

آمنہ: ابھی آتی ہوگی

بوڑھا: ابھی آتی ہوگی
اب تو یہ روز کا معمول ہُوا
خالدہ شام سے پہلے کبھی گھر آتی نہیں

اور گھر آئے تو اپنے ہی خیالوں میں مگن رہتی ہے
نہ اسے باپ کا غم ہے نہ اسے ماں کا خیال
طَور بے طَور ہُوئے جاتے ہیں
اس کے انداز ہی کچھ اور ہُوئے جاتے ہیں

آمنہ : جانے یہ واہمے کب ختم تمھارے ہوں گے
تم کو معلوم تو ہے
خالدہ ان دنوں اسکول میں مصروف بہت رہتی ہے
صبح سے شام تلک
اِک اذیّت میں گرفتار ہے نازک بچی

بوڑھا : چاہے تم کچھ بھی کہو (تلخ لہجے میں) کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جائے گی

(خالدہ کے قدموں کی چاپ)

آمنہ : خالدہ آگئی

بوڑھا : کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جائے گی

خالدہ : کیا ہُوا؟

بوڑھا : خالدہ! کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی
سن لیا؟ کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالدہ : ماں.... مگر

بوڑھا : بس نہیں جاؤ گی تم

آمنہ: لیکن اتنا سوچو
خالدہ نوکری چھوڑ دے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر؟
تم بھی معذور ہو .... میں بھی مجبور
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں
بوڑھا: وائے محرومیٔ تقدیر کہ جس کے باعث
آج میں اپنی جواں بیٹی پر
بار ہُوں — بارِ گراں
پھر بھی میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا
خالدہ، باپ کی محتاجی و معذوری کے پردے میں مری
اتنی تذلیل کرے
اس سے پہلے کہ یہ افلاس مرا
مری غیرت مری ناموس کا نیلام کرے
میں بجھا دوں گا ہر اک شمعِ حیات
زندگی، موت سے بدتر ہے اگر غیرت و ناموس نہیں ...
کچھ بھی ہو
مجھ کو منظور رہے ہر ایک عذاب
مجھ کو منظور رہے ہر ایک عذاب
(شدّت سے کھانستا ہے)
موسیقی

(شام کا منظر — گھڑیال سات بجاتا ہے — کسی آباد شہر کا بازار
ہارن، گھنٹیوں، قہقہوں اور بال روم کی موسیقی کے اثرات)

چھٹا منظر

وہی پہلا منظر — کھڑکی سے روشنیوں کا شہر دکھائی دے رہا ہے — موسیقی
کی آواز لوگوں کے قہقہوں میں گھلتی جا رہی ہے — کرسی خالی ہے، —
خالدہ کھڑکی سے لگی کھڑی باہر دیکھ رہی ہے

خالدہ: (اپنے آپ سے) آہ یہ شام کس درجہ اندوہگیں ہے
مگر آج بھی شہر کا ہے یہ عالم
کہ ہر سمت جیسے چراغاں ہوا ہو
وہی روز کے زمزمے، قہقہے، قہقہے جیسے جشنِ طرب ہو
وہی جگمگاتے در و بام، روشن دریچے
وہی رقص گاہوں کے منظر
یہ نغموں کا سیلاب گیتوں کی کرنیں
بھڑکتے لبادوں میں خوش باش رہگیر، خوش بخت پیکر
وہی زندگی روشنی — روشنی زندگی
اور میرا مکاں — اے مصوّر، یہ تصویر میری نہیں ہے
نہیں ... میری دنیا میں اب تک اندھیرے بسے ہیں

یہاں ظلمتیں اب بھی نوحہ کناں ہیں مصور

مصوّر کی خیالی آواز : نہیں تم تو خود روشنی ہو

ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہُوئے ہیں

مجھے جگمگاتے ہُوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا تھا

کہ میں اپنے فن کو سسکتا ہُوا چھوڑ کر

سیلِ انوار میں بہہ چلا تھا

مصوّر کی دُنیا تو ظلمت کدہ ہے

میں یہ جگمگاتا ہُوا شہر کل چھوڑ جاؤں گا

کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

خالدہ : مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو

مگر۔۔۔۔ہاں — تمھیں اپنے فن سے غرض

اپنے بے جان رنگوں، ادھوری لکیروں سے

خاموش سایوں سے، ساکن ہیولوں سے الفت ہے

تم نقش گر ہو، تمھارے لیے زندگی میں

دھڑکتے دلوں، گنگناتے لبوں، جھلملاتے چراغوں لپکتی شعاعوں میں

کچھ بھی نہیں ہے!

فقط کاغذی بُت، خیالی صنم، سرد لاشیں

تمھاری نگاہوں کے مرکز۔ مگر بولتی زندگی سے گریزاں

بوڑھا : (خیالی آواز) خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

آمنہ: (خیالی آواز) خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جئیں گے آخر
تم بھی معذور ہو میں بھی مجبور
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں

خالدہ: نہیں میری دنیا بھی لاشوں کا گھر ہے
میں کب تک یہ لاشیں اُٹھائے اندھیروں میں بھٹکوں
مری زندگی سرد لاشوں کے بارِ گراں سے سسکنے لگی ہے
مصوّر! مجھے اب تمھاری ضرورت نہیں ہے
کہ تم بھی اسی جگمگاتے ہوُئے شہر کی اک کرن تھے
تمھارا وجود ایک زرتاب ذرّہ تھا جو
اپنے مرکز سے پھر جا ملا
تم بھی اس شہر کے ایک جگنو تھے
جو اِن اندھیروں میں اک پل کا مہمان تھا اور بس
اک کرن، ایک جگنو سے ظلمت کی دیوار کب گر سکی ہے
یہ لاشیں
کہ جن کے لیے میں نے اپنی دھڑکتی جوانی کو مفلوج رکھا ہے
اب وہ بھی مجھ کو فقط باعثِ ننگ گردانتی ہیں
تو کیا وہ مقدس فریضہ مرا جرم تھا جس کی خاطر
میں اک لاش بن کر، اندھیروں میں ڈوبی رہی ہوں
تو کیا یہ مری زندگی شہ رگ کی طرح

تا ابد روشنی سے گریزاں رہے گی
مرے سامنے اک طرف یہ چمکتا ہُوا شہر ہے
روشنی کا سمندر ہے
جو سرد لاشوں سے بیگانہ ہنستی ہُوئی زندگی کا جہاں ہے
اور اک سمت ساحل کی زنجیرِ ظلمت، مری آرزؤں کی قاتل
اُدھر روشنی — زندگی
اور ادھر — موت، اور موت کی تیرگی
اگر یہ اُجالے مری دسترس میں نہیں ہیں
تو پھر، موت کی مستقل تیرگی کو نہ کیوں اپنا مسکن بنا لوں؟
میں اس نور و ظلمت کو اب توڑ دوں گی
فقط موت ہی میری اس کشمکش کا مداوا ہے
میں توڑ دوں گی یہ زنجیرِ ظلمت، شعاؤں بھرے شہر

(دریچے سے چھلانگ لگاتی ہے)

بوڑھا: خالدہ! خالدہ!

(غمگین موسیقی)

آہ اے شہر، چمکتے ہُوئے ہنستے ہُوئے شہر
کتنا بے رحم ہے سفاک ہے تو
تیرے بے خواب دریچوں کے اُجالے جلّاد
تیرے شب تاب ستونوں کی ضیا، تیغِ ستم

تیرے نغموں کی کھنک، ساغرِ سم
تیری ضو بار عمارات ہیں، مقتل گاہیں
تیری رعنائیاں، آنکھوں کا فریب
یہ ترا حسن ملمع ہے، نمائش ہے فقط
ریگِ رواں، موجِ سراب!
تو ہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
وہی قاتل ہے مرا اور مری بیٹی کا
اے چمکتے ہوئے شہر
اے چمکتے ہوئے شہر

ساحل

کی

ریت

(سمندر کی لہروں کا خروش —— آبی پرندوں کی صدائیں۔
بعض ساحل نشینوں کی آوازیں اور قہقہے —— دُور سے
دھیمی آوازوں میں ملّاحوں کا گیت سنائی دیتا ہے۔)

سلیمان : (خود کلامی کے انداز میں)
سمندر کی یہ نیلگوں وسعتیں کتنی سحر آفریں ہیں
ہواؤں کی نمناک خوشبو
تھکے ذہن کو کتنی آسودگی بخشتی ہے
سرِ شام
جب جھلملاتی ہے بھیگی ہُوئی روشنی ساحلوں کی
تو کتنے ہی گلرنگ چہرے فضا تاب پیکر سنہرے بدن
چاند تاروں کی مانند اُترتے ہیں
اس تختۂ ریگ پر جس پہ میں بھی کھڑا ہوں
اداس اور تنہا
کوئی بھی تو ان میں نہیں ہے

جو آ کر مرے خواب زاروں کے
خاموش و ویراں جزیروں کے دیکھے
جو تنہائیوں کے سمندر میں ڈوبے ہوئے
بیس برسوں سے اب تک
زمانے کی آنکھوں سے اوجھل
کسی اجنبی چاپ کے منتظر ہیں
اگر کوئی آتا
تو بس۔ میری تنہائیوں کے سمندر کو
ساحل سے ہی دیکھتا
اور پھر لوٹ جاتا
کسے کیا خبر
کون مجبورِ غم ان جزیروں میں محصور
خوابوں کی دنیا میں نوحہ کناں ہے
کہ میں ایک موج
اور منزل مری ہے حبابِ گریزاں
حبابِ گریزاں تلک کب کوئی موج پہنچی
مسافر کے ہمراہ منزل بھی گرمِ سفر ہے

(سمندری لہروں کا اثر)

مری زندگی تا بکے کہر آلود خوابوں میں ڈوبی رہے گی

مجھے اب یقیں ہو چلا ہے
صداؤں کی شمعیں چمکتی رہیں گی
مگر میری خاموش و تاریک تنہائیوں میں اُجالا نہ ہوگا
اُجالا نہ ہوگا ..... اُجالا نہ ہوگا
(لہروں کا صوتی اثر اور وحشیانہ قہقہہ)

ہمزاد : اُجالا نہ ہوگا .....
سلیمان : کون ..... تو کون ہے
جو مری سوچ پر خندہ زن ہے
کہ میں تیری آواز سُنتا ہوں لیکن تجھے دیکھ سکتا نہیں
کہ میں تیرے قدموں کی آہٹ سے بھی بے خبر اور تو
میرے خوابوں کی گونجار تک سُن رہا ہے
بتا کون ہے ؟ ... . تو کہاں ہے ؟
ہمزاد : مجھے دیکھ سکتی نہیں تیری آنکھیں
مجھے دیکھ سکتی نہیں تیری آنکھیں
مگر میں ترے پاس ہوں
میں ترے ساتھ ہوں
سالہا سال سے
میں تجھے جانتا ہوں
تری سوچ بھی میری نظروں سے مخفی نہیں

ہیں ازل سے ترا رازداں —— تیرا سایہ
مگر ایسا سایہ جو تاریکیوں میں بھی مرتا نہیں
ظلمتوں میں بھی ہمراہ رہتا ہے
میں تیرا ہمزاد
جو ہر قدم، تیری راہوں کے ہر پیچ و خم
تیری سانسوں کے ہر زیر و بم سے شناسا ہوں

سلیمان: اگر تو مرا رازداں ہے
مری تلخ محرومیوں سے ہے واقف
تو کیا پھر یہی ہے شعارِ وفا
ایک محرومِ قسمت کو تسکین دینے کے بدلے
تمسخر کے نشتر چبھوئے
تو کیا بس ترے پاس اک نامرادِ ازل کے لیے
صرف تضحیک کے تازیانے ہیں
ہمدرد آنکھوں کے آنسو نہیں ہیں

ہمزاد: نہیں تو نہیں جانتا
تو کہ تجھ کو کبھی آج تک میری موجودگی
میری قربت کا احساس ہونے نہ پایا
کہ میں تیری آشفتگی پر
تری زیست کی بیکلی پر شب و روز

آنسو بہاتا رہا ہوں
مگر ایک سائے کی وقعت ہی کیا ہے
جو دیوار کے ساتھ رہ کر بھی
گرنے سے اس کو نہیں روک سکتا
تری زندگی بھی ہے مائل بہ افتادگی
اور میں ایک بے جان سایہ
مگر سُن
یہ آواز
جو زندگی کی صدا ہے
جو تیرے لیے میری ہمدردیوں سے سوا ہے
ذرا سُن !

(پس منظر سے مانجھیوں کا گیت اُبھرتا ہے)

رت طوفانی گہرا پانی قدم قدم منجدھار
تیز ہوائیں دل دہلائیں منزل ہے دشوار
اے مانجھی ہشیار
اے مانجھی ہشیار
جیون اک طوفانی ساگر ہر دم موج کے ریلے
تنہائی کا سفر کڑا ہے ساتھ کسی کو لے لے
کس نے اکیلے صدمے جھیلے کون ہُوا ہے پار
اے مانجھی ہشیار

تیرے خوابوں کی دنیا ہیں دُور بہت دیوانے
راہ میں سانس اُکھڑ جاتی ہے رستے ہیں انجانے
بازو شل ہو جائیں تو کب کام آئے پتوار
اے مانجھی ہشیار
اے مانجھی ہشیار

(نغمہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے
طوفانی لہروں کا صوتی اثر)

ہمزاد : سُنا تو نے
یہ زندگی کی صدا ہے
جو طوفان ہستی میں بھی
کن اداؤں سے نغمہ سرا ہے
یہی تیرے دُکھ کی دوا ہے

سلیمان : نہیں میری محرومیوں کا کوئی بھی مداوا نہیں
اور میں
زندگی کا سفینہ شب و روز کھیتا رہا ہوں
فقط تند لہریں ہی میرا مقدر رہی ہیں
مگر اب مرے دست و بازو بہت تھک چکے ہیں
یہ معمول
دو چار دن کا

برس دو برس کا نہیں
بیس برسوں سے ہر شام
میں اس سمندر کی بیتابیاں دیکھتا ہوں
یہ موجیں مری آشنا ہیں
میں ان کے اشارے سمجھتا ہوں
جیسے یہ کہتی ہوں
آؤ۔ یہیں ہے تمھارے حسیں خواب زاروں کا مدفن
یہاں ایسی گہرائیاں ہیں
کہ جن میں ہمالہ سے کہسار بھی ڈوب جائیں
کہ چشمِ خضر بھی نشاں تک نہ پائے
جہاں اتنی وسعت ہو
اتنی کشادہ دلی ہو
وہاں ایک کمزور انساں
پرِ کاہ سے بھی ہے کم تر
تو پھر کیوں نہ میں
زندگی کا سفینہ
سکوں بخش موجوں میں غرقاب کر دوں
ہمزاد : ٹھہر۔ یہ ترا وہم ہے
تو کہ خود اپنی تنہائیوں کا ہے محرم

ذرا سوچ کیا تیری دنیا میں کوئی نہ آیا
ذرا بیس برسوں کی گزری ہوئی منزلوں کی طرف
لوٹ کر دیکھ
کیا کوئی دل بھی تری آرزو میں نہ دھڑکا
کوئی زلف بھی تیری خاطر نہ بکھری
کوئی آنکھ ایسی نہ تھی، جس کی پلکوں پہ تیرے لیے
آنسوؤں کے ستارے دمکتے
ذرا سوچ ناداں

یہ سب کچھ تھا لیکن
تری زندگی ایک ساحل کی مانند تھی
جو سدا بحر سے لب بلب رہ کے بھی
مستقل تشنگی کی گلہ مند ہو
سوچ! اس تشنہ کامی کا باعث
سمندر ہے یا ریگِ ساحل
سلیمان : مگر کون تھا وہ سمندر؟
مری زندگی تو فقط قلزمِ ریگ ہے
جس میں ہر دم سرابوں کی لہریں ہیں
پانی کی بوندیں نہیں

اور سرابوں کا حاصل
بجز مرگِ تشنہ لبی اور کیا ہے
فقط شوق کی آندھیوں اور تنہائیوں کے بگولوں سے
کب تشنگی بجھ سکی ہے؟

ہمزاد : اور وہ نبیلہ؟

سلیمان : نبیلہ ..... نبیلہ
نبیلہ تو صحرا کا بادل تھی
جس کا کرم چند لمحوں کا سایہ
بھلا چند لمحوں کے سائے سے برسوں کی حدّت کہیں کم ہوئی ہے؟
نبیلا کی آواز ..... دو چار لمحوں کی گونجار تھی
اور دو چار لمحوں کی گونجار ......

(پس منظر میں گیت اُبھرتا ہے)

بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی
مری زندگی تجھ سے کب آشنا تھی
گھٹائیں اُٹھیں اور ہوا گنگنائی
تڑپتی ہوئی موج ساحل تک آئی
وہ کیسا سماں تھا وہ کیسی فضا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی

بدن میں سُلگتی ہیں چنگاریاں سی
یہی رت تھی پہلے بھی لیکن جُدا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی

جواں ہیں ابھی خواہشوں کے جزیرے
چلو ہم بھی جائیں ادھر دھیرے دھیرے
کہیں پھر نہ کہنا کہ وہ بے وفا تھی
بتا میرے خوابوں کے انجان ساتھی

نبیلا : بتا میرے ساتھی ......
مرا گیت سُن کر نہ جانے تمھیں
کیوں خموشی کے گرداب نے آلیا ہے
کہو کیا تمھیں میری آواز سُن کر......

سلیماں : نبیلا مجھے تیری آواز سُن کر یہ محسوس ہوتا ہے
جیسے
مجھے کوئی ایسے جزیروں سے آواز دیتا ہو
جو میرے خوابوں میں آباد ہیں
پر مری آنکھ ان کو نہیں دیکھ سکتی
یہ آواز پل بھر کا جادو
جو کانوں میں رس گھول دے
اور آنکھوں سے بینائیاں چھین لے
جس طرح معبدوں کی سبک گھنٹیاں یک بیک بج اُٹھیں

اور پجاری
وفورِ عقیدت سے سر کو جھکا ئیں
مگر ان کی آنکھیں
دلوں میں بسائے ہُوئے دیوتا کی جھلک کو بھی ترسیں
مرے سامنے تو ہے . . . . پھر بھی
مرے سامنے تو نہیں ہے
مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے
سب واہمہ ہے ۔ یہ سب واہمہ ہے

نبیلا: سلیماں تمھیں اپنی آنکھوں پہ شاید بھروسہ نہیں ہے
مگر زندگی کی یہ کیفیتیں اتنی سحر آفریں ہیں
کہ خود میں بھی ماحول سے بے خبر ہوں
چلو ان ہی کیفیتوں کے بہاؤ میں بہہ کر
اُفق کے کناروں کو چھُو لیں
سلیماں!

سلیماں: نمعلوم کیوں میرا دل مجھ سے کہتا ہے
یہ چند لمحوں کا نشہ
سلگتی ہوئی زندگی کے لیے اک فریبِ حسیں ہے
فقط چند لمحوں کا نشہ
کہ جس کے اُترتے ہی

پھر تلخ محرومیاں مجھ کو ڈسنے لگیں گی
یہ رُت، یہ سماں، یہ سمندر کی بھیگی ہوا
یہ فضاؤں کی خوشبو، یہ تیری صداؤں کے گھنگھرو
فقط خواب کے شعبدے ہیں
فقط خواب کے شعبدے
اور خوابوں پہ کب تک بھروسہ نبیلا

نبیلا: یہ دو چار لمحے بھی اس زندگی میں بہت ہیں
جہاں ہر طرف اجنبیّت کے سائے ہوں
بیگانگی کے اندھیرے ہوں
واں یہ ملاقات۔ یہ چند لمحوں کی روشن شعاعیں
بہت قیمتی ہیں
بہت قیمتی — آؤ ہم بھی سمندر کی لہروں کی مانند
اک دوسرے سے ملیں
اور دو چار لمحوں کی کیفیّتوں کو غنیمت سمجھ کر
جُدائی کا احساس تک بھُول جائیں
کسے کیا خبر
کل کا دن — اپنے آغوش میں
آج کی شام لائے نہ لائے

سلیمان: یہ لمحوں کی کیفیّتیں عارضی ہیں نبیلا

یہ لہریں
جو اک دوسرے کی تمنّا سے مسحور ہو کر
کبھی آ کے شدّت سے ملتی بھی ہیں تو
فقط ایک پل کے لیے
اور پھر اپنی ہستی بھی کھو بیٹھتی ہیں
فقط عارضی کیفیت کے بہاؤ میں
کیا زندگی ہے؟
نبیلا: یہی زندگی ہے سلیماں
یہی زندگی ہے
یہی ایک اک پل تو
برسوں کی پھیلی ہوئی آرزو کی متاعِ گراں ہے
وگرنہ
ازل سے ابد تک اگر کوئی سانسوں کے رشتے ملائے
تو پھر اس کشاکش کی لذّت کہاں ہو
جو اک لہر کو دوسری کی طرف کھینچتی ہے
کناروں کو دیکھو
جو اک دوسرے کے مقابل ہیں
لیکن طلب کی کشاکش سے محروم
ان کے لیے زندگی بے حسی ہے

سکونِ مسلسل کے مارے
فقط حسرت و یاس کی ریگ سے مطمئن ہیں
یہ اپنی ہی زنجیر کے صید......
یونہی رہیں گے..... ازل سے ابد تک
(سمندری لہروں کا خروش)

ہمزاد: سنا میرے ساتھی
یہی تھی وہ آواز
جو تیری سنسان دنیا میں
لمحہ بہ لمحہ کھنکتی رہی، اور تو اس کو بھی
واہموں کے کھلونوں کی جھنکار سمجھا
یہ صحرا کا بادل سہی
پھر بھی تو چاہتا تو
سلگتی ہوئی تلخ تنہائیوں کے بیاباں میں
برسوں کے دُکھ کی تپش بھول جاتا
مگر جب تری چشم سوزاں ہی
ابرِ کرم سے گریزاں رہی تو
کسی کو پھر الزام کیوں دو
تہی دست ساتھی
سوالی کا یہ حق نہیں ہے

کہ وہ اپنے بخشندۂ مہرباں کی عنایت
کو شک کی نگاہوں سے دیکھے

سلیماں : مگر میں نے کس مہرباں کی عنایات کو
شک کی نظروں سے دیکھا
مجھے بھی بتاؤ کہ کس نے مجھے اپنے دستِ کرم سے نوازا
یہ مانا کہ میں دامنِ دل پسارے
سرِ رہگذر مدّتوں تک رہا ایستادہ
مگر کون ایسا سخی تھا
جو میری طلب کو بھی خاطر میں لایا
بتاؤ!

ہمزاد : نبیلا

سلیماں : نبیلا بھی اک رہرو تیز رَو تھی
اسی رہگزر کی۔ جہاں اَن گنت راہرو
اپنے حسن و مروّت کے نادر خزانے لیے
روز و شب
مست و مغرور ہر دم گزرتے رہے
ان میں کوئی بھی ایسا نہ تھا
جو مری تلخ تنہائیوں اور محرومیوں سے
بھری زندگی کو

مسرّت کے دو چار پل بخش دیتا
نبیلا ہیں اور دوسرے راہگیروں ہیں
گر فرق تھا تو بس اتنا
کہ اس کی نگاہوں نے دو چار لمحے
مری بے کسی کا تماشا بھی دیکھا
یہ اس کا کرم ہی سہی
پر تماشائی، اہلِ طلب کا
بھلا آسرا کب بنے ہیں

ہمزاد: نبیلا تماشائی تھی ..... ہوں
یہی تو بڑی بھول ہے میرے ساتھی
ذرا یاد کر وہ سمندر کی اک شام
جب آخری بار تجھ سے نبیلا ملی

سلیمان: نبیلا مجھے آخری مرتبہ کب ملی تھی!
مجھے آخری مرتبہ کب ملی تھی؟

(لہروں کا اثر)

ہمزاد: سمندر کی وہ شام
جب کالے بادل یکایک اُمڈ آئے تھے
اور فضا وقت سے پیشتر ملگجی ہو گئی تھی
نبیلا ترے ساتھ کشتی میں بیٹھی

خموشی سے لہروں کے انداز کو دیکھتی جا رہی تھی

(لہروں کا تاثر اور گھٹا کی گرج)

نبیلہ : یہ کالی گھٹا آج برسے گی
نیلے سمندر کی لہروں کا ہیجان بڑھنے لگا ہے
ہوا تیز تر ہو رہی ہے
سلیماں سفینے کو ساحل کی جانب بڑھاؤ

سلیماں : نہیں آج کی شام ہیبت فزا ہی سہی
پھر بھی طوفاں نہ آئے گا
میں جانتا ہوں
گھٹا کی گرج اور لہروں کا یہ شور
کچھ بھی نہیں ہے
کہ طوفاں کی آمد سے پہلے
طیور ایک مخصوص آواز میں چیختے ہیں
ابھی ایسی کوئی علامت نہیں ہے

نبیلہ : سلیماں
تمھیں کیا خبر کتنے طوفان ایسے بھی ہیں
جن کی آہٹ سے تم آشنا تک نہیں
پرندوں کی آواز سے تم فضاؤں کے تیور تو پہچان سکتے ہو
لیکن

دھڑکتے ہوئے دل کی چیخوں سے نا آشنا ہو
وہ طوفاں جو آنے کو ہے
سوچنے کی بھی مہلت نہ دے گا

سلیماں : نبیلا ...... میں سمجھا نہیں
تیری باتوں کے انداز معمول سے مختلف ہیں
تری گفتگو اجنبیّت کا پہلو لیے ہے

نبیلا : فقط گفتگو ہی نہیں بلکہ خود ہم بھی
اِک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں

سلیماں : وہ کیسے ؟

نبیلا : یقیناً ہم اک دوسرے کے لیے اجنبی ہیں
اور اب ہم جُدا ہو رہے ہیں

سلیماں : مگر میں نے یہ اجنبیّت
ملاقات کی اوّلیں شام سے لے کر اب تک نہ محسوس کی
پھر اچانک تمھیں آج کیوں یہ خیال آ گیا ہے

نبیلا : یہی تو ستم ہے
کبھی تم نے یہ بھی نہ سوچا
کہ میں کون ہوں ؟
کیا ہوں اور میں تمھیں کس لیے ......

سلیماں : مگر میں نے اس کی ضرورت نہ سمجھی

ہمارے لیے کیا یہ کافی نہیں ہے
کہ ہم دونوں اک شام
ساحل پہ اک دوسرے سے ملے
اور پھر یہ ملاقات
دونوں کا معمول سا بن گیا ہے
مجھے صرف تجھ سے غرض ہے نبیلا
فقط تیری موجودگی سے
بس اتنا بہت ہے
کہ جب تو مرے سامنے ہو
تو میں تجھ سے باتیں کروں
تجھ کو دیکھا کروں
تجھ کو پوجا کروں
اس پجاری کی مانند
جو مورتی کی پرستش کو ہی
حاصلِ زندگی جانتا ہو

نبیلا : مگر تابکے ہم میں یہ اجنبیّت کی دیوار حائل رہے گی
مری سانس اپنے ہی پیکر میں گھٹنے لگی ہے
تمھیں پتھّروں سے عقیدت ہے
خوابوں کی دنیا سے وابستگی ہے

مجھے زندگی کی طلب ہے
سلیماں !
مجھے زندگی کی طلب ہے

(بادل کی گرج اور سمندر کا شور)

ہمزاد : وہی آخری شام تھی اس ستارے کی
جو تیری تاریک دنیا میں جلوہ فشاں تھا
مگر تیری بے التفاتی کے کہروں نے
اس کی دھڑکتی ہوئی جھلملاہٹ کو دھندلا دیا
ہاں تجھے صرف پرچھائیوں کی تمنا تھی
پرچھائیوں سے کیسے روشنی مل سکی ہے

سلیماں : مگر وہ .....

ہمزاد : بتا کون ہے تیری محرومیوں اور تنہائیوں کا سبب
بول .... تو .... یا نبیلا

سلیماں : مگر وہ تو کچھ ساعتوں کے لیے میری دنیا میں آئی

ہمزاد : یہی چند لمحے تو برسوں کی تنہائیوں کا سبب ہیں

سلیماں : وہ کیا چاہتی تھی

ہمزاد : عقیدت کے سجدے نہیں — زندگی کے دھڑکتے تقاضے

سلیماں : نہیں یہ تری خود فریبی ہے
وہ .... وہ ..... کہاں ہے

ہمزاد : تجھے اس سے اب کیا غرض
اب تری کلبلاتی ہوئی زندگی کا ٹھکانہ
سمندر کی خاموش تہ ہے
سلیماں : نہیں .... اس سے پہلے کہ یہ تند موجیں
مری زندگی کے سفینے کو غرقاب کر دیں
میں اس سے ملوں گا
ہمزاد : مگر سوچ پاگل
اسے تجھ سے بچھڑے ہوئے اک زمانہ ہوا
بیس برسوں کی پھیلی ہوئی تیرگی کا زمانہ
اگر اتفاقاً کہیں تم ملے بھی
تو کیا تجھ کو اس کا یقیں ہے
کہ تیری نظر اس کو پہچان لے گی
سلیماں : اگرچہ بڑھاپے کے بے نور کہرے نے میری نگاہوں کو دھندلا دیا ہے
مگر میرے کانوں میں اب تک وہ آواز محفوظ ہے
جس کو برسوں کی ناآشنائی بھی پہچان لے گی
(موسیقی — سمندر کی شام کے اثرات)
سلیماں : سمندر کی یہ شام کس درجہ اندوہگیں ہے
مری زندگی کی طرح
سرد ، خاموش ، ویران

فقط چند ساحل نشیں
وہ بھی کھرے ہیں لپیٹے ہوئے
ایستادہ ہیں
کیا آج کی شام بھی مجھ کو مایوس ہی لوٹنا ہے
آواز : (دور سے) نگینہ ادھر آؤ بیٹی یہ لہریں خطرناک ہیں
بس کنارے پہ کھیلو
سلیماں : یہ آواز کس کی ہے
جس سے مری روح تک گونج اُٹھی ہے
آواز : نگینہ۔ ادھر آؤ بیٹا
سلیماں : وہی ہے — وہی ہے یہ آواز
میں نے جسے سالہا سال تنہائیوں میں سُنا ہے
یہی ہے مری جستجوؤں کا مرکز
مری آرزوؤں کی دنیا
نبیلا
وہی قد و قامت
وہی دلنشیں نقش موزوں پیکر
فقط وقت کے شعبدہ گر نے
بالوں کی کالی گھٹاؤں میں کچھ چاندنی گھول دی ہے
— مگر مجھ کو پہچان بھی پائے گی وہ

میں اس کو پکاروں تو کس نام سے
پاس جاؤں تو کیسے
مرے دل کی دھڑکن
خداوند..... کیسے پکاروں
مگر کب تلک یہ کشاکش
یہ لمحہ جو برسوں کے پیہم تجسّس کا حاصل ہے
کیسے گنوا دوں ... خداوند
....
خاتون!...... (آہستگی سے)
خاتون!! (قدرے بلند آواز سے)
اگر بارِ خاطر نہ ہو تو میں — اک بات پوچھوں
مرا مدّعا ہے مجھے آپ پہچانتی ہیں

خاتون : نہیں تو — مگر آپ کا اس سے مقصد

سلیمان : یونہی — مجھ کو اک گمشدہ چیز کی جستجو تھی
مجھے یہ گماں ہے کہ میں آپ کو جانتا ہوں

خاتون : مجھے؟

سلیماں : ہاں مگر آپ کی کیا خطا
سالہا سال کا بُعد پل بھر کی قربت سے کب مٹ سکا ہے

خاتون : میں سمجھی نہیں اجنبی — آپ کیا چاہتے ہیں

سلیمان : میں کیا چاہتا ہوں ؟
سمندر کی اس شام کی یاد
جب آپ اسی اجنبی سے ملی تھیں

خاتون : مگر کب

سلیمان : کئی سال پہلے
ذرا اپنے ماضی کے لمحات کو دھیان میں لا کے سوچیں
تو شاید کسی نقش کو آپ پہچان جائیں ۔

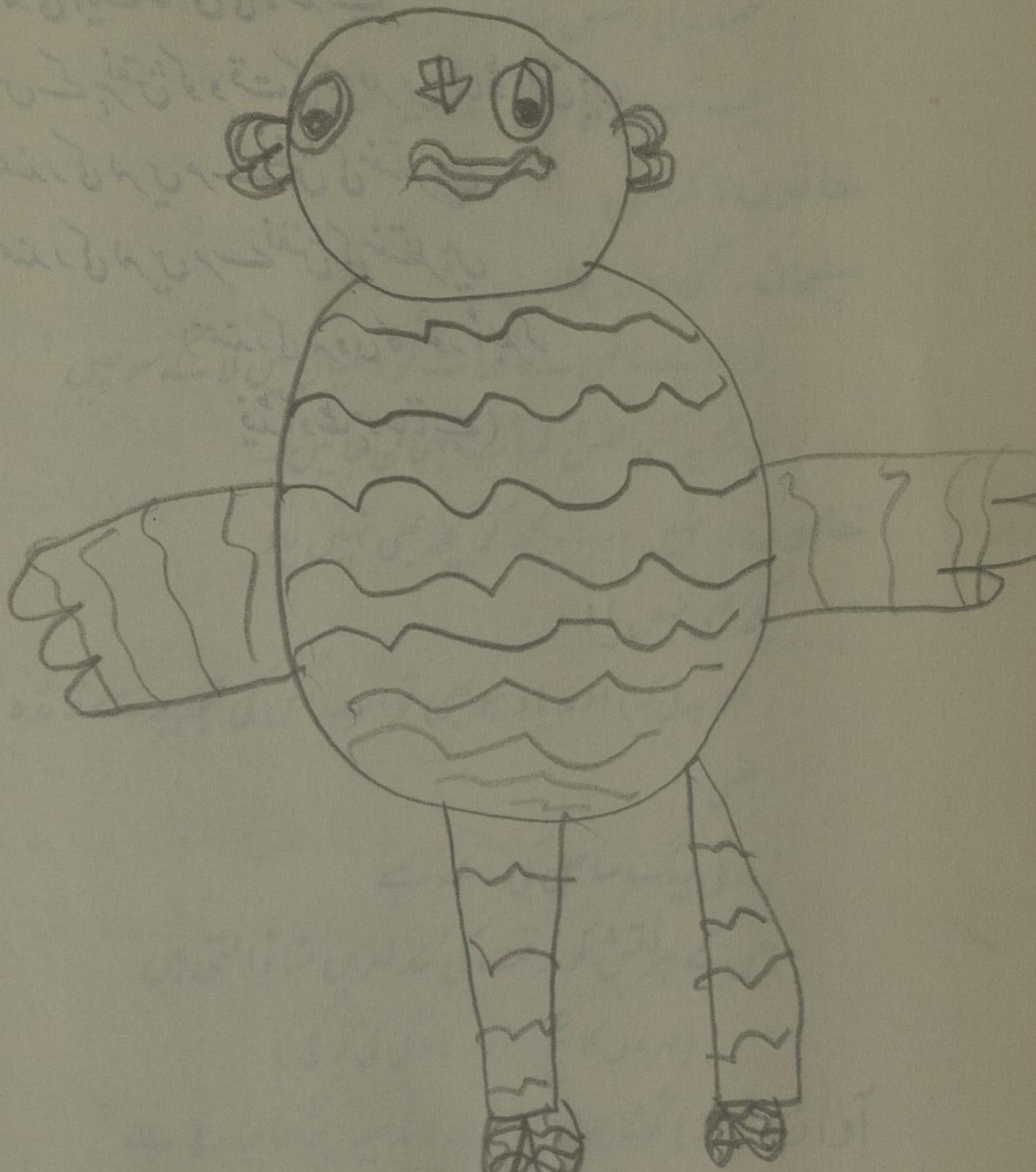
خاتون : نہیں ..... مجھ کو کچھ بھی نہیں یاد
کچھ بھی نہیں یاد
(لہجہ بدل کر) اور یاد ہو بھی تو اب اس کی تجدید سے فائدہ
اجنبی
زندگی ریگ ساحل کی مانند ہے
جس کے ہر نقش کو وقت کی تند لہریں مٹا ڈالتی ہیں

(لہروں کا شور اور بادل کی گرج)


آواز : نگینہ ! گھٹا چھا رہی ہے اندھیرا بڑھا جا رہا ہے
(دُور سے پکارتے ہوئے) چلو گھر چلیں


سلیمان : ہوا تیز ہونے لگی ہے
(اپنے آپ سے) پرندوں کی آواز میں ایک وحشت سی ہے
جیسے طوفان آنے کو ہو

جیسے طوفان آنے کو ہو
زندگی ایک ساحل کی مانند ہے
جس کے ہر نقش کو وقت کی تیز لہریں مٹا ڈالتی ہیں
سمندر کی لہریں مرے نقش کی منتظر ہیں
سمندر کی لہریں مرے نقش کی منتظر ہیں
(سمندر کی لہروں کا شور اُبھر کر
فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے)



موم کے پتّھر





بوڑھا : یہ شب کس قدر سرد ہے میرے آقا
سرِ شام ہی سے ہواؤں کا نم
آج بوجھل تھا
ہر سمت پھیلی ہوئی دھند نے
سامنے کے پہاڑوں کو کفنا دیا تھا
پہاڑی پرندوں کی چیخیں بھی
اب برف میں دب چکی ہیں
چلو اپنے کمرے میں آقا
(خود کلامی کے انداز میں)
انگیٹھی میں گو صبح سے آگ روشن ہے، پھر بھی
دسمبر کی یہ رات
شاید
جہنّم کے ایندھن سے بھی گرم ہونے نہ پائے
فریدوں : نہیں

مجھے بیٹھنا ہے ابھی اس جگہ
جب تلک میرا سینہ
مرے دُکھ کے شعلوں سے دوزخ بنا ہے
بوڑھا: مگر آج موسم بڑا جان لیوا ہے آقا
فریدوں: مجھے زندگی کی ضرورت نہیں ہے
مرا جسم اس زخم کی زہرناکی سے سن ہو چکا ہے
جو کچھ روز پہلے
مجھے زندگی کی تمنّا نے بخشا
مرے واسطے اب
دسمبر کی یہ برف باری ہو،
یا
جون کی چلچلاتی ہُوئی دھوپ ہو،
ایک سی ہے
بہاروں —— خزاؤں
اجالوں —— اندھیروں کے رشتے
فقط زندگی سے عبارت ہیں
اور زندگی
بس لہو کی حرارت ہے بابا
بوڑھا: مگر زندگی تو.....

فریدوں: مری زندگی عالیہ تھی
فقط عالیہ
جس سے میرے لہو میں حرارت تھی
خوابوں میں رونق تھی
سانسوں میں تحریک تھی
اور جسے وقت کے سرد و بے مہر ہاتھوں نے
مجھ سے جدا کر دیا ہے
مری زندگی چھن چکی
لُٹ چکی
بجھ چکی ہے
مری زندگی!
بوڑھا: گئے وقت کو کون لوٹا سکا ہے
کبھی جانے والے پلٹ کر بھی آئے
اور آئے تو کب — جب سسکتے ہوئے منتظر
جسم خاشاک کا ڈھیر بن کر
بگولوں کے گرداب میں ڈوب جاتے ہیں
اور ان کے ذرّے
قیامت تلک اپنے بچھڑے ہوئے پیکروں کو
نہیں ڈھونڈھ پاتے

فریدوں : مگر ان کے سائے
مگر ان کی یادیں
ہمیں آخری سانس تک خوں رُلاتی ہیں بابا
بوڑھا : بجا میرے آقا
مگر وقت کا شعبدہ گر
جو قاتل بھی ہے اور مسیحا بھی
ہر زخم کو اپنی رفتار سے بھر بھی دیتا ہے آخر
بڑے سے بڑا داغ بھی بھول جاتا ہے انساں
فریدوں : مگر یہ مشیّت کا کتنا بڑا ظلم ہے آدمی پر
بوڑھا : نہیں میرے آقا نہیں
یہ تو اس کا کرم ہے
وگرنہ یہ دنیا
جہاں آنسوؤں اور دکھوں کے ذخیرے ہیں
اور جس جگہ قحط ہے راحتوں کا
ہمیں تلخ یادوں سے جینے نہ دیتی
فراموش کوشی کی نعمت تو قدرت کا احسان ہے ہم پہ آقا
ابھی آپ کی زیست کا نخلِ شاداب
پہلی خزاں سے شناسا ہُوا ہے
مگر میں کہ اک سالخوردہ شجر ہوں

مری خشک و بے برگ شاخوں نے
برسوں
کڑے موسموں کے ستم اور طوفان دیکھے
مرا تجربہ ہے
کہ انساں اگر بھول جانے کی قدرت نہ رکھتا
تو میں اور میرے سن و سال کے لوگ دیوانے ہوتے

فریدوں: نہیں — میں نہیں بھولنا چاہتا عالیہ کو
نہ میں بھول سکتا ہوں اس کو
جو اب بھی مرے سامنے ہے
مرے سامنے ہے
وہ دیکھو
ادھر
شہ بلوط اور شیشم کے پیڑوں کی پگڈنڈیوں سے
گزرتی ہوئی دھند میں
روشنی سی بھری ہے
کہ جیسے کسی سمگوں ابر پارے میں
لپٹا ہوا چاند
آسودگی سے رواں ہے
یقیناً یہ مانوس سی روشنی

عالیہ ہی کے پیکر کی ہے
جس کو اُونچے پہاڑوں
بلوط اور شیشم کے پیڑوں
بلندی سے گرتی ہوُئی آبشاروں سے
اور آسمانوں کی مانند
چاروں طرف پھیلتی دھند سے عشق تھا
کس ادا سے
وہ میری طرف آرہی ہے
ادھر
عالیہ!
عالیہ!!

بوڑھا: خدا کے لیے آپ خود کو سنبھالیں
یہ سوچیں یہ تنہائیاں
آپ کی زندگی کو جہنّم نہ کر دیں
یہ سب واہمے ہیں
فقط واہمے — صرف آنکھوں کے دھوکے
خیالی ہیولوں سے وابستگی
اور ان کا تعاقب تو دیوانگی ہے
جنوں ہے
اگر آپ اس سالخوردہ نمک خوار کی بات مانیں

تو ان غیر آباد اُونچے پہاڑوں کی وادی کو
کل صبح ہی چھوڑ جائیں
یہاں تلخ تنہائیوں کے سوا اور کیا ہے

فریدوں : یہ سوچیں
یہ تنہائیاں
یہ خیالی ہیولے
یہ اُونچے پہاڑوں کی سنسان وادی
یہی کچھ تو اب زندگی ہے
یہاں دوسروں کے لیے کچھ نہ ہو تو نہ ہو
پر مرے واسطے
ایک دنیا ہے
میری تمنّاؤں خوابوں کی دُنیا
یہاں کی فضا عالیہ کی نم آلود آنکھوں کی مانند
سحر آفریں ہے
یہاں کی ہَوا اس کی سانسوں کی مانند
خوشبو سے بوجھل ہے
نغموں سے پُر ہے
یہاں کے پہاڑوں میں اس کی وفا کی طرح
استقامت ہے

اس کی محبّت کی مانند وسعت ہے
اس کی نگاہوں کی صورت بلندی ہے
یہ پھیلتی دُھنداس کے خیالوں کی مانند
دلکش ہے خوابوں میں ڈوبی ہوُئی ہے
یہیں اسس فضا اس ہوا میں
مری جنّتِ گمشدہ ہے
میں اپنی متاعِ وفا کو یہاں کس طرح چھوڑ جاؤں

بوڑھا: نگرتا بکے!
آپ اس وحشت انگیز ماحول میں
کب تلک رہ سکیں گے
یہاں صرف بے جان پتھّر
فقط پا بہ گل پیڑ
اور ہم سے بے روح انسان ہیں
شہر کی رونقیں ہاؤ ہو —— زندگی
آپ کی منتظر ہے
یہاں آپ ترُبت کا پتھّر بنے
کب تلک
زندہ لمحوں پہ روتے رہیں گے

فریدوں! یہ سچ ہے

کہ اب میں فقط سنگِ تربت ہوں
اپنی تمنّا کا بے جان سایہ
مگر تم اسی شہر کو لوٹ جانے کو کہتے ہو بابا
جہاں سے مجھے
عالیہ ــــ اس سکوں بخش بستی میں لائی تھی
تاکہ مرا فن
جو شہروں کی مسموم تہذیب
مصنوعی تابندگی
اور بیمار اقدار کے محبسوں میں
مقیّد تھا
آزاد ہو کر
نئی زندگی سے لہو لے
نئی زندگی، جو پہاڑوں کی صورت
توانا ہے
چشموں کی صورت رواں ہے
چناروں کی مانند
آتش بجاں ہے
اسے میرے فن سے مری شاعری سے
پرستش کی حد تک محبّت تھی ــــ بابا
اسے میری ہر ایک تخلیق سے

والہانہ عقیدت تھی
وہ چاہتی تھی
کہ میرے قلم سے
وہ شہکار ٹپکیں
جو رہتے جہاں تک رہیں
تا ابد — جاوداں
اسے مجھ سے بڑھ کر مرے فن سے وابستگی تھی
مگر میں
جو الفاظ کے بتکدوں کا تھا آذر
فقط عابدہ کے تصوّر میں
اس کے خد و خال میں
اس کی قربت کی لذّت میں
گم ہو چکا تھا
خیالوں کے بیکل ہیولے
مری جنبشِ آذری کو ترستے ترستے ہی
دم توڑ دیتے۔ مگر مجھ کو ان کی فنا کا قلق تک نہ ہوتا
بوڑھا: میں سمجھا نہیں میرے آقا!
فریدوں: مری زندگی جس طلب کی دہکتی ہوئی آگ میں

روز و شب جل رہی تھی
اسے عالیہ کی وفا کی گھٹا نے بجھایا
تو جیسے مرے ہونٹ چپ ہو گئے ہوں
مری روح کے جھنجھناتے ہوئے تار
نغموں کی آغوش میں سو گئے ہوں
اور اک شام جب
عالیہ
طائرِ باد و باراں زدہ کی طرح
راہگیروں کی مشکوک نظروں کے تیروں سے
خود کو بچاتی مرے پاس آئی
تو اس کی وفادار آنکھوں میں
معمول کی تشنگی کی بجائے
اک افسردگی تھی
عالیہ : فریدوں!
کہو کوئی تخلیقِ تازہ
فریدوں : نہیں
جانے میری طبیعت کو کیا ہو گیا ہے
مرے شوق کا ساز
مدّت سے چپ ہے

نہ نوحہ نہ نغمہ

کہ جیسے مری زندگی کا خلا
تیری قربت سے پُر ہو گیا ہے
خلا — جو مرے فن کی صورت ہیں
میری سسکتی تمنّاؤں کو
زندگی کا لہو بخشتا تھا
مگر جیسے اب تو
مری سوچ کی تنگنائیوں میں گاتی ہوئی
درد کی ندیاں خشک و بے آب ہیں
اور خیالوں کے پیاسے پرندے
یہاں سے سفر کر چکے ہیں
مری خواہشوں کا سمندر
تری ذات کے ساحلوں میں گھرا
کس قدر پُر سکوں ہے
اور اب مجھ کو جینا ہے
تیرے لیے - تیری آسودگی کے لیے
فن تو کربِ مسلسل کے اظہار کا نام ہے
کرب کا سحر ٹوٹے
تو بُت ایک بے ڈول پتھّر ہے

نغمہ فقط ایک بے کیف آواز
اور شاعری صرف لفظوں کی بے جان سطریں
مری شاعری اب تمھیں ہو
مرے فن کی معراج
اب تم سے بڑھ کر
مری خواہشوں کے لیے کوئی منزل نہیں ہے

عالیہ : تو پھر یوں کہو
وہ فریدوں جو فنکار تھا
جس کے نغموں سے، گیتوں سے، فن سے
مجھے پیار تھا
مر چکا ہے
مجھے جس فریدوں سے وابستگی تھی
وہ خالق تھا
ان شاہکاروں کا
جو زندگی کے دکھوں ـــــ راحتوں
آنسوؤں ـــ قہقہوں
ظلم کی شدّتوں ـــــ درد کی لذّتوں
کے امر نقش ہیں
نقش گر!

تو نے یہ بھی نہ سوچا
کہ میں تیری تخلیق کے معبدوں میں
فقط اک پجاری کی صورت ہیں
دیوی نہیں ہوں
مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے
تیری وفا سے نہیں ہے
اجنتا کے غاروں کے نقّاش
دشتِ فنا کے مسافر ہوئے
پھر بھی ان کے
دل و دست کی کاوشیں
جاوداں ہیں
اگر میری قربت مری چاہتوں نے
ترے شوق کو بے زباں کر دیا ہے
اگر میری آواز کی تشنگی نے
تری زیست کا ہر خلا بھر دیا ہے
تو پھر میں وہ قاتل ہوں
جس نے
ترے جسم کو
شہد کے روپ میں

زہر دے کر
فنا کر دیا ہے
مجھے خود سے نفرت ہے لازم
میں قاتل ہوں
قاتل ہوں
قاتل — فریدوں

فریدوں : نہیں عابدہ
تو مری زندگی ہے — مری روح ہے
تجھ سے میری نگاہوں میں تابندگی
میرے دل میں حرارت ہے
پیکر میں جاں ہے
مسیحا!
ترے مہرباں ہاتھ
میرے ہر اک زخم کے چارہ گر ہیں
اگر میری محرومیوں — میری تنہائیوں
میرے سارے دکھوں کی تپش بجھ گئی ہے
تو اس کا سبب
میری تسکیں پرستی ہے
تیری وفا تو نہیں ہے

مرے مطمئن روز و شب
میری سوچوں کی میٹھی چبھن لے اُڑے ہیں
میں اب لفظ و معنی کی صورت گری کی بجائے
فقط تیری قربت، تری ہمنشینی کی
آسودگی چاہتا ہوں
میں قدرت کے شہکار کے سامنے
اپنے لفظوں کی تخلیق کو
ہیچ گردانتا ہوں
یہی میرے خونِ جگر کا ثمر
میری برسوں کی دیوانگی کا صلہ ہے

مری عالیہ
میرے ماضی میں اور حال میں کس قدر فاصلہ ہے

عالیہ . فریدوں — یہ سب کچھ سہی
پھر بھی اپنی نظر میں — میں مجرم رہوں گی
مجھے بھی ترا قرب
آسودگی بخشتا ہے
مرے واسطے بھی تری انجمن میں
وہ سب کچھ ہے جس کے سوا
زندگی اک خلا ہے

اندھیری گپھا ہے
مگر ہم
اگر صرف لمحات کے جگنوؤں پر
ازل سے ابد تک
سدا رہنے والے اجالوں کو
قربان کر دیں
تو یہ کس قدر ظلم ہوگا
ترا فن تو صدیوں کی تابندگی کا امیں ہے
جو میری خوشی اور تیری مسرّت سے
بڑھ کر مقدّس ہے
بڑھ کر حسیں ہے
مری آرزو ہے فریدوں
کہ تو اپنی عظمت کی ان چوٹیوں پر کھڑا ہو
جہاں سے تجھے ساری دنیا کی آنکھیں
عقیدت سے دیکھیں
مرے روشنی کے فلک بوس مینار!
میری تمنّا کے معیار
میں تجھ پہ نازاں رہوں گی

فریدوں : مرے فن کی معراج!

خوابوں کی تعبیر!!
اگر تیری چاہت کا معیار یہ ہے
تو میں زندگی کا ہر اک پل
ہر اک سرخوشی
ہر تمنّا — تری آرزو پر نچھاور کروں گا
مرا عہد ہے عالیہ
آج سے میرے دل اور مرے ذہن کی سب
حرارت — توانائی
خونِ جگر کی ہر اک بوند!
فن کی بقا کے لیے صرف ہوگی

عالیہ: فریدوں
ترا عہد میری وفاؤں کا ضامن رہے گا

فریدوں: مگر مجھ کو اس شہر کے روز و شب
اس کی ہنگامہ پرور فضا
شور و طوفاں بھری زندگی سے
کہیں دور جانا پڑے گا
جہاں میں سکوں کے سمندر سے
افکار کے ایسے موتی چنوں
جو ترے درخورِ اعتنا ہوں

عالیہ : یہی میں بھی کہنے لگی تھی
یہاں سے فقط تین سو میل کے فاصلے پر
پہاڑوں کے سینے پہ کہسارِ مرجان کے نام کی
ایک بستی ہے
یہ بادلوں اور گھٹاؤں
سلگتے چناروں حسیں آبشاروں
مہکتے ہوئے لالہ زاروں
خوش الحاں پرندوں کی دنیا
کسی وقت میں
آریائی قبیلوں کا مسکن رہی ہے
مگر اب فقط
علم تاریخ کے ماہروں اور اہلِ سیاحت
کی نظروں کا مرکز ہے
تخلیق و تصنیف کے واسطے
انتہائی مناسب رہے گی
گزشتہ کئی ماہ سے میرے ابّو بھی
جو ایک تاریخ داں ہیں
وہیں جاگزیں ہیں
بڑی خوبصورت جگہ ہے

فریدوں : یہ سب کچھ سہی پر . . . .
عالیہ : تمھیں واں رہائش کی بھی کوئی زحمت نہ ہوگی
فریدوں : مگر . . . . .
عالیہ : میں بھی کچھ روز تک واں چلی آؤں گی
میرے ابّو نے مجھ کو بلایا ہے — جو اپنی تخلیق کے سلسلے میں
ابھی کچھ مہینے وہیں ہیں
فریدوں : تو پھر ٹھیک ہے
کچھ دنوں تک میں اس شہر سے چل پڑوں گا
عالیہ : تو یہ طے ہُوا
فریدوں : ہاں
عالیہ : تو بس ٹھیک ہے اب اجازت
فریدوں : خدا حافظ اے میری دنیا
عالیہ : مسافت بخیر!

(موسیقی)

پروفیسر : مجھے عالیہ نے لکھا تھا
کہ آپ آ رہے ہیں
یہ بستی کم آباد اور پُرسکوں ہے
مجھے شاعری سے زیادہ شغف تو نہیں ہے
مگر عالیہ میری بیٹی کی تحریر سے یہ عیاں ہے

کہ وہ آپ کی شاعری اور فن کی
بڑی معتقد ہے
فریدوں: یہ ان کی فقط قدردانی ہے
ورنہ مرا فن ابھی
اس مقام اور عظمت سے ناآشنا ہے
جو اوروں کی تعریف کا مستحق ہو
پروفیسر: یہاں کی فضا میں وہ جادو ہے
جو اک مؤرخ کو بھی شعر کہنا سکھا دے
(وقفہ دے کر)
مجھے ان پہاڑوں کی پگڈنڈیوں پر سے
گزرے ہوئے قافلوں کے
نقوشِ قدم ڈھونڈنے ہیں
مؤرخ تو ماضی میں رہتا ہے
لیکن یہاں حال اتنا حسیں اور زندہ ہے شاعر
کہ میں سوچنے لگ گیا ہوں
یہاں کوئی ماضی نہیں تھا
بہرحال اگر آپ چاہیں تو
جب تک یہاں ہیں
مرے ساتھ ٹھہریں

یہاں آج کل ایک سیّاح بھی
میرے ہمراہ ٹھہرا ہُوا ہے
بہت خوش مزاج اور انوکھے خیالات کا نوجواں ہے
اگر آپ بھی ہوں
تو جنگل میں منگل کا عالم رہے گا

فریدوں: کرم گستری
آپ کا قرب میرے لیے عین راحت ہے
پر میں نہیں چاہتا
میری موجودگی آپ کے روز و شب میں مخل ہو
اگر مل سکے تو مرے واسطے ڈاک بنگلہ مناسب رہے گا

پروفیسر: چلیں جس طرح آپ خوش ہوں
یہاں ڈاک بنگلہ بھی خالی پڑا ہے
اگرچہ جگہ پُر فضا ہے مگر پھر بھی تنہائیاں جان لیوا ہیں
کوئی تو ہو، جس سے کچھ دیر کو آدمی گفتگو کر سکے
میں یہاں کچھ مہینوں سے ہوں
اور گاہے بہ گاہے اگر کوئی سیّاح
یا کوہ پیماؤں کا کوئی ٹولہ
ادھر آگیا تو یہ سب سے بڑی خوش نصیبی ہے
وگرنہ یہ جنّت — جہنّم سے بڑھ کر عذاب آفریں ہے

اسی واسطے عالیہ کو بھی میں نے لکھا ہے
کہ وہ کچھ دنوں کے لیے ہی سہی، کوہ مرجان آئے

فریدوں: بجا یہ مرا بھی تأثّر ہے
اتنی کم آباد بستی میں انساں کا ملنا مسیح و خضر
کی ملاقات سے بھی ہے بہتر
تو میں شام تک ڈاک بنگلے سے آجاؤں گا

پروفیسر: ہاں وہ سیّاح بھی جب تلک لوٹ آئے گا
اور خوب محفل رہے گی

فریدوں: بہت خوب

پروفیسر: ٹھہریں، کسی شخص کو آپ کے ساتھ کر دوں

فریدوں: نوازش — مرے ساتھ میرا پرانا ملازم بھی ہے
جو یہاں کی ہر اک راہ سے آشنا ہے

پروفیسر: تو پھر شام کو آپ آئیں گے

فریدوں: جی ہاں

(موسیقی)

(قہقہوں کی آواز، پیالیوں کی کھنک)

پروفیسر: چلو اب یہیں بحث کو ختم کر دیں
مؤرّخ سے شاعر کا رتبہ بڑا ہے

عالیہ: نہیں یوں نہیں

آپ یہ مانتے ہیں
کہ اس روز و شب کی مسافت میں جس موڑ پر بھی
اندھیری گپھائیں ملی ہیں
تو تاریخ کی آنکھ پتھرا گئی ہے
مگر شاعری کی نوا تیرگی کی سلیں چیر کر
روشنی کے وہ سیلاب لائی
کہ جس کی چکاچوند کی تاب، چشم مؤرّخ نہیں لا سکی ہے
مؤرّخ تو میری نگاہوں میں
اس شپرک کی طرح ہے
کہ جس کا ٹھکانہ
شکستہ در و بام، مدفون آبادیوں اور مسمار قبروں
کے کتبے رہے ہیں
فقط بادشاہوں کے اُجڑے محلّات اور مقبروں کے
سن و سال کی یاد — اس کی متاعِ عمل ہے
ہیون سانگ سے ابن خلدون اور بعد تک کے مؤرّخ
سبھی صرف حیرت کے ساحل سے بس بے گہر سیپیاں چن سکے ہیں
مگر درِ شہوار — ہومر، سفوکلیس، ملٹن، سین تانگ، فردوسی
اور شیکسپیئر کا مقدّر رہے ہیں

پروفیسر: اور سیّاح؟

عالیہ : ابو سیاحت تو اک انفرادی مسرت ہے
جس کا تعلق ہمہ گیر قدروں سے ہرگز نہیں ہے
مجھے کیا، اگر آپ نے نینوا اور بابل کے منظر
اجنتا کے غاروں کی نقاشیاں ، مصر کے
آسماں بوس اہرام، یونان کے سنگ پیکر
عرب کے مقدّس مقامات یا کافرستاں
کی وادی کو دیکھا
مگر کیٹس ، خیّام، حافظ ، شیلے ، بائرن
اور غالب کے شہکار سب کے لیے
دولت مشترک ہیں
اک ایسی مسرّت جو ہر دَور میں ہر کسی کے لیے ہے
فریدوں : نہیں یوں نہیں ہے
مؤرخ میں سیّاح میں اور شاعر میں جو فرق ہے
وہ بجا — پر کسی ایک کا دوسرے سے تقابل غلط ہے
میں خود ایک شاعر ہوں پھر بھی مؤرّخ کے اعلیٰ مقام
اور سیّاح کی عظمتِ رہ نوردی سے منکر نہیں
آپ کی گفتگو کچھ دل آزار پہلو لیے ہے
پروفیسر : مجھے بھی یہ کہنا تھا بیٹا — یہ سیّاح مہمان ہیں
اور

سیّاح : نہیں مجھ کو کوئی شکایت نہیں
اور نہ زعم اور دعویٰ ہے کوئی
سیاحت تو محض ایک تفریح ہے
یہ جُدا بات ہیں فنِ تخلیق و تحقیق سے اس کو کمتر نہ سمجھوں
پروفیسر : چلو بات کو ختم کر دیں
اور اب عالیہ گرم کافی پلاؤ
فریدون بیٹا کوئی تازہ تخلیق ؟
سیّاح : ہاں آپ کے فن کی عظمت کے سب معترف ہیں
کوئی نظم ؟

(موسیقی)

(چڑیوں اور پرندوں کی چہکار)

عالیہ : فریدوں کہو یہ فضا تم کو اچھی لگی
فریدوں : ہاں بڑی خوبصورت جگہ ہے
یہاں کا سکوں، حسن اور پھر تمھاری رفاقت
مری ذات اور میرے فن کے لیے کیمیا ہے
عالیہ : تمھیں میرے ابّو . . . . .
فریدوں : بہت ہی پسند آئے، اُن کی طبیعت کی نرمی، ملنسار لہجہ
محبّت بھرا دل

اور ان سے سوا

ان کا بے انتہا علم، جس نے انھیں ایک نادر معلّم کا رُتبہ دیا ہے
مرے واسطے ان کی قربت بڑی قیمتی ہے
عالیہ: مگر ان کی آواز میں کتنا دُکھ ہے فریدوں
فریدوں: مجھے بھی یہ محسوس ہوتا رہا ہے
وہ جب بولتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کسی درد کی آگ
لفظوں سے لپٹی ہوئی ہے
عالیہ: یہ دُکھ بیس برسوں سے ان کو شب و روز
گھُن کی طرح کھا رہا ہے
مری ماں کا دُکھ
جو مجھے یاد تک بھی نہیں ہے
مری عمر مشکل سے جب دو برس تھی
اک ایسی ہی بستی میں اُونچی پہاڑی کی ڈھلوان پر سے
پھسل کر — وہ ہم سے جُدا ہو گئی تھی
مجھے یاد تک بھی نہیں ہے
مگر میرے ابّو اسی دُکھ کو دل سے لگائے سلگتے رہے ہیں
اسی واسطے ان کو ماضی سے، ماضی کی ہر شے سے اُلفت سے
چاہے وہ تاریخ عالم کا قصّہ ہو یا بیتے رفتہ کی یادیں
وہ مجھ کو بہت چاہتے ہیں
کبھی بھی نہ میری کسی بات پر ان کی تیوری چڑھی ہے

نہ وہ مجھ سے رُوٹھے ہیں

میں نے بھی ان کی ہر اک بات کو فرض سمجھا

فریدوں : عجب بات ہے عالیہ

ہم انبا ہر جسے دُکھ سمجھتے ہیں جاں کا زیاں جانتے ہیں

اسی دُکھ کی شدّت

ہمارے شب و روز کے آئنوں کو جلا بخشتی ہے

یہی دُکھ اگر جسم کا جزو ہو

تو نتیجہ فنا ہے

مگر روح میں رچ سکے تو

اسی پیکرِ آب و گل کو پیمبر بنا دے

امرٹ، بے کراں، جاوداں

سبّاح : (داخل ہوتے ہوئے)

ارے تم ابھی تک

یہاں کاغذوں کے پلندوں میں ڈوبے ہوئے ہو

کبھی تو خیالی فضاؤں سے باہر نکل کر

ذرا جاگتی زندگی کے دھڑکتے ہوئے رنگ دیکھو

فضا میں برستی ہوئی برف کا رقص

دیوانہ گر ہے

فریدوں : فضاؤں کا منظر بہت خوبصورت سہی

پر مجھے اس گھڑی اپنی دنیا سے فرصت نہیں ہے

عالیہ : فریدوں چلو گھوم آئیں

فریدوں : نہیں عالیہ اس سمے مجھ کو معذور سمجھیں

سیّاح : تو پھر عالیہ آپ آئیں — ہم ان کے خیالات
میں کیوں مخل ہوں

عالیہ : چلو گھوم لیتے ہیں — اور ہاں فریدوں
ہماری طرف شام کو آؤ گے
ذرا آج ابّو سے محفل رہے گی

فریدوں : یقیناً — مگر عالیہ

عالیہ : کیوں فریدوں

فریدوں : نہیں کچھ نہیں، بے ارادہ ہی کچھ کہہ دیا تھا

سیّاح : یہ شاعر عجب لوگ ہوتے ہیں، ہر دم خیالوں میں گم سم
گھڑی میں اُجالے گھڑی میں اندھیرے

(عالیہ اور سیّاح ہنستے ہوئے نکل جاتے ہیں)

فریدوں : (اپنے آپ سے) گھڑی میں اُجالے گھڑی میں اندھیرے
اندھیرے اُجالے
اُجالے اندھیرے
یہی زندگی ہے
کہیں ناچتے تند شعلے

کہیں برف کا رقص جاری
یہ کیوں ایک بے نام سا خوف مجھ پر ہے طاری
مرا وہم میرے خیالوں کی جادوگری ہے
وگرنہ مری عالیہ
میرے خوابوں کی پیکر
کہ جس کی وفادار آنکھوں کو
کوئی کشش بھی نہ بہکا سکی ہے
نہ بہکا سکے گی
اندھیرے اُجالے
اُجالے اندھیرے

(فیڈ آؤٹ)

عالیہ : (داخل ہوتی ہے)
فریدوں ابھی تم یہیں ہو
وہاں ہم سبھی منتظر تھے تمھارے
چلو آج کی شام اکٹھے گزاریں
کہ کل کی شعاعِ سحر — کیا خبر
کیا دکھائے
فریدوں : میں سمجھا نہیں عالیہ
عالیہ : بات یہ ہے کہ سیّاح کل جا رہا ہے

فریدوں : مگر یوں اچانک
عالیہ : عجب لااُبالی طبیعت ہے اس کی
وہ کہتا ہے سیاح دریا ہے جوہڑ نہیں ہے
حقیقی سیاحت تو ملکوں سے شہروں سے ہو کر گزرنا ہے
رکنا نہیں ہے
اگر ایک سیّاح سمجھے
کہ کوئی جگہ اس کو دل سے پسند آ گئی ہے
تو اس کے لیے بہتری ہے اُسی میں
کہ فوراً وہاں سے وہ چل دے
ہر اک چیز کا حسن بس اجنبیت کی حد تک ہے
چاہے وہ نادیدہ خطّے ہوں یا صورتیں ہوں
مجھے یہ جگہ اور پھر آپ لوگوں کی قربت پسند آ گئی تھی
اسی واسطے میں نے کل کوچ کا فیصلہ کر لیا ہے
فریدوں : چلو — اس کی مرضی
عالیہ : مگر جانے ابّو کو کیا ہو گیا ہے
وہ اس پر مصر ہیں کہ سیّاح کچھ روز تک اور ٹھہرے
فریدوں : مگر کیوں ؟
عالیہ : نمعلوم کیوں . . . . شاید ابو کو اس کی خوش آہنگ و دلچسپ باتیں

پسند آگئی ہیں ..... اسی واسطے .....

فریدوں : ہاں کہو

عالیہ : کچھ نہیں

فریدوں : ہاں اسی واسطے ؟

عالیہ : وہ اسے مستقل طور پر اپنے یاں .....

فریدوں : عالیہ !

عالیہ : مجھ کو احساس ہے

پر یہ ہونا ہے

ابو یہی چاہتے ہیں

مجھے یاں بلانے سے ان کا یہی مدعا تھا

کہ میں ان کی خواہش کی تائید کر دوں

فریدوں : تو گویا تمھیں بھی .....

عالیہ : فریدوں ! تمھیں شاید اس شام کی گفتگو یاد ہو

میں نے جب بحث کی آڑ میں اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیا تھا

مگر پھر بھی ابو نہ سمجھے

نہ سمجھے کہ وہ بس وہی چاہتے ہیں — جو وہ چاہتے ہیں

فریدوں : مگر تم

عالیہ : اگر ان کی سب زندگی صرف میرے لیے

ایک صحرا کی مانند ویراں رہی

ان کی سب خواہشیں، آرزوئیں مری پرورش
میری خوشیوں کی خاطر شب و روز پامال ہوتی رہی ہیں
تو میں کس طرح — کس طرح
صرف اپنے لیے — اپنے معیارِ ذہن و نظر کے لیے
ان کے دکھ بھول جاؤں

فریدوں : مگر میرے دُکھ عالیہ، میرے دکھ

عالیہ : تم فسردہ نہ ہو

فریدوں : جیسے میں جاں سے عاری ہوں پتّھر ہوں بے حس ہوں
میری کوئی آرزو کوئی خواہش نہیں
پتّھروں پر بھی تیشہ پڑے تو صدائیں نکلتی ہیں
چنگاریاں پھوٹتی ہیں

عالیہ : مگر تم تو شاعر ہو شاعر — عظیم اور برتر
جو خود اپنے ناسور دل میں چھپائے ہوئے
دوسروں کے لیے راحتیں ڈھونڈتا ہے
مسیحا تراقن تو اوروں کو جاں بخشتا
اور خود درد کی دار پر جھولتا ہے
اگر اس جہاں میں سبھی خود غرض ہوں
اگر ہر کوئی اپنے دکھ کو سنبھالے ہوئے
دوسرے کے غموں اور زخموں سے بے گانہ و بے خبر ہو

تو پھر یہ جہاں اک کھنڈر کی طرح
صرف ماتم کو ترسے
فریدوں : مگر عالیہ تم بتاؤ
کہ اب میں کہاں ہوں
مری زندگی میری قوّت مری روشنی
اب کہاں ہے
یہ دکھ میری رگ رگ میں
اک زہر سا گھول دے گا
عالیہ : تمھارے ہی الفاظ میں
ہم بظاہر جسے دُکھ سمجھتے ہیں
جاں کا زیاں جانتے ہیں
اسی دکھ کی شدّت
ہمارے شب و روز کے آئینوں کو جلا بخشتی ہے
یہی دکھ اگر جسم کا جزو ہو تو نتیجہ فنا ہے
مگر روح میں رچ سکے تو
اسی تودۂ خاک کو اک پیمبر بنا دے
پیمبر — امرٹ، بے کراں، جاوداں
فریدوں : نمعلوم تم کس بلندی پہ ہو
اور میں کن نشیبوں میں بکھرا پڑا ہوں

مجھے چھوڑ کر تو نہ جا
میرے فن کی خداوند
میرے قلم کی توانائی
میری مرادوں کی منزل
مرے دل کی آواز
عالیہ : پگلے ترا فن تو گملے کا پودا نہیں
جنگلوں اور پہاڑوں کے سینے کا نخلِ توانا ہے
سرسبز پُرتمکنت اور قد آور
جسے برف و باراں کے موسم
نہ وحشت بھری آندھیاں کھا سکیں گی
فریدوں ! میں کل جا رہی ہوں
کہاں یہ نہیں جانتی
تم یہ سمجھو کہ میں مر چکی ہوں
فریدوں : مری عالیہ مر چکی ہے !
مری عالیہ مر چکی ہے !!
عالیہ : تری عالیہ مر چکی ہے تری عالیہ
ہاں مگر اک مری آخری التجا ہے
کہ تم اپنے فن کو بلندی کی ان چوٹیوں تک اُٹھانا
کہ میں جس جگہ ہوں — تمھیں فخر سے اور محبّت سے دیکھوں
ترا فن مری زندگی ہے فریدوں — فریدوں ..... فریدوں

آخرِ شب
کے
ہمسفر

رات کا سناٹا کہیں کہیں سے کسی چمگادڑ کے پھڑپھڑانے اور اُلّو کی آواز آجاتی ہے۔ موسیقی رات کی ہیبت اور ویرانی کا منظر پیدا کرتی ہے۔ وقفوں کے بعد بھاری فوجی بوٹوں کی چاپ کا تاثر یوں دیا جائے جیسے کوئی فوجی پہرہ دے رہا ہو جب کوئی پرندہ پھڑپھڑاتا ہے قدموں کی چاپ ایک لحظہ کے لیے رُک جاتی ہے اور پھر جاری ہو جاتی ہے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر تک رہتا ہے پھر اچانک دُور سے ایک نوجوان عورت کی کربناک سسکیاں اور کراہیں سُنائی دینے لگتی ہیں، فوجی بوٹوں کی چاپ رُک جاتی ہے پرندہ پھڑپھڑاتا ہے۔ آندھی کی سیٹیاں سُنائی دیتی ہیں۔ قدموں کی آواز پھر اُبھرتی ہے بہت دور سے کبھی کبھی گولی چلنے کی آواز آتی ہے۔ پھر سناٹا طاری ہو جاتا ہے اور نوجوان عورت کی کراہیں بین کے انداز میں سُنائی دیتی ہیں۔ فوجی بوٹوں کی آواز رک جاتی ہے

سپاہی : یہ آواز کیسی ہے
جیسے کوئی شدّتِ کرب سے رو رہا ہو

مگر اس سمے ؟
نصف شب ہو چکی ہے
یہاں کون ہو گا ؟
یہاں کوئی ذی روح میرے علاوہ نہیں
اور یہ چند لاشیں
کہ جن کی حفاظت پہ مامور ہوں میں
کوئی زندہ پیکر
یہاں وادیٔ مرگ میں کیا کرے گا
یہ خطّہ تو کب سے ہے ویراں
یہاں کچھ شکستہ در و بام
اپنے گزشتہ مکینوں کی یادوں میں
مدّت سے یونہی کھڑے ہیں
(پرندے کے پھڑپھڑانے کی آواز)
نہیں یہ مرا واہمہ ہے
یہ شب کتنی ہیبت فزا ہے
کہ میں اپنی آواز سے کانپنے لگ گیا ہوں
(خوفزدہ ہنسی ہنستا ہے)

(دور سے رونے کی آواز پھر اُبھرتی ہے)
نہیں واہمہ یہ نہیں

یقیناً کوئی رو رہا ہے
یہ آواز عورت کی ہے
جیسے گھائل پرندے کی زخمی صدا
سننے والے کے دل پر خراشیں لگائے
مگر اِس سمے اِس جگہ ؟
کون ہوگا
یہ لاشیں مرے سامنے پتّھروں کی طرح سرد و بے حس پڑی ہیں
یہ لاشیں مرے ملک کے دشمنوں کی
اور اِن کی حفاظت کو میں ہوں
فقط میں
کوئی نوحہ گر ہے نہ ماتم سرا ہے
تو پھر یہ صدا بین کی
یہ جگر سوز فریاد کس کی ہے ؟
کیسی ہے ؟
کیوں ہے ؟
یہاں تو بجز ایک معبد
کوئی بھی عمارت سلامت نہیں ہے
تو جیسے اسی میں کوئی ہے
عبادت کا یہ وقت ؟

(سسکی)

لیکن نہیں
یہ تو رونے کی آواز ہے
اور وہ بھی کسی اپسرا کی
چلوں جا کے دیکھوں
مگر شام تک تو
وہاں بھی
فقط چند بے نور شمعیں
شکستہ ظروف
اور مرجھائے پھولوں کی ویران خوشبو تھی
آواز کوئی نہیں تھی
فقط خامشی اور اندھیرا
یہاں تک کہ معبد کی سہمی ہوئی گھنٹیاں
بے صدا ہو چکی تھیں
تو پھر اس سمے کون ہے؟
سحر ہے
یا مرا واہمہ
کیا خبر
کوئی آسیب ہو

کوئی بد روح
جو اپنے پیکر کی فرقت میں
نالہ کناں ہو
مگر میں سپاہی ہوں
ان واہموں سے مجھے کیا تعلّق
میں بُزدل نہیں
خواہ کچھ بھی ہو
میں اِس جنونِ فغاں کا تعاقب کروں گا
پرندوں کے پھڑپھڑانے کی آواز
(قدموں کی چاپ اور سِسکیاں اُبھرتی ہیں)

آوازا: (ہش) سُنو
ع۲: جیسے کوئی ادھر آرہا ہے
ع۱: چلو اب اُٹھو ورنہ ہم بھی نہیں بچ سکیں گے
ع۲: بھلا مرنے والے کبھی آہ وزاری سے زندہ ہُوے ہیں
یہاں تک پہنچنا بھی خطرے سے خالی نہیں تھا
مگر ہم تیری دُکھ بھری التجا پر یہ تابوت، پرچھائیوں کی طرح
رینگتے رینگتے اس جگہ لے کے آئے ہیں
یہاں اب گھڑی دو گھڑی کا توقف کھُلی خودکشی ہے
یہ سارا علاقہ تو اب دشمنوں کے تسلّط میں ہے

اور یہ معبد بھی

اُٹھو چلو

(بھاری قدموں کی آواز ہر لحظہ معبد کی دہلیز کی سمت

بڑھتی چلی آ رہی ہے — سسکیاں بڑھ جاتی ہیں)

تمھیں اِس جواں مرگ شوہر کے غم کی قسم اب اُٹھو

مہ ۲ : چلو ہم چلیں دوسرے راستے سے نکل جائیں ورنہ . . .

مہ ۱ : سُنو پاؤں کی چاپ اِدھر ہی کو بڑھتی چلی آ رہی ہے

(آواز بڑھتی چلی آ رہی ہے. سِسکیاں جاری

ہیں. دونوں کرداروں کے قدموں کی چاپ اُبھر کر

غائب ہو جاتی ہے. بھاری قدموں کی چاپ رُک جاتی ہے)

سپاہی : کون ہے ؟

(سسکیاں)

کون ہے ؟

(سسکیاں)

(قدموں کی آواز قریب آکر رُک جاتی ہے)

بتا کون ہے تو

بتا ورنہ تیرے لیے میرے پستول کی ایک گولی بھی کافی رہے گی

(سسکیاں) (پستول بھرنے کی آواز)

(خود کلامی کے انداز میں)
نہیں اتنی جلدی نہیں چاہیے
ذرا روشنی میں اسے دیکھ لوں
عورت : تو رُک کیوں گئے مار ڈالو مجھے بھی، مجھے بھی،
مجھے زندگی سے ذرا بھی محبّت نہیں ہے
نہ مرنے کا غم ہے
نہ جینے کی خواہش (سسکیاں)
سپاہی : مگر تو یہاں اِس سمے
ایک ویران معبد میں کیوں رو رہی ہے
تجھے یہ خبر ہے کہ اب اِس علاقے پہ دشمن کا قبضہ ہے
اور کوئی بھی کچھ بھی نہیں جانتا
اس کا انجام کیا ہو
اور پھر تم تو عورت ہو
ہیں . . . . اس لیے
عورت : قتل کرنے سے گھبرا رہا ہوں
یہی کہنے والے تم
میرے شوہر کے قاتل
مجھے زندہ رہنے کا لالچ نہیں ہے
یہ تابوت جو میرے خوابوں کا مدفن ہے

میرے جوانمرگ شوہر کے لاشے کا مسکن ہے
اس کو میرے خون کے سرخ پھولوں سے گلنار کر دے
کہ یہ ظلم احسان ہوگا
سپاہی : مگر میں نہیں تیرے شوہر کا قاتل
نہ میں جانتا ہوں کہ تو کون ہے اور یہ تابوت کس کا ہے
میں تو فقط تیرے رونے کی آواز سُن کر ادھر آگیا تھا
عورت : اگر تو نہیں تو کوئی تیرا ہم جنس ہوگا
کہ قاتل تو سب ایک ہیں
ایک سے ہیں
مجھے اس سے کیا
کس کے خنجر سے گھائل ہوئی ہوں
مجھے اس سے کیا
کس کی مشعل کے شعلے نے میرا جہاں پھُونک ڈالا
وہ خنجر تیرا ہو کہ تیرے رفیقوں کا ہو
میں تو گھائل ہوئی
آگ تو نے لگائی ہو یا تیرے ہمراہیوں نے
میرا آشیاں تو جلا
سپاہی : ہاں یہ سچ ہے
مگر نیک خاتون

یہ زندگی کا وطیرہ رہا ہے
کبھی لطف کی ساعتیں
اور کبھی ظلم کے روز و شب
اس کے نخچیر سب ہیں
تجھے کیا خبر
کون ظالم ہے اور کون مظلوم ہے
ہر کوئی خود کو معصوم گردانتا ہے
یہاں تک کہ قاتل بھی
اور یہ حقیقت بھی ہے
آج میں تیری نظروں میں قاتل ہوں
کیونکہ
میرا جسم مقتول کے وار سے بچ گیا
ورنہ ہم ایک سی نیتیں لے کے
اِک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے
اگرچہ یہ دُکھ جاں گسل ہے
مگر حوصلے کے سوا کوئی چارہ نہیں

عورت : حوصلہ
تم تو پتّھر کے ہو اس لیے ہی یہ سب کہہ رہے ہو
تمھیں کیا خبر

میرا دل پھٹ رہا ہے
میری روح غم کے جہنم میں ڈوبی ہوئی ہے
میری سانس نشتر کی مانند میرا جگر چیرتی ہے
تمھیں کیوں خبر ہو
تمھیں تو فقط قتل کرنا سکھایا گیا اور بس ...
زخم کی شدّتوں سے تمھیں کیا
جبھی تو یہ سفّاک الفاظ
ہمدردیوں کی جبیں آڑ میں کہہ رہے ہو
سپاہی: تمھیں اس کا حق ہے۔ تمھیں اس کا حق ہے
کہ تم جس کڑے درد میں مبتلا ہو
مجھے غیر جانو
مگر میری نیّت کو شک کی نظر سے نہ دیکھو
مجھے تو فقط اس قدر تم سے کہنا تھا
تم ایک کمزور عورت ہو
اور وہ بھی تنہا و بے بس
یہ ویران معبد یہ جاڑے کی تاریک شب
اور یہ مخدوش حالات
بہتر یہی ہے کہ تم اپنے گھر لوٹ جاؤ
پہر دو پہر بعد اُجالے کے ہوتے ہی

میرے رفیقوں کے دستے یہاں آن پہنچیں گے
اور پھر کسے علم کیا ہو
تمھاری جوانی دکھوں کے لبادے میں بھی پُر کشش ہے
مجھے تم ریاکار سمجھو کہ غمخوار جانو
تمھیں اس کا حق ہے
مگر صبح تک میں بھی شاید
تمھاری مدد کر نہ پاؤں
عورت: مجھے اپنے انجام کا غم نہیں
ہاں مگر اس قدر
میرے محبوب کی روح
میرے لیے آسمانوں کی پہنائیوں میں
پریشان ہو گی
اگر تم مرے دادرس ہو
تو پھر اپنے پستول کی لبلبی کو دبا کر
مجھے اس اذیّت سے آزاد کر دو
یہ احسان ہو گا تمھارا
مجھے صبح کی روشنی کی ضرورت نہیں ہے
مجھے زندگی کے کسی بھی اُجالے کی حسرت نہیں ہے
مری مانگ کی کہکشاں

بجھ چکی ہے
مجھے اب سہاروں کے جگنو
اُجالے نہ دیں گے

(وقفہ)

(وقفہ کے بعد)

تو کیا تم سے اتنا بھی ممکن نہیں ہے
یہی خیر خواہی کا دعویٰ تھا
اب چپ کھڑے سوچ میں پڑ گئے ہو
تمہارے خیالوں کی پرچھائیاں میری آنکھوں سے مخفی نہیں ہیں
میں سب جانتی ہوں
جبھی تو مجھے تم سے کوئی توقع نہیں ہے
تمہیں کیا، کسی سے بھی کوئی توقع نہیں تھی
کہ دشمن تو دشمن ہی ہوتے ہیں
ان سے وفا کی توقع عبث ہے

....

تو پھر میرے ہمدرد
جا اور سحر کے اُجالے کے ہوتے ہی
اپنے رفیقوں کے ہمراہ آکر
مری بے کسی کا تمسخر اُڑانا

مگر میں تجھے یہ بتا دوں
کہ تم سخت مایوس ہو گے
کہ میرے بجائے
یہاں لاش ہو گی
سپاہی : نہیں یوں نہیں
میں تو یہ سوچتا ہوں
کہ اس نفرتوں کے زمانے میں
اتنی محبّت
مجھے تیرے مقتول کی خوش نصیبی پہ رشک آ رہا ہے
اگر کوئی میرے لیے
اس طرح نوحہ گر، مضطرب، خونفشاں ہو
تو میں زندگی موت پر وار دوں
اے وفادار خاتون!
مجھ کو تیری چاہتوں نے
تیرا معتقد کر دیا ہے
عورت : مری چاہتوں نے ؟
مری چاہتیں
جو فقط آنسوؤں میں پروئی ہوئی ہیں
فقط چند اشکوں کی لڑیاں

تو چاہت کی ضامن نہیں ہیں
مری چاہتیں
خود غرض اور بزدل ہیں
ورنہ
یہ تابوت
تنہائیوں کے کفن میں لپیٹی ہوئی
صرف اِک لاش کا گھر نہ ہوتا
کہ میں اب تلک جی رہی ہوں
مری زندگی ننگِ اُلفت ہے
اک بدنما داغ ہے
فرقِ انسانیت پر
(سسکیاں لیتی ہے)

سپاہی: محبّت کی دیوی
تمھاری وفا کتنی ثابت قدم ہے
تری استقامت کے آگے اجل منفعل ہے
. . . .
مگر زندگی کی بہاریں
ابھی اپنے دامن میں خوشبو کے جھونکے لیے ہیں
ابھی تیرے پیکر میں وہ حسن ہے

جس کی شادابیاں مدتوں تک رہیں گی
محبّت تو اک جوت ہے
روشنی ہے
ضیا ہے
جو دکھ کے گھنیرے اندھیروں میں مرتی نہیں
اور اسے مارنا ظلم ہے قتل ہے
عورت : ہاں مگر یہ ضیاء جس دِیے کے لیے تھی
وہ گم ہو چکا ہے
فقط اک دیا اس ضیاء کو سزاوار تھا
اور وہ آج ویران معبد میں ٹوٹا پڑا ہے
محبّت کی لو
اس کی بالیں پہ نوحہ خواں ہے
سپاہی : یہ سچ ہے
وفا نام ہے ایک پیکر سے وابستگی کا
مگر تابکے شمعِ تربت بنی تم سُلگتی رہو گی ؟
ابھی کتنے زندہ جہاں روشنی کی کرن کے لیے منتظر ہیں
اُٹھو ان اندھیری گپھاؤں سے نکلو
کہ تم روشنی ہو
عورت : سپاہی !

مگر شمعِ تربت کو کس نے گھروں میں جلایا
مرے سامنے اب اندھیروں کی دنیا ہے
اور وادیٔ مرگ کی خامشی ہے
یہاں اور کچھ دیر تک
ٹمٹماؤں گی
اور جل بجھوں گی

سپاہی : وفا کو حقیر اور ارزاں نہ سمجھو
یہ موتی بڑا قیمتی ہے
اسے خاک میں رول دینا
سراسر ستم ہے
اگر تم سمجھتی ہو یوں جاں گنوانے سے
یہ لاش پھر جی اُٹھے گی؟
تو پھر شوق سے موت کا زہر پی لو
اگر یوں نہیں تو
یہ دیوانگی ــ صرف دیوانگی ہے
نہ مقصد نہ حاصل نہ منزل
اُٹھو زندگی کے کئی راستے منتظر ہیں تمہارے

عورت : مگر تم تو دشمن ہو میرے
تمہاری بلا سے

اگر میری ہستی تباہی کے غاروں میں
تمھیں کیا اگر صبحدم آنے والے سپاہی مجھے
بھیڑیوں کی طرح پھاڑ ڈالیں
سپاہی : میں دشمن سہی پھر بھی انسان تو ہوں

فقط یہ نہیں ہے
کہ تم اک حسیں نوجواں اور مظلوم بیوہ ہو
بلکہ تمھاری وفا اور وابستگی نے
میرے دل کو پگھلا دیا ہے
وگرنہ مرا دل بھی پتھّر کا تھا اور پتھر کا ہو جائے گا
جب یہ منظر نظر میں نہ ہوگا
عورت : تم انساں نہیں ہو
فرشتے ہو
ورنہ ظفر مند لشکر کے وحشی سپاہی تو
مفتوح خطّے کی ہر چیز کو
نوکِ شمشیر سے تولتے ہیں
تم اس وقت سے ایستادہ ہو
کچھ دیر کو بیٹھ جاؤ . . . . . سپاہی
سپاہی : اوہ مجھے یاد آیا

کہیں سسکیاں سُن کے یہ دیکھنے کے لیے
اِس طرف آگیا تھا
کہ اس وقت ویران معبد سے
کیسی صدا آرہی ہے
وگرنہ
مرے ذمّے دشمن کی لاشیں ہیں
جن کی نگہداشت کرنا ہے مجھ کو
عورت: (حیرت سے) نگہداشت!
دشمن کی لاشوں کی
وہ کیوں؟
(ذرا شگفتگی سے)
تمھیں اس کا ڈر ہے کہ لاشیں
کہیں پھر سے زندہ نہ ہو جائیں
اور بھاگ اُٹھیں
سپاہی: (ہنستے ہوئے) نہیں
اس سبب سے نہیں
بلکہ یہ اس لیے
تاکہ دشمن کہیں موقع پاکر اُنھیں لے نہ جائے
عورت: اگر لے بھی جائے تو پھر کیا۔

بھلا تم کو لاشوں سے کیا واسطہ
سپاہی : یہ سب جنگ کے بھید ہیں
تم نہیں جان سکتیں
عورت : مگر اس میں کیا بھید ہے
سپاہی : ایک تو یہ کہ جب جنگ کا خاتمہ ہو
تو دشمن کی لاشوں کے بدلے میں
اپنے شہیدوں کی لاشیں ہمیں مل سکیں
عورت : اوہ - یہ بات ہے
سپاہی : ہاں مجھے واپس اپنی جگہ پر پہنچنا ہے
عورت : اور میں ؟
سپاہی : تم !
تم یہیں چند لمحے رکو
میں ابھی لوٹ آؤں گا
اور ہاں . . . . .
یہاں سخت سردی ہے تم کپکپانے لگی ہو
مرا کوٹ لے لو
عورت : نہیں باہر اس سے بھی بڑھ کر ہے
تم جاؤ میں تو یہیں ہوں
سپاہی : یہ لو کوٹ اور اوڑھ لو

میں سپاہی ہوں اور اِن کڑے موسموں کا مرا جسم عادی رہا ہے

عورت : ذرا جلد ہی لوٹنا

(سپاہی کے قدموں کی چاپ فیڈ اِن
ہو کر فیڈ آوٹ ہو جاتی ہے)

(موسیقی)

(سپاہی کے قدموں کی چاپ فیڈ اِن ہوتی ہے اور مائیک
کے قریب آکر رُک جاتی ہے)

سپاہی : (گھبرائی ہوئی آواز میں) غضب ہو گیا

عورت : کیا ہُوا دوست

سپاہی : اک لاش کم ہے

عورت : تو پھر کیا ہُوا

سپاہی : اُف غضب ہو گیا تم نہیں جان سکتیں
کہ یہ بات کتنی خطرناک ہے

عورت : کس طرح

سپاہی : میری غفلت کے باعث یہ سب کچھ ہُوا
اور اب
اس کی پاداشں مجھ کو بھگتنا پڑے گی

عورت : تو پھر

سپاہی : میں نہیں جانتا اس کا انجام کیا ہو

کہ یہ مجرمانہ تغافل ہے
اور خاص کر حالتِ جنگ میں
اس کی پاداش
بس موت ہے

عورت : تو میں اس کا باعث بنی
مرے واسطے ہی تو تم
فرض کو بھول بیٹھے تھے
اور اب .....

سپاہی : میں جاتا ہوں
جو کچھ بھی ہو صبح تک میں وہیں پر رہوں گا
کہیں باقی لاشیں بھی غائب ......

عورت : سُنو
تم نے میرے لیے یہ کیا
اور اب ایک صورت ہے
تم ..... میرے شوہر کی یہ لاش
باقی کی لاشوں میں رکھ دو

سپاہی : یہ کیا کہہ رہی ہو
مجھے اپنے کانوں پہ شک ہے

عورت : سپاہی

یہی ایک صورت ہے
اور اب تمھیں سوچنے کی ضرورت نہیں
چلو مل کے یہ لاش ہم لے چلیں
سپاہی : لیکن اتنا کرم!
عورت : کچھ نہیں تم چلو —
وقت کم ہے
چلو —

(موسیقی)

بے آواز
گلی کوچوں میں

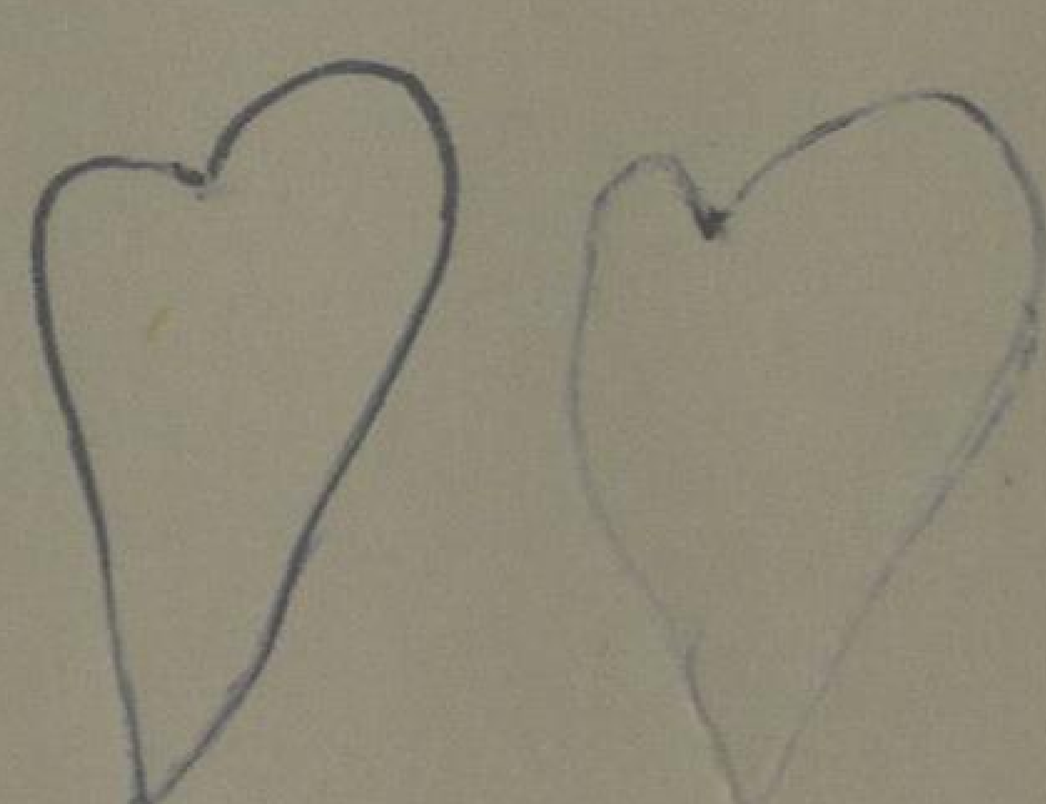
احمد فراز

ماورا پبلشرز۔ ۳ بہاولپور روڈ۔ لاہور

اِنتساب

محصُور آوازوں کے نام

بے آواز گلی کوچوں میں غزل سرا ہے
شہرِ سخن کا ایک مُسافر تنہا تنہا



ترتیب

ایک بد نُما صُبح کے بارے میں کچھ عبارتیں

بے آواز گلی کوچوں میں

ناموجود

اَے خُدا تری مخلُوق
جبر کے اندھیروں میں
دفن ہو چُکی کب کی
تیرے آسمانوں سے
نامزد فرِشتوں کی
اَب سفارتیں کیسی

بے وجُود بستی میں
لوگ اب نہیں رہتے
سِسکیاں سِسکتی ہیں
سائے سرسراتے ہیں
سُورجوں، ستاروں کی
اَب بشارتیں کیسی

دُوسری ہجرت

پھر مرے مکّہ سے پیغمبر
ہجرت کر کے چلا گیا ہے
اور اب پھر سے
کعبہ کے رَم خُوردہ بُت
اصنامِ طلائی
اپنی اپنی مسند پر آ بیٹھے ہیں
سچ کا لہُو
اُن کے قدموں میں
عُنّابی قالین کی صُورت بچھا ہُوا ہے
کمخوابی خیموں کے اندر
بزمِ حریفاں پھر سجتی ہے
کِذب و ریا کی دَف بجتی ہے

○

جاناں دِل کا شہر، نگر افسوس کا ہے
تیرا میرا سارا سفر افسوس کا ہے

کس چاہت سے زہرِ تمنا مانگا تھا
اور اب ہاتھوں میں ساغر افسوس کا ہے

اِک دہلیز پہ جا کر دِل خُوش ہوتا تھا
اب تو شہر میں ہر اک در افسوس کا ہے

ہم نے عِشق گُناہ سے بَرتر جانا تھا
اور دِل پر پہلا پتھر افسوس کا ہے

دیکھو اُس چاہت کے پیڑ کی شاخوں پر
پھول اُداسی کا ہے، ثمر افسوس کا ہے

کوئی پچھتاوا سا پچھتاوا ہے فراز
دُکھ کا نہیں افسوس، مگر افسوس کا ہے

○

شعر کسی کے ہجر میں کہنا حرفِ وصال کسی سے
ہم بھی کیا ہیں دھیان کسی کا اور سوال کسی سے

ساری متاعِ ہستی اپنی خواب و خیال تو ہیں
وُہ بھی خواب کسی سے مانگے اور خیال کسی سے

ایسے سادہ دِل لوگوں کی چارہ گری کیسے ہو
درد کا درماں اور کوئی ہو کہنا حال کسی سے

دیکھو اِک صُورت نے دِل میں کیسی جوت جگائی
کیسا سجا سجا لگتا ہے شہرِ ملال کسی سے

تُم کو زعم فراز اگر ہے تم بھی جتن کر دیکھو
آج تلک تو ٹُوٹ نہ پایا درد کا جال کسی سے

○

سویا تھا یا جاگ رہا تھا ہجر کی رات
آنکھوں پر محسوس کیئے ہیں اُس کے ہاتھ

اُسکو دیکھنا دیکھتے رہنا کافی تھا
لوٹ آیا ہُوں دِل میں لے کر دِل کی بات

کیسے اب میں اوروں کو بے درد کہوں
میں بھی تھوڑی دُور گیا تھا اُس کے ساتھ

بہت زمانوں بعد کوئی واپس آیا
لے کر بھولی بسری یادوں کی سوغات

محوِ تکلّم دُنیا بھر کے لوگوں سے
لیکن آنکھ میں وُہ ہے دِل میں اُسکی بات

شہرِ محبّت کب سے خالی خالی ھے
ہم بھی فرازؔ یہاں ہیں شاید رات کی رات

○

یہ میں بھی کیا ہُوں اُسے بھُول کر اُسی کا رہا
کہ جِس کے ساتھ نہ تھا ہمسفر اُسی کا رہا

وُہ بت کہ دُشمنِ دیں تھا بقول ناصح کے
سوالِ سجدہ جب آیا تو دَر اُسی کا رہا

ہزار چارہ گروں نے ہزار باتیں کیں
کہا جو دِل نے سخن مُعتبر اُسی کا رہا

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
مَیں کِس طرح سے کہُوں عُمر بھر اُسی کا رہا

کہ اپنے حرف کی توقیر جانتا تھا فراز
اسی لئے کفِ قاتل پہ سَر اُسی کا رہا

ہم سے کہیں کچھ دوست ہمارے مَت لِکّھو
جان اگر پیاری ہے پیارے مَت لِکّھو

حاکم کی تلوار مقدّس ہوتی ہَے
حاکم کی تلوار کے بارے مَت لِکّھو

کہتے ہیں یہ دار و رسن کا موسم ہَے
جو بھی جِس کی گردن مارے مَت لِکّھو

لوگ الہام کو بھی الحاد سمجھتے ہیں
جو دل پر وجدان اتارے مت لِکّھو

وُہ لکھّو بس جو بھی امیرِ شہر کہے
جو کہتے ہیں دَرد کے مارے مَت لِکّھو

خُود مُنصف پابستہ ہیں لب بستہ ہیں
کون کہاں اَب عرض گُزارے، مَت لِکھّو

کُچھ اعزاز رسیدہ ہم سے کہتے ہیں
اپنی بیاض میں نام ہمارے مَت لِکھّو

دِل کہتا ہے کھُل کر سچی بات کہو
اور لفظوں کے بیچ ستارے مَت لِکھّو

○

فضا بے ابر شاخیں بے ثمر ہیں
پرندوں سے شجر محروم تر ہیں

کوئی موسم قرینے کا نہ آیا
ہواؤں کے سخن نا معتبر ہیں

تری قربت کے لمحے پھول جیسے
مگر پھولوں کی عمریں مختصر ہیں

بہت سے زخم تیرے نام کے تھے
اسی باعث بہت سے چارہ گر ہیں

پڑے ہیں قربتوں میں فاصلے وہ
کہ جو نزدیک تر تھے دور تر ہیں

شبِ افسوس کے بُجھتے چراغو
ذرا ٹھہرو کہ ہم بھی رات بھر ہیں

فرازؔ اپنا مقدّر سنگساری
ہمیں اِس عہد کے آئینہ گر ہیں

بن باس

میرے شہر کے سارے رستے بند ہیں لوگو
مَیں اس شہر کا نغمہ گر
جو دو اِک موسم غُربت کے دُکھ جھیل کے آیا
تا کہ اپنے گھر کی دیواروں سے
اپنی تھکی ہُوئی اور ترسی ہُوئی
آنکھیں سہلاؤں
اپنے دروازوں کے اُترتے روغن کو
اپنے اشکوں سے صیقل کر لُوں
اپنے چمن کے جلے ہُوئے پَودوں
اور گرد آلُود درختوں کی
مُردہ شاخوں پر بین کروں
ہر مہجور ستُون کو اتنا ٹُوٹ کے چُوموں
میرے لبوں کے خُون سے

ان کے نقش و نگار سبھی جی اُٹھیں
گلی کے لوگوں کو اِتنا دیکھوں
اِتنا دیکھوں
میری آنکھیں
برسوں کی ترسی ہُوئی آنکھیں
چہروں کے آنگن بن جائیں
پھر میں اپنا ساز اُٹھاؤں
آنسوؤں اور مُسکانوں سے جھلمل جھلمل
نظمیں غزلیں گیت سناؤں
اپنے پیاروں
درد کے ماروں کا درماں بن جاؤں
لیکن میرے شہر کے سارے رستوں پر
اب باڑ ہے لوہے کے کانٹوں کی
شہ دروازے پر کچھ پہرہ دار کھڑے ہیں
جو مُجھ سے اور مجھ جیسے دِل والوں کی
پہچان سے عاری
میرے ساز سے

سنگینوں سے بات کریں
میں اُن سے کہتا ہُوں
دیکھو
میں اس شہر کا نغمہ گر ہُوں
برسوں بعد کڑی راہوں کی
ساری اذیّت جھیل کے اب واپس آیا ہُوں
اس مٹّی کی خاطر
جس کی خُوشبوئیں
دُنیا بھر کی دوشیزاؤں کے جسموں کی مہکوں سے
اور سارے جہاں کے
سبھی گلابوں سے
بڑھ کر ہَے
مُجھ کو شہر میں
میرے شہر میں جانے دو
لیکن تَنے ہُوئے نیزوں نے
میرے جسم کو یُوں برمایا
میرے ساز کو یُوں ریزایا

میرا ہمکتا خُون اور میرے سسکتے نغمے
شہ دروازے کی دہلیز سے
رِستے رِستے
شہر کے اندر جا پُہنچے ہیں
اور مَیں اپنے جسم کا ملبہ
ساز کا لاشہ
اپنے شہر کے شہ دروازے ،
کی دہلیز پہ چھوڑ کے
پھر انجانے شہروں کی شہراہوں پر
مجبُورِ سفر ہُوں
جن کو تج کر گھر آیا تھا
جن کو تج کر گھر آیا تھا

○

شہرِ کتاب اُجڑ گیا، حرف برہنہ سر ہُوئے
نغمہ ہے سُرمہ در گلو، شعر وطن بدر ہُوئے

موسمِ درد کے صفیر جو بھی ندیم تھے، سو تھے
اب تو سبھی فریفتہ، دانہ و دام پر ہُوئے

جام و سبُو کی آبرُو اہلِ ہوس کے ہاتھ ہے
جب سے فقیہہ و محتسب شہر میں مُعتبر ہُوئے

سرو جواں کی موت پر روئیں گی قُمریاں بہت
یُوں تو بفیضِ باغباں قتل کئی شجر ہُوئے

در خورِ حرفِ یار تھے جن کے لئے ہمیں فراز
آج وُہی ستم ظریف غیر کے نامہ بر ہُوئے

○

کب ہم نے کہا تھا ہمیں دستار و قبا دو
ہم لوگ نوا گر ہیں ہمیں اِذنِ نوا دو

ہم آئنے لائے ہیں سرِ کوئے رقیباں
اے سنگ فروشو یہی الزام لگا دو

لگتا ہے کہ میلہ سا لگا ہے سرِ مقتل
اے دِل زدگاں بازوئے قاتل کو دُعا دو

ہے بادہ گساروں کو تو میخانے سے نسبت
تُم مسندِ ساقی پہ کِسی کو بھی بٹھا دو

میں شب کا بھی مُجرم تھا سحر کا بھی گنہگار
لوگو مُجھے اِس شہر کے آداب سِکھا دو

فیض کے فراق میں

اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دلوں سے یاد کریں
ہر سال
اے ماٹی کے لال تجھے سب یاد کریں
تیری کویتا میری تیری دھرتی کی سچّائی
تیرے بول ہیں سارے گُونگے شہروں کی گویائی
تیرے گیت ہیں امن کی نَے اور آشتی کی شہنائی
آنگن اور چوپال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں بھیگی آنکھوں
اور دُکھتے دِلوں سے یاد کریں
ہر سال
اے ماٹی کے لال

کوئی تجھے دُنیا اپنائے لیکن اپنا شہر
اپنا شہر کہ حدِّ نظر تک جیسے لہُو کی نہر
یا منصُور و مسیح کی سُولی یا سُقراط کا زہر
ہم آشفتہ حال تجھے سب یاد کریں
یاد کریں ہر سال
اے ماٹی کے لال
ہجر کی رت کے روز رہے گی
اور فقط کچھ روز
وصل کی ساعت آپہنچے گی
اور فقط کچھ روز
راہ کی ہر دیوار گرے گی
اور فقط کچھ روز
گلے میں باہیں ڈال تجھے سب یاد کریں
اے ماٹی کے لال
تجھے سب یاد کریں
تجھے سب یاد کریں

(ستّرویں سالگرہ پر)

○

سرو و صنوبر شہر کے مرتے جاتے ہیں
سارے پرندے ہجرت کرتے جاتے ہیں

پھر سے ٹوٹ کے رونے کی رُت آئی ہے
پھر سے دِلوں کے زخم نکھرتے جاتے ہیں

جھوٹی سچی تعبیروں کی خواہش میں
کیسے کیسے خواب بکھرتے جاتے ہیں

کیسے کیسے یاروں کا بہرُوپ کھُلا
کیسے کیسے خول اُترتے جاتے ہیں

ان حالوں کب اپنے آپ کو دیکھا تھا
کہنے کو دِن رات گزرتے جاتے ہیں

رہگیروں کی خاموشی کو غور سے سُن،
یُوں ہے جیسے ماتم کرتے جاتے ہیں

ماں مٹّی نے خُوں مانگا تھا اور بیٹے
پانی سے تالاب کو بھرتے جاتے ہیں

کبھی کبھی کوئی ایسا مُسافر آتا ہے
رستے اپنے آپ سنورتے جاتے ہیں

کوئی نیا احسان کہ ہمدمِ دیرینہ
جِتنے پُرانے زخم تھے بھرتے جاتے ہیں

شہرِ غزل کی گلیوں میں دِلگیر ترے
تجُھ سے تیری باتیں کرتے جاتے ہیں

○

کب تک فگارِ دل کو تو آنکھوں کو نم کریں
آؤ حدیثِ قاتل و بسمل رقم کریں

رِندو اُٹھاؤ جام کہ بس ہو چکی بہت
تا چند پاسِ بیعتِ شیخِ حرم کریں

آنکھوں کے طاقچوں میں جلا کر چراغِ درد
خونِ جگر کو پھر سے سپُردِ قلم کریں

تا چند جشنِ مرگِ رفیقاں منا کے ہم
اسبابِ دلنوازیٔ قاتل بہم کریں

دلقِ اویس و چادرِ زہرا کدھر گئی
دزدانِ نیم شب سے تقاضا تو ہم کریں

زخموں سے چُور جسم بنائیں نشانِ راہ
جو ہاتھ کٹ چکے ہیں اُنھیں کو عَلم کریں

قیدِ تنہائی

کی

چند عبارتیں

مانسہرکیمپ ۷۷ء

پہلی آواز

اتنا سنّاٹا کہ جیسے ہو سکُوتِ صحرا
ایسی تاریکی کہ آنکھوں نے دُہائی دی ہے

جانے زنداں سے اُدھر کونسے منظر ہونگے
مجھ کو دیوار ہی دیوار دِکھائی دی ہے

دُور اک فاختہ بولی ہے بُہت دُور کہیں
پہلی آواز محبّت کی سُنائی دی ہے

۳۵

آشیاں گُم کردہ

عجب منظر سوادِ شام کے آنکھوں میں پھرتے ہیں
ہَوا سُورج کی مشعل کو جلاتی ہے بُجھاتی ہے

اُفق پر کتنی تصویریں اُبھرتی ہیں بکھرتی ہیں
شفق میں آشنا چہروں کی رنگت پھیل جاتی ہے

تو دامانِ نظر میں بے محابا پھُول کھلتے ہیں
تو جیسے جوئبارِ یادِ یاراں گنگناتی ہے

وُہ ہمدم مجھ کو حیران و پریشاں ڈھُونڈتے ہوں گے
کہ جن کی مہرباں آنکھوں میں شبنم جھلملاتی ہے

قفس میں روزنِ دیوار و زخمِ در نہیں لیکن
نوائے طائرانِ آشیاں گم کردہ آتی ہے

پچھلا پہر

نہ کہیں شہرِ مہرباں کی ہوا
نہ کوئی یارِ ہمدم و دمساز

نہ سرِ بام زُلفِ آوارہ
نہ سرِ راہ چشمِ فتنہ طراز

نہ کہیں کوُئے چاک داماناں
نہ کہیں رُوئے دوستانِ فراز

نہ کوئی بیتِ بیدل و غالب
نہ کوئی شعرِ حافظِ شیراز

نہ کوئی شمع کشتۂ شب ہے
نہ کوئی عندلیبِ سینہ گداز

خلوتِ غم نہ بزمِ رُسوائی
نہ سوالِ طلب نہ عرضِ نیاز

چار سُو اک فصیلِ بے در ہے
چار جانب حصارِ بے انداز

نیند کے طائرانِ بے پروا
شاخِ مژگاں سے کر گئے پرواز

ایسی ویرانیوں سے گھبرا کر
جب اُٹھاتا ہُوں تیری یاد کا ساز

توڑ دیتی ہے سلسلے سارے
پہرہ داروں کی بدنُما آواز

بیادِ جاناں

دِل قفس میں بھی غزل خواں ہے بیادِ جاناں
غمِ جاں بھی غمِ جاناں ہے بیادِ جاناں

کب رگ و پے میں نہ تھا درد کا قاتل نشتر
آج پیوستِ رگِ جاں ہے بیادِ جاناں

یُوں صبا آتی ہے گلگشت کو، جیسے زنداں
کُوچۂ چاکِ گریباں ہے بیادِ جاناں

غزالاں تُم تو واقف ہو

غزالاں تُم تو واقف ہو سو ہو مجنُوں پہ جو گزری
جو نالہ محملِ لیلےٰ میں تھا ہم بھی سمجھتے ہیں

ہوس والوں کو کیا کیا ناز ہے اپنے قرینوں پر
مگر رسم و رہِ شہرِ وفا ہم بھی سمجھتے ہیں

یُونہی آئے نہیں ہیں کوچۂ چاکِ گریباں میں
مزاجِ دل محبّت کی ادا ہم بھی سمجھتے ہیں

"بہار آنے سے پہلے پیرہن میں آگ لگتی ہے"
بسانِ لالۂ آتش قبا ہم بھی سمجھتے ہیں

(کلیم)

پاس کیا تھا

پاس کیا تھا کہ لُوٹتی دُنیا
ہم تو کل بھی تھے بے سر و ساماں

آج دیوار کھنچ گئی ہے اگر
شہر کل بھی تھا صُورتِ زنداں

کب میّسر ہُوا تھا روزِ وصال
کب مقدّر نہ تھی شبِ ہجراں

اِک متاعِ سُخن تھی پاس اپنے
ایک سازِ وفا تھا دولتِ جاں

اب بھی خُوش بخت ہیں ترے وحشی
اب بھی خُوش وقت ہیں ترے ناداں

درد قائم ہے یاد باقی ہے
اِک تری دید چِھن گئی جاناں

○

چاند رُکتا ہے نہ آتی ہے صبا زنداں کے پاس
کون لے جائے مرے نامے مرے جاناں کے پاس

اب بجز ترکِ وفا کوئی خیال آتا نہیں
اب کوئی حیلہ نہیں شاید دلِ ناداں کے پاس

چند یادیں نوحہ گر ہیں خیمۂ دل کے قریب
چند تصویریں جھلکتی ہیں صفِ مژگاں کے پاس

شہر والے سب امیرِ شہر کی مجلس میں ہیں
کون آئے گا غریبِ شہرِ ناپُرساں کے پاس

لوگ کیوں کرتے ہیں اب چارہ گری کے تذکرے
اب بجز حرفِ تسلی کیا ہے غم خواراں کے پاس

اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہُوں

گیتوں سے تجُھے لُبھانے والا
خوابوں سے تجُھے سجانے والا
میں تیری اُداس ساعتوں میں
رَونے والا، رُلانے والا
میں تیری خُوشی کی محفلوں میں
نغموں کے چراغ لانے والا

ہر رَاہ میں تیرا ہمسفر ہُوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہُوں

اب ہاتھوں میں مرے ہتھکڑی ہے
اب پاؤں میں میرے بیڑیاں ہیں
اب دستِ صبا ہے دستِ قاتل
اب ابرِ کرم میں بجلیاں ہیں
اب حبسِ دوام میری قسمت
یا میرا نصیب پھانسیاں ہیں

میں اپنی خطا سے بے خبر ہوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

پھر بھی نہیں جی کو رنج کوئی
اور آنکھوں میں اشکِ خوں نہیں ہے
پھر بھی نہیں درد دل گرفتہ
میں نالہ بلب ہوں یوں نہیں ہے
دیکھوں تو بیاضِ شعر میری
اِک حرف بھی سرنگوں نہیں ہے

زنداں میں رہوں کہ اپنے گھر ہوں
اے شہر میں تیرا نغمہ گر ہوں

ندیم آنکھیں ندیم چہرہ

ندیم چُپ تھا
مگر سدا کی شفیق آنکھوں پہ
دُکھ کی کائی جمی ہُوئی تھی
سدا کے اُس مہربان چہرے کا زخم
جو کب کا بھر چُکا تھا
وُہ پھر ہرا ہو کے کنجِ لب سے دل و جگر تک پہُنچ چکا تھا
ندیم چُپ تھا
مُجھے تو ایسا لگا کہ جیسے
کسی نے اُس کے نحیف شانوں سے
اُسکے زندہ وجیہہ سر کو ہٹا کے
زُوبی کا ساختہ چہرۂ سفالیں
لگا دیا ھے۔

یہ کربِ ضبطِ الم کی حد تھی
بُہت سے احباب جمع تھے
جب
عدالتِ عالیہ کے اِیواں سے
مَیں حراست میں
باہر آیا
اِدھر اُدھر لوگ حال احوال پُوچھنے کے لیئے
کھڑے تھے
تو کشور و کامراں کی آنکھوں میں سِسکیاں
اور گلے میں آنسُو اٹک گئے تھے
یہ وُہ گھڑی تھی
کہ میرے اندر کے حوصلوں کی
سبھی چٹانیں تڑخ رہی تھیں
وُہ زلزلہ سا وجُود میں تھا
کہ میری بُنیاد ہل رہی تھی
گناہ میرے قلم کا سچ تھا
اور اُسکی پاداش میرے یاروں کو

میرے پیاروں کو مِل رہی تھی
یہ ساعتِ جانستاں کڑی تھی
اور اس سے پہلے کہ سچ کا پندار
واہموں سے شکست کھاتا
ندیم کی مہربان آنکھیں
ندیم کے دلنواز لب مجھ سے کہہ رہے تھے
فراز ہم تم تو وُہ ہیں
جن کے نصیب میں زندگی کی ساری اذیّتیں ہیں
کہ جس مسافت پہ ہم چلے ہیں
وُہ حرفِ حق کی مجاہدت ہے
ہمیں نہ حرصِ حشم نہ مال و منال کی آرزُو رہی ہے
نہ ہم کو طبل و عَلم نہ جاہ و جلال کی جستجوُ رہی ہے
بس اِک قلم ہے کہ جس کی نامُوس
ہم فقیروں کا کُل اثاثہ ہے آبرُو ہے
بس ایک سچ ہے
کہ جسکی حُرمت کی آگہی سے
مرے بدن میں ترے بدن میں

مرے قلم میں، ترے قلم میں
وُہی لہُو ہے
کہ جس سے عرفان کی نمُو ہے
کہ جس سے انساں کی آبرُو ہے
ابھی سے تم ڈولنے لگے ہو
ابھی سے سُکھ کے مقابلے میں صعُوبتیں تولنے لگے ہو
مجُھے بھی دیکھو
کہ جس کے پیراہنِ دل و جاں پہ ساٹھ
پیوند لگ چکے ہیں
تمام پیوند زندگی کی ودیعتیں ہیں
مگر مجُھے مضمحِل بھی دیکھا !؟
کبھی مجُھے منفعِل بھی دیکھا !؟
مَیں اب بھی دشتِ وفا میں گرمِ سفر ہُوں گرمِ سفر رہا ہُوں
کہ میں سمجھتا ہُوں
یہ وُہ صحرائے درد ہے جِس میں
تشنگی ہے، گرسنگی ہے، برہنگی ہے
یہاں ملامت کے سنگ ــــ طعنوں کے تیر

شرمندگی کے خنجر برس رہے ہیں
یہاں تو ہر راہرو کی گردن میں طوق پاؤں میں بیڑیاں ہیں
یہاں تو زنداں کی ظلمتیں اور قتل گاہوں کی لالیاں ہیں
مگر کبھی مَیں رُکا نہیں ہُوں، مگر کبھی مَیں جُھکا نہیں ہُوں
یہی تو دشتِ وفا ہے جس میں
تمھارے جسموں ہمارے جسموں
کے ہر طرف استخواں پڑے ہیں
یہی تو وُہ راستے ہیں جن میں
صداقتوں کے امیں لڑے ہیں
فقط ہمیں تو نہیں اکیلے
یہاں بہت سے عَلم گڑے ہیں
انھیں کے ایثار سے ہی جانبر صداقتیں ہیں
انھیں کے افکار سے ہی
ہم اہلِ دِل کی باہم رفاقتیں ہیں

تمھارے بازو ابھی توانا ہیں
جسم میں خُون کھولتا ہے

قلم سے عہدِ وفا کیا ہے
قلم تو پھر سچ ہی بولتا ہے
اُٹھاؤ آنکھیں کہ سچ امر ہے
قلم کا وجدان مُعتبر ہے

مَیں کنجِ زنداں میں آ چُکا ہُوں
مگر ابھی تک
مری نگاہوں کے سامنے ہیں
ندیم آنکھیں ندیم چہرہ

(یادش بخیر)

○

ہر کوئی طرّۂ پیچاک پہن کر نِکلا
ایک مَیں پیرہنِ خاک پہن کر نِکلا

اور پھر سَب نے یہ دیکھا کہ اسی مقتل سے
میرا قاتل میری پوشاک پہن کر نِکلا

ایک بندہ تھا کہ اوڑھے تھا خُدائی ساری
اِک ستارہ تھا کہ افلاک پہن کر نِکلا

ایسی نفرت تھی کہ اس شہر کو جب آگ لگی
ہر بگولہ خس و خاشاک پہن کر نِکلا

ترکش و دامِ عبث لے کے چلا ہے صیّاد
جو بھی نخچیر ہے فتراک پہن کر نکلا

اُس کے قامت پہ سجے اُسے جان گئے لوگ فراز
جو لبادہ بھی وہ چالاک پہن کر نکلا

قاصد کبُوتر

یہ لہُو
جس سے ہرے
شہروں کے سارے راستے
گلگوں ہیں
اور ہر پیرہن کا رنگ عُنّابی ہے
کل کے موسموں
اور آنے والے
سُورجوں
کا زمزمہ گر ہے۔

چلو تُم نے تو
کالی سُرخیاں
مقراض کر ڈالیں

سخن نخچیر کر ڈالے
قلم زنجیر کر ڈالے
مگر اب ان ہواؤں کو بھی روکو
جو تمہارے مقتلوں کی لالیاں
اور تازہ خوں کی خوشبوئیں
اور اُن کی آوازیں لیئے
گلیوں سے
بازاروں سے
شہراہوں سے ہو کر
ہر طرف
قریہ بہ قریہ
پھیلتی جاتی ہیں
نادانو
ہوائیں نامہ بر بنتی ہیں
جب قاصد کبوتر قید ہوتے ہیں۔

عفریت

خوفزدہ مائیں
بچوں کو سینوں سے لپٹائے
تھر تھر کانپ رہی ہیں

بستی والے کہتے ہیں
برسوں سے
اس قریہ میں
اک آدم خور عفریت ہے
جس کے بہت سے چہرے ہیں
اور جس گھر میں بھی
کسی صدا کی شمع جلے
یا کسی دُعا کا پھول کھلے
وُہ صُبح سے پہلے
سارے گھر کو کھا جاتا ہے

کتنی بار کئی

دِل والے

اپنے دُکھی سینوں میں غم کے جگر جگر انگارے

اور زخمی آنکھوں میں

جگمگ جگمگ تارے لے کر

اس عفریت کی کھوج میں نکلے

لیکن اگلی شام

اس ٹیڑھی ترچھی پگڈنڈی پر

جو کالے سانپوں

اور پیلے کانٹوں والے

جنگل کو جاتی ہے

اُن کے سر

انکے بازو

اُن کی آنکھیں

لہُولہان

اور الگ الگ اور ٹکڑے ٹکڑے ملی ہیں

اس منظر کی دید سے اب تک
بستی والوں کے
مُنہ پر
اور آنکھوں پر
خُود اُنکے اپنے ہاتھ دھرے ہیں

○

اب لوگ جو دیکھیں گے تو خواب اور طرح کے
اس شہر پہ اُتریں گے عذاب اور طرح کے

اَب کے تو نہ چہرے ہیں نہ آنکھیں ہیں نہ لب ہیں
اس عہد نے پہنے ہیں نقاب اور طرح کے

اَب کوچۂ قاتل سے بلاوا نہیں آتا
قاصد ہیں کہ لاتے ہیں جواب اور طرح کے

سو تیر ترازو ہیں رگِ جاں میں تو پھر کیا
یاروں کی نظر میں ہیں حساب اور طرح کے

اس درد کے موسم نے عجب آگ لگائی
جسموں میں دہکتے ہیں گلاب اور طرح کے

واعظ سے فراز اپنی بنی ہے نہ بنے گی
ہم اور طرح کے ہیں جناب اور طرح کے

○

پیچ رکھتے ہو بہت صاحبو دستار کے بیچ
ہم نے سر گرتے ہُوئے دیکھے ہیں بازار کے بیچ

باغبانوں کو عجب رنج سے تکتے ہیں گلاب
گلفروش آج بہت جمع ہیں گلزار کے بیچ

قاتل اِس شہر کا جب بانٹ رہا تھا منصب
ایک درویش بھی دیکھا اُسی دربار کے بیچ

کج اداؤں کی عنایت ہے کہ ہم سے عُشّاق
کبھی دیوار کے پیچھے کبھی دیوار کے بیچ

تم ہو ناخوش تو یہاں کون ہے خوش پھر بھی فراز
لوگ رہتے ہیں اِسی شہرِ دِل آزار کے بیچ

○

اپنی ہی آواز کو بے شک کان میں رکھنا
لیکن شہر کی خاموشی بھی دھیان میں رکھنا

میرے جھوٹ کو کھولو بھی اور تولو بھی تم
لیکن اپنے سچ کو بھی میزان میں رکھنا

کل تاریخ یقیناً خود کو دُہرائے گی
آج کے اِک اک منظر کو پہچان میں رکھنا

بزم میں یاروں کی شمشیر لہو میں تر ہے
رزم میں لیکن تلواروں کو میان میں رکھنا

آج تو اے دِل ترکِ تعلق پر تم خُوش ہو
کل کے پچھتاوے کو بھی امکان میں رکھنا

اِس دریا سے آگے ایک سمندر بھی ہے
اور وُہ بے ساحل ہے یہ بھی دھیان میں رکھنا

اس موسم میں گلدانوں کی رسم کہاں ہے
لوگو اب پھُولوں کو آتشدان میں رکھنا

○

وُہ ظُلمتیں ہیں کہ شائد قبولِ شب بھی نہ ہوں
مگر حصارِ فلک میں شگاف اب بھی نہ ہوں

تمام شہر ہے شائستگی کا زہر پیئے
نہ جانے کیا ہو جو دو چار بے ادب بھی نہ ہوں

وُہ ساعتیں ہیں عنایاتِ چشم و لب تو گئیں
وُہ چاہتے ہیں حکایاتِ چشم و لب بھی نہ ہوں

ہر اک پہ وا نہ کرو شہرِ دِل کا دروازہ
کہ آنے والوں میں دزدانِ نیم شب بھی نہ ہوں

مُجھے تو ڈر ہے کہ شیخِ حرم کے ہاتھوں سے
کہیں مری طرح رُسوا رسول و رب بھی نہ ہوں

○

نبھائی وضعِ بسمل انتہا تک
نہ مانگا قاتلوں سے خوں بہا تک

نہ جانے کیا ہوا زندانیوں کو
کہ بے آواز ہے زنجیرِ پا تک

اُڑا کر لے گئیں ان موسموں میں
ہوائیں بے نواؤں کی ردا تک

وفا کے نام پر کچھ شعبدہ گر
چُرا لیتے ہیں ہاتھوں کی حِنا تک

فراز آنکھیں گنوائیں عمر کھوئی
کہا تھا کِس نے اُس کا راستہ تک

میرے عصر کے مُوسیٰ

مالک

میں لفظوں کا گڈریا

حرفوں کے بُزغالے

میری دُنیا ہے

اس دُنیا اور اسکے دُکھوں کے

بھونچالوں سے

جب بھی مُجھے پل دو پل ملتے

اور تجھے

سارے افلاک

اور ساری زمینوں

کے سارے بسنے والوں کے

سارے جھُوٹ اور سارے سچ کے

جنجالوں سے مُہلت ملتی

ہم آپس میں باتیں کرتے

سیدھی سچی پیاری باتیں
جبر اور مکر سے عاری باتیں
تُو شبنم تھا تُو موتی تھا تُو خُوشبُو تھا
میں پتّا تھا مَیں پتھّر تھا مَیں آنسُو تھا
لیکن میل رہا دونوں کا
دونوں ہی نے اکثر
سُنا کہا دونوں کا
مالک
مَیں نے اکثر سوچا
تو جِس کو
دِن کا آرام
نہ راتوں کی نیندیں حاصل ہیں
ساری دُنیاؤں کی مسافت
کرتے کرتے
اپنے گلّوں اور گلّوں کے چرواہوں کی
چاہت کا دَم بھرتے بھرتے
شہد کی نہریں زہر کے ساگر

تکتے تکتے

کبھی کبھی تھک جاتا ہوگا
تیرے گیسو
کاہکشاں کی دُھول سے اَٹ جاتے ہونگے
اور تیرے شانے
سارے زمانے کے انبار سے
دُکھتے ہوں گے
تیرے پاؤں
ازل سے لے کر ابد تلک
پھیلے ہُوئے صحراؤں کے سفر سے
چھالوں سے پٹ جاتے ہوں گے
اور تیرے پیوند لگے
ملبُوس کے بخیئے
شاید جگہ جگہ سے
نکل چُکے ہوں
مالک
تُو اِک روز اگر

سارے زمانے سارے ٹھکانے، سارے فسانے
بھول کے میرے پاس آئے تو
میں تیرے ریشم جیسے
لانبے بالوں کو
بستی کے واحد چشمے کے
چاندی جیسے پانی سے دھوؤں
تیرے تھکے ہوئے شانوں کو
آہستہ آہستہ دابوں اور سہلاؤں
تیرے چھلنی چھلنی پاؤں کے تلوؤں سے
ساری تھکن کے کانٹے چن لوں
تیرے دریدہ پیراہن کے
اک اک چاک کو ٹانکوں
اور جب تجھ کو پیاس لگے
یا بھوک لگے تو
سچے لفظوں کی سب سے اچھی بھیڑوں کا
خالص تازہ دودھ پلاؤں
اور پھر تجھ کو

اپنی نَے کی روتی ہُوئی آنکھوں کے
بِسِسکتے گیت سُناؤں
تاکہ تو صدیوں کا جاگا تھکا ہُوا
اس کُھلی فضا کے میدانوں میں
کچُھ لمحوں کو سو جائے ـــــ آرام کرے
مالک
تو میری باتوں پر
کتنی محبّت سے ہنستا ہے
لیکن میرے عصر کے مُوسیٰ
برہم ہیں

○

مکین خوش تھے کہ جب بند تھے مکانوں میں،
کھلے کواڑ تو تالے پڑے زبانوں میں،

درخت ماؤں کی مانند انتظار میں ہیں
طیور لوٹ کے آئے نہ آشیانوں میں

ہوا کی زد پہ بھی دو اِک چراغ روشن ہیں
بلا کے حوصلے دیکھے ہیں سخت جانوں میں

مجھے ہلاک کیا اعتماد نے میرے
کہ میکبتھ تھے سبھی میرے میزبانوں میں

کل آئنے نے بڑے دُکھ کی بات مجھ سے کہی
فراز تو بھی ہے گزرے گئے زمانوں میں

عشق کا شہر بھی دیکھو کیا نیرنگ بھرا ہے
اب دیوانے کا دامن بھی سنگ بھرا ہے

اب یہ کھُلا ہے کتنی پُرانی دُشمنیاں تھیں
یاروں میں ہر ایک کا خنجر زنگ بھرا ہے

میرے بدل جانے پر تُم کو حیرت کیوں ہے
مَیں نے یہ بہرُوپ تمہارے سَنگ بھرا ہے

قتل گہوں کا رستہ اوروں سے کیا پُوچھیں
لہُو کے چھینٹوں سے اِک اِک فرسنگ بھرا ہے

بولتی آنکھوں کی چُپ بھی قاتل ہے لیکن
اُس کے سکُوتِ چشم میں جو آہنگ بھرا ہے

کچھ تو فرازؔ اپنے قصّے بھی ایسے ہی تھے
اور کچھ کہنے والوں نے بھی رنگ بھرا ہے

○

اب کے ہم پر کیسا سال پڑا لوگو
شہر میں آوازوں کا کال پڑا لوگو

ہر چہرہ دو ٹکڑوں میں تقسیم ہُوا
اب کے دِلوں میں ایسا بال پڑا لوگو

جب بھی دیارِ خندہ دلاں سے گزرے ہیں
اس سے آگے شہرِ ملال پڑا لوگو

آئے رُت اور جائے رُت کی بات نہیں
اب تو عمروں کا جنجال پڑا لوگو

تلخ نوائی کا مُجرم تھا صرف فراز
پھر کیوں سارے باغ پہ جال پڑا لوگو

○

جانے کس زعم میں مقتل کو سجائے تُم ہو
مجھ کو کیا قتل کرو گے مرے سلئے تُم ہو

میرا پندار بڑھا ہے اسی معیار کے ساتھ
جس رعونت سے مُجھے دار پہ لائے تُم ہو

اس خجالت کے تبسّم سے عیاں ہیں یارو
آستینوں میں وُہ خنجر کہ چھپائے تُم ہو

دوست کا لطف تو احسان ہے جب ہو جائے
مہرباں پھر بھی بڑی دیر میں آئے تُم ہو

دست بستہ و کمر بستہ و لب بستہ سہی
اس پہ بھی خوش ہو کہ دربار میں آئے تُم ہو

ہائے وُہ صُبحِ تمنّا کہ نہ دیکھو گے فرازؔ
ہائے اُن شمعوں کی قسمت کہ جلائے تُم ہو

○

اِک بُوند تھی لہُو کی سرِ دار تو گِری
یہ بھی بُہت ہَے خوف کی دیوار تو گِری

کچُھ غُنچوں کی جُرأتِ رِندانہ کے نِثار
اَب کے خطیبِ شہر کی دستار تو گِری

کچُھ سر بھی کٹ گرے ہیں پہ کہرام تو مچا
یُوں قاتلوں کے ہاتھ سے تلوار تو گِری

ایک بدنما صبح
کے بارے میں — کچھ نظمیں

جم گیا ہے آنکھوں میں ایک بدنما منظر
اب تو سب کے سب چہرے قاتلوں سے لگتے ہیں

دِل کا قصّہ یا افسانہ دار کا ہے
ہر محفل میں ذِکر اُسی دِلدار کا ہے

○

سارا شہر بلکتا ہے
پھر بھی کیسا سکتہ ہے

ہر کوئی تصویر نما
دُور خلا میں تکتا ہے

گلیوں میں بارُود کی بُو
یا پھر خُون مہکتا ہے

سب کے بازو یخ بستہ
سب کا جسم دہکتا ہے

ایک سفر وُہ ہے جس میں
پاؤں نہیں دِل تھکتا ہے

تیرا بچھڑنا جانِ غزل
شہرِ غزل کا مقطع ہے

جلّاد

تُو نے کب یہ سوچا ہے معصوم ہے کون اور قاتل کون
تُو نے کب یہ دیکھا ہے کوئی چہرہ کیسا لگتا ہے
ایسے بھی ہوتے ہونگے جن سے سُولی بھی شرماتی ہو
ایسے بھی جن سے دار کا تختہ سجا سجا سا لگتا ہے

جھوٹ کا عمامہ ہے کوئی یا پرچم ہے سچائی کا
تو کیا جانے کس کے مُنارہ سر پہ کمند افگندہ ہے
وُہ منصور کا حرفِ انا ہو یا عیسیٰ کی شمعِ دُعا
تجھ کو کیا نخچیر ترا کوئی مولا ہے یا بندہ ہے

درباروں سے ہو کر جب انصاف کا قاصد آتا ہے
سب کو خبر ہے بے گُنہی کا اکثر جو انجام ہُوا
میزانیں کن ہاتھوں میں تھیں جُنبشِ ابرُو کس کی تھی
کِس پہ اہلِ عدالت گرجے کِس پر لُطف اکرام ہُوا

محفل محفل مقتل مقتل سب بسمل جلّاد ہے کون
کوئی سمجھ کر بھی نہیں سمجھے کوئی اشارہ جانے ہے
نام ہے کِس کا دام ہے کِس کا اور یہاں صیّاد ہے کون
"جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے"

چلو اُس شہر کا ماتم کریں

چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جس کے سبھی موسم ہمیں پیارے تھے
وُہ رُت چاک دامانی کی تھی
یا خُون رونے کی
ہوائے مہرباں کی راہ تکنے کا زمانہ تھا
کہ فصلِ لالۂ لعلیں کی حسرت میں
بدن انگار ہونے کی
سبھی موسم ہمیں پیارے رہے اس شہر کے
جو بد مقدّر تھا
کہ جس کی ساری دیواریں فصیلیں تھیں
کوئی روزن نہ رکھتی تھیں
وُہ جس کی دُود کش پہنائیاں
آنکھیں جلاتی تھیں
مگر روشن نہ رکھتی تھیں

ڈری سہمی ہُوئی خلقت کی لاشیں
اس لئے گلیوں میں پھرتی تھیں
کہ وُہ مدفن نہ رکھتی تھیں
مگر پھر بھی ہمیں اِس شہر سے
کتنی محبّت تھی

محبّت ہے
کہ یہ شہرِ سحر ناآشنا
جس کا مقدّر رات تھی یا صُبحِ کاذب تھی
گلی کُوچوں میں
بازاروں میں
دہلیزوں پہ بیٹھے منتظر لوگو
تمھیں بھی صُبحِ صادق کا تصوّر
خواب پیارا تھا
ہمیں بھی تھا
چلو تاروں کا قتلِ عام بھی ہم کو گوارا تھا
ہمیں بھی اور تمھیں بھی
جن سیہ راتوں نے مارا تھا

یہی سُنتے رہے ہم تُم
انھیں کے دامنوں میں صُبحِ صادق کا ستارا تھا
مگر اس مرتبہ
جس جھٹپٹے کو
روشنی کا اوّلیں زینہ سمجھ بیٹھے
اُسی کی آخری منزل پہ
اب سُورج کی نیلی لاش رکھی ہے
(کسی آسیب نے شب خُون مارا تھا)
مگر اب سب کے چہرے اس قدر فق
اور بازُو اس قدر شل ہیں
کہ جیسے کور چشماں گورکن
مصلوب سُورج کی بجائے
شہر کو دفنا کے آئے ہیں
چلو اُس شہر کا ماتم کریں
جِس کے سبھی موسم ہمیں پیارے رہے
اور ہم جسے خُود اپنے ہاتھوں سے
کفن پہنا کے آئے ہیں
جسے دفنا کے آئے ہیں۔

حرف کی شہادت

آؤ، جس عیسیٰ کو ہم نے سُولی پر لٹکایا ہے
اُس کے لہُو لہان بدن پر بین کریں
اور اشک بہائیں
فرض میں پُورے اُتر چکے
اب قرض چُکائیں

اس کی کھڑاؤں وُہ لے جائے
جس نے صلیب بنائی تھی
چادر کا حقدار وُہی ہے
جس نے کیل لگائی تھی
اور کانٹوں کا تاج ہے اُس کا
جس کی آنکھ بھر آئی تھی

آؤ

اب ہم سب عیسیٰ ہیں
لوگوں کو بتلائیں
مُردوں کو زندہ کرنے کا
مُعجزہ بھی دکھلائیں
لیکن اُس کا حرف تھا سب کچھ
حرف کہاں سے لائیں؟

جب یار نے رختِ سفر باندھا کب ضبط کا یارا اُس دِن تھا
ہر دَرد نے دِل کو سہلایا کیا حال ہمارا اُس دِن تھا

جب خواب ہُوئیں اُسکی آنکھیں جب دُھند ہُوا اُس کا چہرہ
ہر اشک ستارہ اُس شب تھا ہر زخم انگارہ اُس دِن تھا

سب یاروں کے ہوتے سوتے ہم کِس سے گلے مِل کر روتے
کب گلیاں اپنی گلیاں تھیں کب شہر ہمارا اُس دِن تھا

جب تجھ سے ذرا غافل ٹھہرے ہر یاد نے دِل پر دستک دی
جب لب پہ تمھارا نام نہ تھا ہر دُکھ نے پُکارا اُس دِن تھا

اک تُم ہی فراز نہ تھے تنہا اب کے تو بُلاوا جب آیا
اِک بھیڑ لگی تھی مقتل میں ہر دَرد کا مارا اُس دِن تھا

○

لباسِ دار نے منصب نیا دیا ہے اُسے
وہ آدمی تھا مسیحا بنا دیا ہے اُسے

مگر سکوتِ فلک بھی زمین جیسا تھا
دُعائے نیم شبی نے بھی کیا دیا ہے اُسے

سفر طویل نہ درپیش ہو مُسافر کو
جو نصفِ شب سے بھی پہلے جگا دیا ہے اُسے

وُہ سب حرُوف کہ بے شکل تھے سلامت ہیں
جو لفظ چہرہ نما تھا مِٹا دیا ہے اُسے

کچھ اپنے شہر کا قاتل بھی بے مروت تھا
کچھ اپنے عجز نے بھی حوصلہ دیا ہے اُسے

فغاں کہ اہلِ ہوس کی رقابتوں نے فراز
جو شخص جانِ جہاں تھا گنوا دیا ہے اُسے

○

رت جگے ہوں کہ بھرپور نیندیں مسلسل اُسے دیکھنا
وُہ جو آنکھوں میں ہے اور آنکھوں سے اوجھل اُسے دیکھنا

اِس کڑی دُھوپ میں دِل تپکتے ہیں اور بام پر وُہ نہیں
کل نئے موسموں میں جب آئیں گے بادل اُسے دیکھنا

وُہ جو خوشبو بھی ہے اور جگنو بھی ہے اور آنسو بھی ہے
جب ہَوا گنگنائے گی ناچے گا جنگل اُسے دیکھنا

جو ہواؤں میں ہے اور فضاؤں میں ہے اور دُعاؤں میں ہے
کوئی پھیلائے دامن کہ لہرائے آنچل اُسے دیکھنا

شاعری میں بھی اس جانِ جاں کا سراپا سماتا نہیں
اور آنکھوں کی دیرینہ خواہش مکمل اُسے دیکھنا

یہ بھی کیا سوچنا ہے کہ ہر وقت ناداں اُسے سوچنا
یہ بھی کیا دیکھنا ہے کہ ہر سمت پاگل اُسے دیکھنا

شامِ وعدہ سہی دُکھ زیادہ سہی پھر بھی دیکھو فرازؔ
آج شب اُسکی فُرقت میں کہہ لو غزل کل اُسے دیکھنا

○

جو کچھ کہیں تو دریدہ دہن کہا جائے
یہ شہر کیا ہے یہاں کیا سخن کہا جائے

بضد ہے تیشۂ خوں لئے ہوئے کوئی شخص
کہ گورکن کو بھی اب کوہکن کہا جائے

اگر ہجوم صداؤں کے دیکھنا چاہو
تو شرط یہ ہے کہ پہلا سخن کہا جائے

چراغ بجھتے ہی رہتے ہیں پر جو اب کے ہوا
اسے ہواؤں کا دیوانہ پن کہا جائے

عجیب رسم ہے جو صدرِ انجمن ہو فراز
وہ چاہتا ہے اُسے انجمن کہا جائے

○

گرفتہ دِل عندلیب گھائل گُلاب دیکھے
محبّتوں نے سبھی رُتوں میں عذاب دیکھے

وُہ دِن بھی آئے صلیب گر بھی صلیب پر ہوں
یہ شہر اِک روز پھر سے یومِ حساب دیکھے

یہ صُبحِ کاذب تو رات سے بھی طویل تر ہے
کہ جیسے صدیاں گُذر گئیں آفتاب دیکھے

وُہ چشمِ محرُوم کتنی محروم ہے کہ جس نے
نہ خواب دیکھے نہ رتجگوں کے عذاب دیکھے

کہاں کی آنکھیں کہ اب تو چہروں پہ آبلے ہیں
اور آبلوں سے بھلا کوئی کیسے خواب دیکھے

عجب نہیں ہے جو خوشبوؤں سے ہے شہر خالی
کہ مَیں نے دہلیزِ قاتلاں پر گُلاب دیکھے

یہ ساعتِ دید اور وحشت بڑھا گئی ہے
کہ جیسے کوئی جنوں زدہ ماہتاب دیکھے

مجھے تو ہم مکتبی کے دِن یاد آ گئے ہیں
کہ میں اُسے پڑھ رہا ہُوں اور وُہ کتاب دیکھے

دُشمن کا قصیدہ

ہم کہ تلوار کے دُشمن تھے
کہ تلوار عدُو تھی اپنی
اب مدح خواں ہیں
کہ تلوار کا کِردار بھی تھا
اور حریف اپنا
کوئی یارِ جگر دار بھی تھا
اور وُہ یارِ جگر دار طرحدار بھی تھا

نہ کہ بارُود کی نالی
نہ کہ فولاد کا خول
نہ کہ بُزدل کا مؤقف
نہ کہ کم ظرف کا بول
کہ ہمیشہ رہی تلوار
کِسی حرفِ صفا کی مانند

سچ کے پرچم کی طرح
دِل کی صدا کی مانند
نہ کہ مُلّا کی قبا اور ریا کی مانند
نہ مُنافق کی دُعا کی مانند

○

وفا کے بھیس میں کوئی رقیبِ شہر بھی ہے
حذر کہ شہر کا قاتل طبیبِ شہر بھی ہے

وُہی سپاہِ ستم خیمہ زن ہے چاروں طرف
جو میرے بخت میں تھا اب نصیبِ شہر بھی ہے

اُدھر کی آگ اِدھر بھی پہنچ نہ جائے کہیں
ہوا بھی تیز ہے جنگل قریبِ شہر بھی ہے

اب اُس کے ہجر میں روتے ہیں اسکے گھائل بھی
خبر نہ تھی کہ وُہ ظالم حبیبِ شہر بھی ہے

یہ راز نعرۂ منصور ہی سے ہم پہ کھُلا
کہ چوبِ منبرِ مسجد صلیبِ شہر بھی ہَے

کڑی ہے جنگ کہ اب کے مقابلے پہ فراز
امیرِ شہر بھی ہَے اور خطیبِ شہر بھی ہَے

ہواؤں کی بشارت

تمام ماؤں کے ہونٹ پتھر ہیں
اور آنکھوں میں زخم ہیں
اور دِل تپکتے ہیں
رات کہتی ہے
"ان کے بیٹوں کو
شب گئے
چند لشکری
ساتھ لے گئے تھے
تو اب تلک اُنکی واپسی کی خبر نہیں ہے"
نہ واپسی کا گمان رکھنا
ہوائیں سہمے ہُوئے چراغوں سے کہہ گئی تھیں
کہ آنے والی رُتوں کے آغاز تک
تمُہارے نصیب میں روشنی کا کوئی سفر نہیں ہے

یہ مائیں پتھر بنی رہیں گی
اور اُنکے آنسو جمے رہیں گے
اور اُنکی آہیں تھمی رہیں گی
نہ جی سکیں گی
نہ مر سکیں گی

مت قتل کرو آوازں کو

تُم اپنے عقیدوں کے نیزے
ہر دِل میں اُتارے جاتے ہو
ہم لوگ محبّت والے ہیں
تُم خنجر کیوں لہراتے ہو

اِس شہر میں نغمے بہنے دو
بستی میں ہمیں بھی رہنے دو

ہم پالنہار ہیں پھُولوں کے
ہم خُوشبُو کے رکھوالے ہیں
تُم کِس کا لہُو پینے آئے
ہم پیار سکھانے والے ہیں

اس شہر میں پھر کیا دیکھو گے
جب حرف یہاں مر جائے گا
جب تیغ پہ لے کٹ جائے گی
جب شعر سفر کر جائے گا

جب قتل ہُوا سُر سازوں کا
جب کال پڑا آوازوں کا

جب شہر کھنڈر بن جائے گا
پھر کِس پر سنگ اُٹھاؤ گے
اپنے چہرے آئینوں میں
جب دیکھو گے ڈر جاؤ گے

○

عجب شہر تھے اور عجب لوگ تھے
سِتم صُورتیں تھیں غضب لوگ تھے

فقیر اس گلی کے گداگر بنے
سراپا طلب بے طلب لوگ تھے

وُہ کافر اکیلا کِھنچا دار پر
نمازِ جنازہ میں سب لوگ تھے

انھیں راستوں پر کلاہیں گریں
انھیں رہگزاروں میں جب لوگ تھے

نہ مقتل نہ میلا تماشا کوئی
مگر جا بجا بے سبب لوگ تھے

سبھی سر بہ سجدہ تھے دربار میں
ہم ایسے کہاں بے ادب لوگ تھے

فراز اپنی بربادیوں کا سبب
نہ اب لوگ ہیں اور نہ جب لوگ تھے

○

یہ کس عذاب سے خائف مرا قبیلہ ہے
کہ خون مل کے بھی چہروں کا رنگ پیلا ہے

یہ کیسی زہر بھری بارشیں ہوئیں اب کے
کہ میرے سارے گلابوں کا رنگ نیلا ہے

ہو کس طرح سے محبت کی گفتگو کہ ابھی
مرے لہو سے ترا فرش و سقف گیلا ہے

گداگرانِ سخن کو نوید ہو کہ یہاں
تنک سری ہی فقط رزق کا وسیلہ ہے

فراز اسی لئے ہم زندگی پہ مرتے ہیں
کہ یہ بھی زندگی کرنے کا ایک حیلہ ہے

○

جنھیں زعمِ کمانداری بُہت ہے
انھیں پر خوف بھی طاری بُہت ہے

کچھ آنکھیں بھی ہیں بینائی سے عاری
کچھ آئینہ بھی زنگاری بُہت ہے

نہ جانے کب لُٹے گا شہرِ مقتل
سُنا ہے اَب کے تیاری بُہت ہے

کچھ اب کے ٹُوٹنا چاہا تھا خُود بھی
کچھ اب کے وار بھی کاری بہت ہے

یہاں پیہم قبیلے قتل ہونگے
یہاں شوقِ عزاداری بُہت ہے

شہر آشوب

اپنی بود و باش نہ پُوچھو
ہم سب بے توقیر ہُوئے
کون گریباں چاک نہیں ہے
ہم ہُوئے تم ہُوئے میرؔ ہُوئے

سہمی سہمی دیواروں میں
سایوں جیسے رہتے ہیں
اس گھر میں آسیب بسا ہے
عامل کامل کہتے ہیں

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے
اِک شب جب شب خُون پڑا
گلیوں میں بارُود کی بُو تھی
کلیوں پر سب خُون پڑا

اب کے غیر نہیں تھا کوئی
گھر والے دُشمن نکلے
جن کو برسوں دُودھ پلایا
ان ناگوں کے پھن نکلے

رکھوالوں کی نیّت بدلی
گھر کے مالک بن بیٹھے
جو غاصب تھے محسن کُش تھے
صُوفی سالک بن بیٹھے

جو آواز جہاں سے اُٹھی
اس پر تیر تبر برسے
ایسے ہونٹ سلے لوگوں کے
سرگوشی کو بھی ترسے

گلی گلی میں بندی خانے
چوک چوک میں مقتل ہیں
جلّادوں سے بھی بڑھ چڑھ کر
منصف وحشی پاگل ہیں

کتنے بے گنہوں کے گلے پر
روز کمندیں پڑتی ہیں
بوڑھے بچے گھروں سے غائب
بیبیاں جیل میں سڑتی ہیں

اس کے ناخن کھینچ لیتے ہیں
اس کے بدن کو داغ دِیا
گھر گھر قبریں در در لاشیں
بُجھا ہر ایک چراغ دِیا

ماؤں کے ہونٹوں پر ہیں نوحے
اور بہنیں کُرلاتی ہیں
رات کی تاریکی میں ہوائیں
کیسے سندیسے لاتی ہیں

قاتل اور درباری اس کے
اپنی ہٹ پر قائم ہیں
ہم سب چور لُٹیرے ڈاکو
ہم سب کے سب مُجرم ہیں

ہمیں میں کوئی صُبح سویرے
کھیت میں مُردہ پایا گیا
ہمیں سا دہشت گرد تھا کوئی
چُھپ کے جیسے دفنایا گیا

سارا شہر ہے مُردہ خانہ
کون اس بھید کو جانے گا
ہم سارے لاوارث لاشیں
کون ہمیں پہچانے گا

محاصرہ

مرے غنیم نے مجھ کو پیام بھیجا ہے
کہ حلقہ زن ہیں مرے گرد لشکری اُس کے
فصیلِ شہر کے ہر بُرج ہر منارے پر
کماں بدست ستادہ ہیں عسکری اُس کے

وُہ برق لہر بُجھا دی گئی ہے جس کی تپش
وجُودِ خاک میں آتش فشاں جگاتی تھی
بِچھا دیا گیا بارُود اُس کے پانی میں
وُہ جُوئے آب جو میری گلی کو آتی تھی

سبھی دریدہ دہن اب بدن دریدہ ہُوئے
سپُردِ دار و رسن سارے سر کشیدہ ہُوئے

تمام صُوفی و سالک سبھی شیُوخ و امام
امیدِ لُطف پہ ایوان کجکلاہ میں ہیں
معززینِ عدالت حلف اُٹھانے کو
مثالِ سائلِ مبرم نشستہ راہ میں ہیں

تُم اہلِ حرف کے پندار کے ثنا گر تھے
وُہ آسمانِ ہُنر کے نجُوم سامنے ہیں
بس اِک مصاحبِ دربار کے اشارے پر
گداگرانِ سخن کے ہجُوم سامنے ہیں

قلندرانِ وفا کی اساس تو دیکھو
تُمھارے پاس ہے کون آس پاس تو دیکھو

سو شرط یہ ہے جو جاں کی امان چاہتے ہو
تو اپنے لوح و قلم قتل گاہ میں رکھدو
وگرنہ اب کے نشانہ کمانداروں کا
بس ایک تم ہو، سو غیرت کو راہ میں رکھدو
یہ شرط نامہ جو دیکھا تو ایلچی سے کہا

اُسے خبر نہیں تاریخ کیا سکھاتی ہے
کہ رات جب کِسی خُورشید کو شہید کرے
تو صُبح اِک نیا سُورج تراش لاتی ہے

سو یہ جواب ہے میرا مرے عدُو کے لئے
کہ مُجھ کو حرصِ کرم ہے نہ خوفِ خمیازہ
اُسے ہے سطوتِ شمشیر پر گھمنڈ بُہت
اُسے شکوہِ قلم کا نہیں ہے اندازہ

مرا قلم نہیں کردار اُس محافظ کا
جو اپنے شہر کو محصور کر کے ناز کرے
مرا قلم نہیں کاسہ کسی سبک سر کا
جو غاصبوں کو قصیدوں سے سرفراز کرے

مرا قلم نہیں اوزار اُس نقب زن کا
جو اپنے گھر کی ہی چھت میں شگاف ڈالتا ہے
مرا قلم نہیں اُس دُزدِ نیم شب کا رفیق
جو بے چراغ گھروں پر کمند اُچھالتا ہے

مرا قلم نہیں تسبیح اُس مبلّغ کی
جو بندگی کا بھی ہر دم حساب رکھتا ہے
مرا قلم نہیں میزان ایسے عادل کی
جو اپنے چہرے پہ دُہرا نقاب رکھتا ہے

مرا قلم تو امانت ہے میرے لوگوں کی
مرا قلم تو عدالت مرے ضمیر کی ہے
اسی لئے تو جو لکھا تپاکِ جاں سے لکھا
جبھی تو لوچ کماں کا، زبان تیر کی ہے

میں کٹ گروں کہ سلامت رہوں یقیں ہے مجھے
کہ یہ حصارِ ستم کوئی تو گرائے گا
تمام عمر کی ایذا نصیبیوں کی قسم
مرے قلم کا سفر رائیگاں نہ جائے گا

سرشتِ عشق نے افتادگی نہیں پائی
تو قدِ سرو نہ بینی و سایہ پیمائی!

نابینا شہر میں آئینہ

احمد فراز

بدر ادریس کے

نام

یہی کہا تھا مری آنکھ دیکھ سکتی ہے
تو مجھ پہ ٹوٹ پڑا سارا شہر نابینا

اے دیس سے آنے والے بتا

وہ شہر جو ہم سے چھوٹا ہے وہ شہر ہمارا کیسا ہے
سب دوست ہمیں پیارے ہیں مگر وہ جان سے پیارا کیسا ہے

شب بزمِ حریفاں سجتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں؟
یاروں کی بسر اوقات ہے کیا ہر انجمن آرا کیسا ہے

جب بھی میخانے بند ہی تھے اور وا درِ زنداں رہتا تھا
اب مفتیِ دیں کیا کہتا ہے موسم کا اشارہ کیسا ہے

میخانے کا پندار گیا پیمانے کا معیار کہاں
کل تلخی سے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے

وہ پاس نہیں احساس تو ہے اک یاد تو ہے اک آس تو ہے
دریائے جدائی میں دیکھو تنکے کا سہارا کیسا ہے

ملکوں ملکوں گھومے ہیں بہت جاگے ہیں بہت روئے ہیں بہت
اب تم کو بتائیں کیا یارو دنیا کا نظارا کیسا ہے

یہ شام ستم کٹتی ہی نہیں یہ ظلمت شب گھٹتی ہی نہیں
میرے بدقسمت لوگوں کی قسمت کا ستارہ کیسا ہے

اے دیس سے آنے والے مگر تم نے تو نہ اتنا بھی پوچھا
وہ کوی جسے بن باس ملا وہ درد کا مارا کیسا ہے

تازہ ترین — احمد فراز

۱۵ اکتوبر ۸۳ نیویارک

فہرست

ابیات

بحضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم

مرے رسُول کہ نسبت تجھے اجالوں سے
میں تیرا ذکر کروں صُبح کے حوالوں سے

نہ میری نعت کی مُحتاج ذات ہے تیری
نہ تیری مدح ہے ممکن مرے خیالوں سے

تو روشنی کا پیمبر ہے اور مری تاریخ
بھری پڑی ہے شبِ ظُلم کی مثالوں سے

ترا پیام محبّت تھا اور میرے یہاں
دل و دماغ ہیں پُرنفرتوں کے جالوں سے

یہ اِفتخار ہے تیرا کہ میرے عرش مقام
تو ہمکلام رہا ہے زمین والوں سے

مگر یہ مُفتی و واعظ یہ محتسب یہ فقیہہ
جو مُعتبر ہیں فقط مصلحت کی چالوں سے

خُدا کے نام کو بیچیں مگر خُدا نہ کرے
اثر پذیر ہوں خلقِ خُدا کے نالوں سے

نہ میری آنکھ میں کاجل نہ مُشکبُو ہے لباس
کہ میرے دِل کا ہے رِشتہ خراب حالوں سے

ہے تُرش رو مری باتوں سے صاحبِ منبر
خطیبِ شہر ہے برہم مرے سوالوں سے

مِرے ضمیر نے قابیل کو نہیں بخشا
میں کیسے صُلح کروں قتل کرنے والوں سے

میں بے بساط سا شاعر ہُوں پر کرم تیرا
کہ باشرف ہُوں قبا و کلاہ والوں سے

○

نہ کوئی تازہ رفاقت نہ یارِ دیرینہ
وہ قحطِ عشق کہ دشوار ہو گیا جینا

مرے چراغ تو سورج کے ہم نسب نکلے
غلط تھا اب کے تری آندھیوں کا تخمینہ

یہ زخم کھائیو سر پر بپاسِ دستِ سبُو
وہ سنگِ محتسب آیا بچائیو مینا

تمہیں بھی ہجر کا دُکھ ہے نہ قرب کی خواہش
سنو کہ بھول چکے ہم بھی عہدِ پارینہ

چلو کہ بادہ گساروں کو سنگسار کریں
چلو کہ ٹھہرا ہے کارِ ثواب خوں پینا

اُس ایک شخص کی سج دھج غضب کی تھی کہ فراز
میں دیکھتا تھا، اسے دیکھتا تھا آئینہ،

○

گئی رُتوں میں تو شام و سحر نہ تھے ایسے
کہ ہم اُداس بہت تھے مگر نہ تھے ایسے

یہاں بھی پھول سے چہرے دکھائی دیتے تھے
یہ اب جو ہیں یہی دیوار و دَر نہ تھے ایسے

ملے تو خیر نہ ملنے پہ رنجشیں کیسی
کہ اُس سے اپنے مراسم تھے پر نہ تھے ایسے

رفاقتوں سے مَرا ہُوں مسافتوں سے نہیں
سفر وہی تھے مگر ہم سفر نہ تھے ایسے

○

اب کیا سوچیں کیا حالات تھے کس کارن یہ زہر پیا ہے
ہم نے اس کے شہر کو چھوڑا اور آنکھوں کو موند لیا ہے

اپنا یہ شیوہ تو نہیں تھا اپنے غم اوروں کو سونپیں
خود تو جاگتے یا سوتے ہیں اس کو کیوں بے خواب کیا ہے

خلقت کے آوازے بھی تھے بند اُس کے دروازے بھی تھے
پھر بھی اس کوچے سے گزرے پھر بھی اُس کا نام لیا ہے

ہجر کی رُت جاں لیوا تھی پر غلط سبھی اندازے نکلے
تازہ رفاقت کے موسم تک میں بھی جیا ہوں وہ بھی جیا ہے

ایک فرازؔ تمھیں تنہا ہو جو اب تک دُکھ کے رسیا ہو
ورنہ اکثر دل والوں نے درد کا رستہ چھوڑ دیا ہے

○

اب تو اس طرح مری آنکھوں میں خواب آتے ہیں
جس طرح آئینے چہروں کو ترس جاتے ہیں

احتیاط اہلِ محبت کہ اسی شہر میں لوگ
گل بدست آتے ہیں اور پابہ رسن جاتے ہیں

جیسے تجدیدِ تعلق کی بھی رُت ہو کوئی
زخم بھرتے ہیں تو احباب بھی آ جاتے ہیں

ساقیا تُو نے تو میخانے کا یہ حال کیا
بادہ کش محتسبِ شہر کے گُن گاتے ہیں

طعنۂ نشہ نہ دو سب کو کہ کچھ سوختہ جاں
شدّت تشنہ لبی سے بھی بہک جاتے ہیں

ہر کڑی رات کے بعد ایسی قیامت گذری
صبح کا ذکر بھی آئے تو لرز جاتے ہیں

سفید چھڑیاں

جنم کا اندھا
جو سوچ اور سمجھ کے راستوں پر
کبھی کبھی کوئی خواب دیکھے
تو خواب میں بھی
عذاب دیکھے
نہ نام میرا
نہ ذات میری
مرا قبیلہ
سفید چھڑیاں

○

جان کی پروا پھر کس کو ہو جب قاتل ہو یاروں سا
باتیں ہوں دلداروں جیسی لہجہ ہو غمخواروں سا

کس نے کہا تھا برکھا رُت میں یوں بے دھیان انجان پھرو
بوند پڑے سے اور بھی جیسے بھڑکے جسم انگاروں سا

آتے جاتے سارے موسم اُس سے نسبت رکھتے ہیں
اس کا ہجر خزاؤں جیسا اُس کا قرب بہاروں سا

اب کے ہوائیں یوں چلتی ہیں جیسے دلوں پر تیر چلیں
اب کے گلابوں کا موسم بھی وار کرے تلواروں سا

برسوں بعد فراز کو دیکھا اُس کا حال احوال نہ پوچھ
شعر وہی دل والوں جیسے شغل وہی بنجاروں سا

○

شعلہ تھا جل بجھا ہوں ہوائیں مجھے نہ دو
میں کب کا جا چکا ہوں صدائیں مجھے نہ دو

جو زہر پی چکا ہوں تمہیں نے مجھے دیا
اب تم تو زندگی کی دعائیں مجھے نہ دو

یہ بھی بڑا کرم ہے سلامت ہے جسم ابھی
اے خسروانِ شہر قبائیں مجھے نہ دو

ایسا نہ ہو کبھی کہ پلٹ کر نہ آسکوں
ہر بار دُور جا کے صدائیں مجھے نہ دو

کب مجھ کو اعترافِ محبت نہ تھا فراز
کب میں نے یہ کہا ہے سزائیں مجھے نہ دو

○

صنم تراش پر آدابِ کافرانہ سمجھ
ہر ایک سنگِ سرِ راہ کو خدا نہ سمجھ

میں تجھ کو مانگ رہا ہوں قبول کر کہ نہ کر
یہ بات تیری مری ہے اسے دعا نہ سمجھ

پلٹ کے آئے گا وہ بھی گئی رُتوں کی طرح
جو تجھ سے رُوٹھ گیا ہے اسے جُدا نہ سمجھ

رہِ وفا میں کوئی آخری مقام نہیں
شکستِ دل کو محبت کی انتہا نہ سمجھ

ہر ایک صاحبِ منزل کو با مُراد نہ جان
ہر ایک راہ نشیں کو شکستہ پا نہ سمجھ

فراز آج کی دنیا مرے وجود میں ہے
مرے سخن کو فقط میرا تذکرہ نہ سمجھ

۲۱

طاہرہ کے لئے

ایک نظم

سوچ کے پھیلے صحراؤں میں
آگ سے دِن اور برف سی راتیں
کاٹ کے بھی جب ہاتھ نہ آئیں
لفظ بھی آہُو لگتے ہیں

جب دِل درد کے ویرانوں میں
ریزہ ریزہ چُن کر لائے
اُن سے کوئی یاد جگائے
لفظ بھی آنسو لگتے ہیں

جب میرے کھوئے خوابوں کو
میری کویتا ڈھونڈ کے لائے
گیت بنائے، اور تُو گائے
لفظ بھی جادو لگتے ہیں

ناسپاس

رُو برُو ہیں مرے سب میرے تراشے ہُوئے بُت
میرے شہکار مرے نقش پرانے سارے
کون جانے کہ یہ کن خوابوں کی تعبیریں ہیں
یوں تو اظہارِ غمِ جاں کے بہانے سارے

کوئی گوتم کوئی عیسےٰ کوئی مریم کوئی جوآن
درد کی آگ لیے حُسن کی تقدیس لیے
خود نمائی پہ ہیں مغرُور سبھی کے پیکر
کاوشِ شیشۂ آذر کو فراموش کیے

○

میں کس کا بخت تھا مری تقدیر کون تھا
تو خواب تھا تو خواب کی تعبیر کون تھا

میں بے گلیم لائقِ دشنام تھا مگر
اہلِ قبا میں صاحبِ توقیر کون تھا

اب قاتلوں کا نام و نشاں پوچھتے ہو کیا
ایسی محبّتوں سے بغلگیر کون تھا

میں زخم زخم اس سے گلے مل کے کیوں ہُوا
وہ دوست تھا تو صورتِ شمشیر کون تھا

میزاں بدست کون لرزتا رہا فراز
منصف تھا کون صاحبِ تقصیر کون تھا

○

اِس کا سوچا بھی نہ تھا اب کے جو تنہا گزری
وہ قیامت ہی غنیمت تھی جو یکجا گزری

آ گلے تجھ کو لگا لوں میرے پیارے دشمن
اِک مری بات نہیں تجھ پہ بھی کیا کیا گزری

میں تو صحرا کی تپش، تشنہ لبی بھول گیا
جو مرے ہم نفسوں پر لبِ دریا گزری

آج کیا دیکھ کے بھر آئی ہیں تیری آنکھیں
ہم پہ اے دوست یہ ساعت تو ہمیشہ گزری

میری تنہا سفری میرا مقدّر تھی فراز
ورنہ اس شہرِ تمنّا سے تو دنیا گزری

○

جس کی جانب سے زمانہ ہُوا نامہ نہ پیام
یہ غزل بھی ہے اُسی زود فراموش کے نام

اُس کی قربت کے سمے اُس کی محبّت کے نشے
اتنے شیریں بھی نہ تھے جتنی ہے یادِ ایّام

حرفِ دلبر کوئی قاصد کہ بفیضِ واعظ
شہرِ شیریں سخناں بن گیا شہرِ دُشنام

کل تو اس ہجر کی لذّت کو بھی ترسے گا یہ دِل
اور رُک رُک کے ذرا ساعتِ آسودہ خرام

سو حوالوں سے تجھے یاد کروں جانِ فراز
جانِ جاں، جانِ جہاں، جانِ سخن جانِ کلام

جاؤ!

جاؤ کہ مجھے یقیں نہیں ہے
تم اب کے گئے تو آسکو گے
دہلیز سے اک قدم اُتر کر
وہ راہ گزار منتظر ہے
جس پر جو کوئی چلا گیا ہے
قدموں کے نشاں بجھا گیا ہے
زخموں کے دیے جلا گیا ہے

آئی بینک

میں تو اس کربِ نظارا سے تڑپ اُٹھا ہوں
کتنے ایسے ہیں جنھیں حسرتِ بینائی ہے
جن کی قسمت میں کبھی دولتِ دیدار نہیں
جن کی قسمت میں تماشا نہ تماشائی ہے
جو ترستے ہیں کہ کرنوں کو برستا دیکھیں
جو یہ کہتے ہیں کہ منزل نہیں رستا دیکھیں
ان سے کہہ دو کہ وہ آئیں مری آنکھیں لے لیں

اس سے پہلے کہ مرا جسم فنا ہو جائے
اس سے پہلے کہ یہ خاکسترِ جاں بھی نہ رہے
اس سے پہلے کہ کوئی حشر بپا ہو جائے
خواب ہونے سے بچا لے کوئی میری آنکھیں
اپنے چہرے پہ لگا لے کوئی میری آنکھیں

کون سہہ پائے گا لیکن میری آنکھوں کے عذاب
کس کو یہ حوصلہ ہو گا کہ ہمیشہ دیکھے
اپنی پلکوں کی صلیبوں سے اُترتے ہُوئے خواب
جن کی کرچوں کی چبھن روح میں بس جاتی ہے
زندگی، زندگی بھر کے لیے کُرلاتی ہے

○

تیرے چرچے ہیں جفا سے تیری
لوگ مر جائیں بلا سے تیری

کوئی نسبت کبھی اے جانِ سخن
کسی محروم نوا سے تیری

غمِ جاں ہو کہ غمِ دنیا ہو
یاد دیتی ہے دلاسے تیری

اے مرے ابرِ گریزاں کب تک
راہ تکتے رہیں پیاسے تیری

تیرے مقتل بھی ہمیں سے آباد
ہم بھی زندہ ہیں دعا سے تیری

تو بھی نادم ہے زمانے سے فرازؔ
وہ بھی ناخوش ہیں وفا سے تیری

○

میں تو ہر طرح کے اسبابِ ہلاکت دیکھوں
اے وطن کاش تجھے اب کے سلامت دیکھوں

وہ جو قاتل تھے وہ عیسا نفسی بیچتے ہیں
وہ جو مجرم ہیں انھیں اہلِ عدالت دیکھوں

وہ جو بے ظرف تھے اب صاحبِ میخانہ ہُوے
اب بمشکل کوئی دستار سلامت دیکھوں

گردنیں ٹوٹی ہُوئیں، سر ہیں خمیدہ جن کے
ان کو سرگشتۂ پندارِ امامت دیکھوں

پھرے گا تو بھی یونہی کو بکو ہماری طرح
دریدہ دامن و آشفتہ مُو ہماری طرح

کبھی تو سنگ سے پھُوٹے گی آبجُو غم کی
کبھی تو ٹوٹ کے روئے گا تُو ہماری طرح

پلٹ کے تجھ کو بھی آنا ہے اس طرف لیکن
لُٹا کے قافلۂ رنگ و بُو ہماری طرح

یہ کیا کہ اہلِ ہوس بھی سجائے پھرتے ہیں
دلوں پہ داغ جبیں پر لہُو ہماری طرح

وہ لاکھ دشمنِ جاں ہو مگر خدا نہ کرے
کہ اس کا حال بھی ہو ہُو بہو ہماری طرح

ہمیں فراز سزاوارِ سنگ کیوں ٹھہرے
کہ اور بھی تو ہیں دیوانہ خُو ہماری طرح

○

سرحدیں

کس سے ڈرتے ہو کہ سب لوگ تمھاری ہی طرح
ایک سے ہیں وہی آنکھیں وہی چہرے وہی دل
کس پہ شک کرتے ہو جتنے بھی مسافر ہیں یہاں
ایک ہی سب کا قبیلہ وہی پیکر وہی گِل

ہم تو وہ تھے کہ محبّت تھا وطیرہ جن کا
پیار سے ملتا تو دشمن کے بھی ہو جاتے تھے
اس توقّع پہ کہ شاید کوئی مہماں آ جائے
گھر کے دروازے کھُلے چھوڑ کے سو جاتے تھے

ہم تو آئے تھے کہ دیکھیں گے تمھارے قریے
وہ در و بام کہ تاریخ کے صورت گر ہیں
وہ ارینے وہ مساجد وہ کلیسا وہ محل
اور وہ لوگ جو ہر نقش سے افضل تر ہیں

روم کے بُت ہوں کہ پیرس کی ہو مونا لیزا
کیٹس کی قبر ہو یا تربتِ فردوسی ہو
قرطبہ ہو کہ اجنتا کہ موہنجو داڑو
دیدۂ شوق نہ محرومِ نظر بوسی ہو

(۲)

کس نے دنیا کو بھی دولت کی طرح بانٹا ہے
کس نے تقسیم کیے ہیں یہ اثاثے سارے
کس نے دیوار تفاوت کی اُٹھائی لوگو
کیوں سمندر کے کنارے پہ ہیں پیاسے سارے

خیر تم شوق سے دیکھو مرا سب رختِ سفر
میں تو پاگل ہوں مری بات پہ مت کان دھرو
یہ کتابیں ہیں یہ تحفے ہیں یہ کپڑے میرے
مہر کو ثبت کرو اور مجھے راہداری دو

جب کی بات

میں نے کہا تھا
دِل کے سفر میں
یوں تو بہت سی منزلیں ہیں
لیکن
جاناں
تُم سے آگے کوئی نہیں
آج مگر مجبورِ سفر ہُوں

○

یہ فاصلہ جو پڑا ہے مرے گماں میں نہ تھا
کہ اب کی بار زمانہ بھی درمیاں میں نہ تھا

کوئی بھی نظمِ چمن ہو یہ ہم نے دیکھا ہے
سحر کا نغمہ سرا شامِ آشیاں میں نہ تھا

کہ جس کے ہاتھ میں پتھر کماں میں تیر نہ ہو
کوئی بھی ایسا مرے شہرِ مہرباں میں نہ تھا

دہکتی دُھوپ میں خلقت تھی گوش بر آواز
بجُز خطیب مگر کوئی سائباں میں نہ تھا

دُعائیں میں نے ہی مانگی تھیں رُت بدلنے کی
فراز میرا نشیمن ہی گلستاں میں نہ تھا

○

اس قدر مسلسل تھیں شدّتیں جدائی کی
آج پہلی بار اُس سے میں نے بے وفائی کی

ورنہ اب تلک یُوں تھا خواہشوں کی بارش میں
یا تو ٹوٹ کر رویا یا غزل سرائی کی

تج دیا تھا کل جن کو ہم نے تیری چاہت میں
آج اُن سے مجبُوراً تازہ آشنائی کی

ہو چلا تھا جب مجھ کو اختلاف اپنے سے
تُو نے کس گھڑی ظالم میری ہمنوائی کی

ترک کر چکے قاصد کوئے نامراداں کو
کون اب خبر لاوے شہرِ آشنائی کی

طنز و طعنہ و تہمت سب ہنر ہیں ناصح کے
آپ سے کوئی پوچھے ہم نے کیا بُرائی کی

پھر قفس میں شور اُٹھا قیدیوں کا اور صیّاد
دیکھنا اُڑا دے گا پھر خبر رہائی کی

دُکھ ہوا جب اُس در پر کل فراز کو دیکھا
لاکھ عیب تھے اُس میں خُو نہ تھی گدائی کی

نئی مسافت کا عہد نامہ

مرا لہو رائیگاں نہیں تھا
جو میرے دیوار و در سے ٹپکا
تو شاہراہوں تک آگیا تھا
جہاں کسی کو گماں نہیں تھا
مرا لہو رائیگاں نہیں تھا
مرے مقدر میں آبرو
کی تمام لمبی مسافتیں تھیں
مرے سفر میں
حسینؑ کے سر، مسیح کے جسم
کی سبھی دردناکیاں تھیں اذیتیں تھیں

مگر مرا دردِ بے وقر تھا

مگر مرا دشت بے شجر تھا

یہ بات برسوں کی ہے۔ تو ہو

پر وہ ساعتیں اب بھی نوحہ گر ہیں

جہاں کہیں بھی ہجوم ہوتا

تو سب مری سمت دیکھتے

اور طنز کرتے

کہ اس کو دیکھو

یہ کون پیکر ہے

جس کا چہرہ نہیں

میں ان سے کہتا

کہ میں تمھیں میں سے ہوں

یہ دیکھو

یہ میری مٹی یہ میری دنیا یہ خواب میرے

وہ مجھ سے کہتے

کہ تیری مٹی کو تیری دنیا کو تیرے خوابوں کو کون دیکھے
کہ تیری آنکھیں نہیں
میں اُن سے کہتا کہ
میرے ہاتھوں میں مشعلیں ہیں صداقتوں کی رفاقتوں کی
وہ مجھ سے کہتے
بدن تو دیوار کا بھی ہوتا ہے
ہاتھ اشجار کے بھی ہوتے ہیں
جن کی شاخوں کی نوک پر
صرف ایک پتّا لرزتا رہتا ہے
پر وہ دیوار اور وہ اشجار ہم نہیں ہیں
میں ان سے کہتا
کہ مجھ کو دیکھو
نہ میری گردن میں طوق ہے
اور نہ میرے پاؤں میں بیڑیاں ہیں
مگر وہ کہتے

بہت سے محکوم بے رسن ہیں
کہ دست و پا کی کشادگی کا عذاب
حیواں بھی جھیلتے ہیں
پر ان کے ماتھوں کی لوح پر
کوئی نام کندہ
نہ ان کے چہروں پہ
عہد نامہ کوئی رقم ہے
یہ عہد نامہ
جو ذات بھی کائنات بھی ہے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہے ثبات بھی ہے
میں نسلِ آدم کے اِس قبیلے کا فرد تھا
پر کوئی مجھے جانتا نہیں تھا
میں اپنے ایثار کے فسانے انھیں سُناتا
مگر کوئی مانتا نہیں تھا
ہم ایک جیسے تھے

پر گردہِ الم کشاں میں
کوئی بھی اِک دوسرے کو پہچانتا نہیں تھا
کہ سب کے چہرے تھے سب کے ماتھے تھے

اور ماتھوں پہ
عہد نامے لکھے ہُوئے تھے
محبتوں کے صداقتوں کے
سفر کی ساری رفاقتوں کے
بیافرا کی پہاڑیوں
ویتنام کے جنگلوں
بلا کی قیامتوں کے
تمام پیکر تمام چہرے تھے
آئینے ان علامتوں کے
جو زندگی کا ثبوت بھی ہیں ثبات بھی ہیں
جو ذات بھی کائنات بھی ہیں
میں سر بریدہ پلٹ کے آیا

تو ساتھ سارے نشان لایا
انا کے
پندار کے
وفا کے
مرا لہو ندیوں کی صورت بہا تو قلزم بنا گیا ہے
مرا لہو پھیل کر
مری خوش نہاد مٹی کی سرحدوں کو بچا گیا ہے
وہ میرے چہرے پہ ایسی آنکھیں لگا گیا ہے
جو دوسروں سے عظیم تر ہیں
جو سب کی نظروں میں معتبر ہیں
جو زندگی کا ثبوت بھی ہیں ثبات بھی ہیں
جو ذات بھی کائنات بھی ہیں

○

میں چپ رہا تو سارا جہاں تھا مری طرف
حق بات کی تو کوئی کہاں تھا مری طرف

میں مر گیا وہیں کہ صفِ قاتلاں سے جب
خنجر بدست تُو بھی رواں تھا مری طرف

اب پھر رہا ہوں جسم کے ٹکڑے لیے ہُوے
شاید ہجومِ چارہ گراں تھا مری طرف

مجھ کو مری شکست کا کوئی جواز دو!
کہتے ہیں روشنی کا نشاں تھا مری طرف

یہ اور بات تو نے زمانے کی بات کی
رُوئے سخن تو اے مری جاں تھا مری طرف

میں لشکرِ الم کے مقابل ہوں سرخرو
اِس معرکے میں دل سا جواں تھا مری طرف

میں نے ستم گروں کو پکارا ہے خود فرازؔ
ورنہ کسی کا دھیان کہاں تھا مری طرف

○

جو غیر تھے وہ اسی بات پر ہمارے ہوئے
کہ ہم سے دوست بہت بے خبر ہمارے ہوئے

کسے خبر وہ محبّت تھی یا رقابت تھی
بہت سے لوگ تجھے دیکھ کر ہمارے ہوئے

اب اِک ہجومِ شکستہ دلاں ہے ساتھ اپنے
جنھیں کوئی نہ مِلا ہم سفر ہمارے ہوئے

کسی نے غم تو کسی نے مزاجِ غم بخشا
سب اپنی اپنی جگہ چارہ گر ہمارے ہوئے

بجھا کے طاق کی شمعیں نہ دیکھ تاروں کو
اسی جنوں میں تو برباد گھر ہمارے ہوئے

وہ اعتماد کہاں سے فرازؔ لائیں گے
کسی کو چھوڑ کے وہ اب اگر ہمارے ہوئے

رات اور چاند میں جب سرگوشی ہوتی ہے
دل کی درد سے ہم آغوشی ہوتی ہے

اپنا گھر چھوڑا یا اُس کا در چھوڑا
اس کے بعد تو خانہ بدوشی ہوتی ہے

بوجھ وفا کا ہم نے اٹھایا یا تم نے
ہمسفروں میں یہ ہمدوشی ہوتی ہے

بستی والے ایسے خوف زدہ کب تھے
اب تو خود سے بھی سرگوشی ہوتی ہے

آدھی رات کو زنداں کا در کھلتا ہے
اس کے بعد طویل خموشی ہوتی ہے

حرف فروشوں کا میلا لگتا ہے فرازؔ
جب دربار میں بَردہ فروشی ہوتی ہے

○

یہ میں بھی کیا ہوں، اُسے بھول کر اُسی کا رہا
کہ جس کے ساتھ نہ تھا، ہمسفر اُسی کا رہا

وہ بُت کہ دشمنِ دیں تھا بقول ناصح کے
سوالِ سجدہ جب آیا تو در اُسی کا رہا

ہزار چارہ گروں نے ہزار باتیں کیں
کہا جو دل نے سُخن معتبر اُسی کا رہا

بہت سی خواہشیں سو بارشوں میں بھیگی ہیں
میں کس طرح سے کہوں عمر بھر اُسی کا رہا

کہ اپنے حرف کی توقیر جانتا تھا فرازؔ
اسی لیے کفِ قاتل پہ سر اُسی کا رہا

ہم جیسے

حسین تجھ پہ کہیں کیا سلام ہم جیسے
کہ تُو عظیم ہے بے ننگ و نام ہم جیسے

برنگِ ماہ ہے بالائے بام تجھ جیسا!
تو فرشِ راہ کئی زیرِ بام ہم جیسے

وہ اپنی ذات کی پہچان کو ترستے ہیں
جو خاص تیری طرح ہیں نہ عام ہم جیسے

یہ بے گلیم جو ہر کربلا کی زینت ہیں
یہ سب ندیم یہ سب تشنہ کام ہم جیسے

بہت سے دوست سرِ دار تھے جو ہم پہنچے
سبھی رفیق نہ تھے سست گام ہم جیسے

خطیبِ شہر کا مذہب ہے بیعتِ سلطاں
ترے لہو کو کریں گے سلام ہم جیسے

تُو سر بریدہ ہُوا شہرِ ناسپاساں میں
زباں بریدہ ہُوئے ہیں تمام ہم جیسے

پہن کے خرقۂ خوں بھی کشیدہ سر ہیں فرازؔ
بغاوتوں کے علم تھے مدام ہم جیسے

ایک شعر

شاید کوئی خواہش روتی رہتی ہے
میرے اندر بارش ہوتی رہتی ہے"

○

دل منافق تھا شبِ ہجر میں سویا کیسا
اور جب تجھ سے مِلا ٹوٹ کے رویا کیسا

زندگی میں بھی غزل ہی کا قرینہ رکھا
خواب در خواب ترے غم کو پرویا کیسا

اب تو چہروں پہ بھی کتبوں کا گماں ہوتا ہے
آنکھیں پتھرائی ہوئی ہیں لبِ گویا کیسا

دیکھ اب قرب کا موسم بھی نہ سرسبز لگے
ہجر ہی ہجر مراسم میں سمویا کیسا

ایک آنسو تھا کہ دریائے ندامت تھا فراز
دل سے بیباک شناور کو ڈبویا کیسا

واپسی

اُس نے کہا

سُن

عہد نبھانے کی خاطر مت آنا

عہد نبھانے والے اکثر

مجبوری یا مہجوری کی تھکن سے لوٹا کرتے ہیں

تم جاؤ

اور دریا دریا پیاس بجھاؤ

جن آنکھوں میں ڈوبو

جس دل میں بھی اُترو

میری طلب آواز نہ دے گی

لیکن جب میری چاہت

اور میری خواہش کی لَو

اتنی تیز اور اتنی

اُونچی ہو جائے

جب دل رو دے

تب لوٹ آنا

○

اے خدا آج اسے سب کا مقدر کر دے
وہ محبت کہ جو انساں کو پیمبر کر دے

سانحے وہ تھے کہ پتھرا گئیں آنکھیں میری
زخم یہ ہیں تو مرے دل کو بھی پتھر کر دے

صرف آنسو ہی اگر دستِ کرم دیتا ہے
میری اُجڑی ہوئی آنکھوں کو سمندر کر دے

مجھ کو ساقی سے گلہ ہو نہ تُنک بخشی کا
زہر بھی دے تو مرے جام کو بھر بھر کر دے

شوق اندیشوں سے پاگل ہُوا جاتا ہے فرازؔ
کاش یہ خانہ خرابی مجھے بے در کر دے

○

اپنی طرح ہی کوئی پریشانیوں میں تھا
اے شہرِ درد جو بھی ترے بانیوں میں تھا

میں بھی پھرا ہُوں کشتیٔ عمرِ رواں لیئے
وینس کا سارا شہر کھُلے پانیوں میں تھا

کیا میرے زخم دیکھتی دنیا کہ ہر کوئی
مصرُوف اپنی چاک گریبانیوں میں تھا

اے دل ترے سکوں سے تری رونقیں گئیں
دریا کا سارا حُسن ہی طغیانیوں میں تھا

صیّاد و گلفروش ہی خوش بخت ہیں فرازؔ
جو بھی چمن پرست تھا زندانیوں میں تھا

اس منظرِ سادہ میں کئی جال بندھے تھے
جب اس کا گریبان کھُلا بال بندھے تھے

اے زود فراموش کہاں تو ہے کہ تجھ سے
میرے تو شب و روز و مہ و سال بندھے تھے

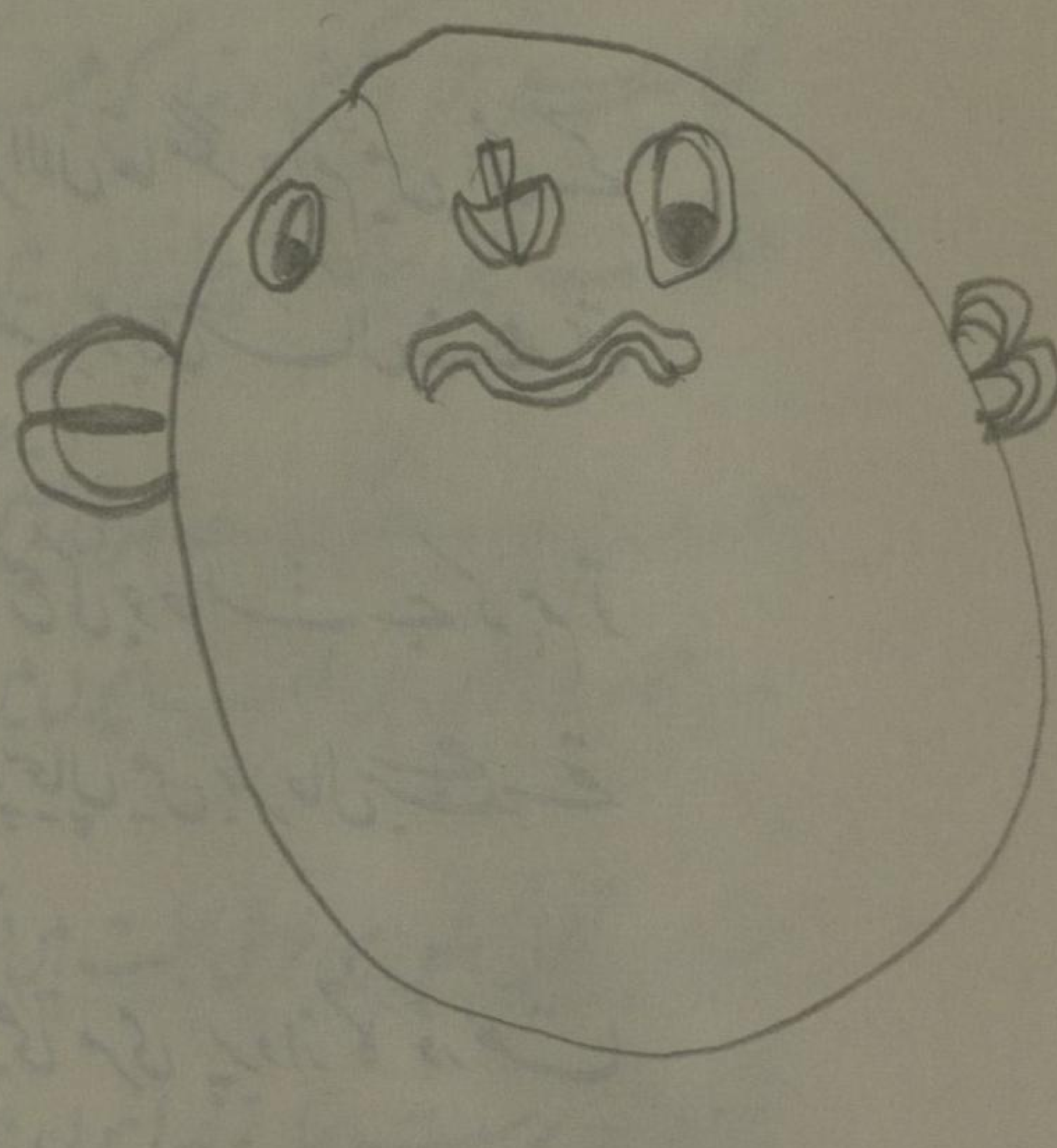
وہ رشکِ غزالاں تھا مگر دام میں اُس کے
ہم جیسے کئی صیدِ زبوں حال بندھے تھے

دیکھے کوئی ناصح کی جو حالت ہے کہ ہم تو
اُس گیسوئے پیچاں میں بہر حال بندھے تھے

صیّاد کو پھر بھی مری پرواز کا ڈر تھا
میں گرچہ قفس میں تھا پر و بال بندھے تھے

یوں دل تہ و بالا کبھی ہوتے نہیں دیکھے
اِک شخص کے پاؤں سے تو بھونچال بندھے تھے

وقت آیا تو میں مقتلِ شب میں تھا اکیلا
یاروں کی گرہ میں فقط اقوال بندھے تھے



یوں تو کہنے کو بہت لوگ شناسا میرے
کہاں لے جاؤں تجھے اے دلِ تنہا میرے

وہی محدود سا حلقہ ہے شناسائی کا
یہی احباب مرے ہیں یہی اعدا میرے

میں تہِ کاسہ و لب تشنہ رہوں گا کب تک
تیرے ہوتے ہوئے اے صاحبِ دریا میرے

مجھ کو اس ابرِ بہاری سے ہے کب کی نسبت
پر مقدر میں وہی پیاس کے صحرا میرے

دیدہ و دل تو ترے ساتھ ہیں اے جانِ فراز
اپنے ہمراہ مگر خواب نہ لے جا میرے

کاریز [1]

فضیلہ!

مجھے یاد کب تھیں

وہ باتیں جو میں نے کہی تھیں

مگر آج جب ٹیپ کے ایک فیتے سے

تیری اُداس اور مہجور آواز کی آنچ آئی

(جو تیری پشیمانیوں اور حرماں نصیبی کی غمّاز ہے)

تو مجھ کو وہ شب

اور اُس شب کی سب گفتگو یاد آئی

مجھے اپنے لہجے کی تلخی کا دکھ ہے

مگر یہ بھی مشکل کہ موضوع ایسا تھا

"کرب اپنے مجبور لوگوں کا"

"اندوہ اپنی زمیں کا"

[1] بلوچستان کے زمین دوز چشمے

تجھے کیا خبر

آنے والے دِنوں کے تصوّر سے
میں کانپ اُٹھتا ہُوں
سوچیں جو تلوار کی کاٹ رکھتی ہیں
اب یہ ہمارا مقدّر رہیں گی
میں شیشے کی دیوار سے
سامنے کے پہاڑوں کو جب دیکھتا ہُوں
تو لگتا ہے جیسے
ترے قریۂ بے اماں کے
کبیدہ جبیں کوہساروں کے چہرے
جو بارُود کے بادلوں سے اَٹے
خُونِ خلقت سے تر
تجُھ سے مایُوس ہو کر
نئی سرحدوں کی طرف دیکھتے ہیں
فضیلہ!

اگر میری آنکھوں پہ شک ہے
تو پھر اِن ہواؤں کے لہجے کو پہچان
اور سُن
کہ ان کا کہا مُعتبر ہے
ہواؤں نے تُم سے کہا تھا
کہ اِن بے نوا کوہساروں کی بے آسرا چوٹیوں پر
سَدا برف تھی
اور ہمیشہ رہے گی
مگر جب بھی ندی کوئی
کلۂ کوہ سے دامنِ کوہ کی
آرزو میں روانہ ہُوئی تو
اُسے خشک کھیتوں نے
بنجر زمینوں نے
محروم سینوں نے
کن حسرتوں سے پُکارا

فضیلہ

تُجھے کیا خبر
تُو کہ گھاٹل ہواؤں کے
غمناک لہجوں کی پروردہ
مہجُور ندّی تھی
جو اک مقدّس سفر پر چلی تھی
مگر جس نے منزل بدل دی
نہانے کے تالاب
اگرچہ بُہت خُوشنما ہیں
مگر تیرے مسکن نہیں تھے
وہ تو جس کو کاریز بننا تھا
کاریز بنتی
تو بہتر نہیں تھا ؟

ناتمام مسافتیں

دیکھو ذرا ادھر کہ چلے تھے جہاں سے ہم
کچھ پھول کچھ چراغ ابھی واہموں میں ہیں
بے اعتمادیوں کا دھواں بھی سہی مگر
کچھ گیت بھی تو شہر کی خاموشیوں میں ہیں
اک سوگوار شامِ خزاں بھی سہی مگر
بکھرے ہُوئے گلاب ابھی راستوں میں ہیں

جب ہم ہوئے تھے شوق کی راہوں پہ گامزن
رہزن نہیں ملے تھے کہ مقتل نہ آئے تھے
صحرائے غم سے تابہ ہوائے گُلِ مُراد
کن کن قیامتوں نے نہ فتنے اٹھائے تھے
قول و قرار و وعدہ و پیماں سے بے خبر
یہ خواب یہ گلاب ہمیں نے سجائے تھے

اک پل رکو یہیں سے بدلتے ہیں راستے
ٹھہرو ذرا کہ موڑ جُدائی کا آگیا
اب سامنے کی اَور ہواؤں کا شہر ہے
اب تک تو اس طرف جو گیا سو چلا گیا
شمعیں تو کیا یہاں دل و دیدہ بھی بُجھ گیا
یہ دشت کتنے راہ نوردوں کو کھا گیا

ٹھہرو ذرا کہ مرگِ تمنّا سے پیشتر،
اپنی رفاقتوں کو پلٹ کر بھی دیکھ لیں
گذری مُسافتوں پہ بھی ڈالیں ذرا نظر
قربت کی ساعتوں کا مقدّر بھی دیکھ لیں
شاید کہ مل سکیں نہ نئے موسموں میں ہم
جاتی رُتوں کے آخری منظر بھی دیکھ لیں

○

اے تو کہ روز و شب کو مہ و ماہتاب دے
برسوں کی جاگتی ہوئی آنکھوں کو خواب دے

میں وہ کہ نقش گر ترے ارض و سما کا ہوں
تو وہ کہ مجھ کو دونوں جہاں کے عذاب دے

میں نے تو تن بدن کا لہو نذر کر دیا
اے شہریار تو بھی تو اپنا حساب دے

وہ سنگ ہو کہ پھول، ودیعت ہے یار کی
لازم نہیں گلاب کے بدلے گلاب دے

کب بے ہنر کے ہاتھ قلم کر دیئے گئے
اب کون پتھروں کو نگینوں کی آب دے

اب جو بھی حال کوئے ستمگر میں ہو فراز
اب جو بھی بد دعا دلِ خانہ خراب دے

○

نہ جانے ایسی بھی کیا بات تھی سخن میں مرے
ہزار تیر ترازو رہے بدن میں مرے

یہ کیسا درد کا سیلاب جی سے گذرا ہے
یہ کس نے آگ لگا دی ہے پیرہن میں مرے

ترے وصال کے نشّے ترے فراق کے دُکھ
تمام ذائقے محفوظ ہیں بدن میں مرے

دلِ فریب زدہ پھر نئے فریب میں ہے
کہ تذکرے ہیں بہت تیری انجمن میں مرے

نہیں کہ زیست ہی اپنی قبائے مُفلس تھی
فرازؔ سینکڑوں پیوند ہیں کفن میں مرے

چلو عذاب ہیں دوستی کے یونہی سہی
کہ وہ کسی کا ہوا، ہم کسی کے یونہی سہی

ہمیں ہدف، ہمیں بسمل، ہمیں پہ طعنہ زنی
ستم اُسی کے، گِلے بھی اُسی کے یونہی سہی

جگر فگار کرو دِل کو تار تار کرو
یہی صِلے ہیں اگر آگہی کے، یونہی سہی

میں کب تلک ترے سفّاک سچ کا زہر پیوں
وفا کے بول سنا جھوٹ ہی کے یونہی سہی

مگر وہ لوگ تھے شاداب موسموں کے فرازؔ
مگر وہ خواب تھے نتھیا گلی کے یونہی سہی

اِتنے چُپ کیوں ہو!

اِتنے چپ کیوں ہو رفیقانِ سفر کچھ تو کہو
درد سے چُور ہُوئے ہو کہ قرار آیا ہے
بھر گیا ہجر کا ہر زخم کہ جی ہار چلے
بجھ گیا شوق کہ پیغامِ نگار آیا ہے
نامُرادی کی تھکن ہے کہ خمارِ شبِ وصل
جاں سلگتی ہے کہ چہروں پہ نکھار آیا ہے

کتنی اُجڑی ہُوئی رُت ہے کہ سکوں ہے نہ جنوں
اتنی بے فیض ہُوئی بادِ بہاری کیسے

نہ کہیں نوحۂ جاں ہے نہ کہیں نغمۂ دل
کچھ تو بولو کہ شبِ درد گزاری کیسے

سر بہ زانو ہو تو کیوں چاک گریباں والو
بازیٔ راہِ طلب جیت کے ہاری کیسے

○

خود کو ترے معیار سے گھٹ کر نہیں دیکھا
جو چھوڑ گیا اُس کو پلٹ کر نہیں دیکھا

میری طرح تُو نے شبِ ہجراں نہیں کاٹی
میری طرح اُس تیغ پہ کٹ کر نہیں دیکھا

تو دشنۂ نفرت ہی کو لہرا تا رہا ہے
تو نے کبھی دشمن سے لپٹ کر نہیں دیکھا

تھے کوچۂ جاناں سے پرے بھی کئی منظر
دل نے کبھی اس راہ سے ہٹ کر نہیں دیکھا

اب یاد نہیں مجھ کو فراز اپنا بھی پیکر
جس روز سے بکھرا ہوں سمٹ کر نہیں دیکھا

ہر کوئی تیری داستاں انجمن انجمن کہے
اَب کے ترے فراق میں ہم نے عجب سخن کہے

دونوں کو زعمِ عشق ہے، لیکن اس اختلاف سے
میں اُسے جسم و جاں کہوں تُو اُسے پیرہن کہے

وقت پہ اپنے آپ کو سَب نے گلے لگا لیا
یُوں تو نگارِ شہر کو ہر کوئی جانِ من کہے

ضبط کے موسموں میں بھی دونوں شریکِ حال تھے
فصلِ سپردگی ہے اب کچھ تو ترا بدن کہے

خلعتِ شہر یار کو سَبؔ نے قبول کر لیا
میں بھی اسے کفن کہوں تو بھی اسے کفن کہے

گفتۂ یار پر فرازؔ کس طرح حرف گیر ہوں
ہم نے بھی اُس سے بارہا جھوٹ ضرورتاً کہے

اے مرے یار کی قاتل

(مصطفےٰ زیدی کی موت پر)

اے مرے یار کی قاتل تجھے دیکھوں تو کہوں
کس طرح دستِ حنائی سے جھلکتا ہے لہو
کس طرح زہر عطا کرتے ہیں بلّور سے ہاتھ
کس طرح روح کو ڈستی ہے بدن کی خوشبو

یوں تو عشّاق کی منزل ہے یہی مشتِ فنا
"قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا
پھر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا"

۷۴

کہاں سے لائیں

نہ یوں کہ آغازِ فصلِ گل میں
خموشیاں کوئی گیت گائیں

نہ یوں کہ مہجور جنگلوں میں
اُداس جگنو دیئے جلائیں

نہ یوں کہ خندہ دِلی سے رو دیں
نہ یوں کہ رو رو کے مُسکرائیں

نہ کوئی منظر کہ آشنا ہو
تو ہمدمی کا فریب کھائیں

نہ کوئی اپنا جو غیر سا ہو
کہ جس کو تیرے سخن سنائیں

یہ شامِ دل کس طرح کٹے گی
کوئی خلش اب کہاں سے لائیں

○

بلا سے ہم حصارِ سنگ پہنیں
یہ سنّاٹے مگر آہنگ پہنیں

یہ کیا کہتے ہو اے بے چہرہ لوگو
کہ آئینے لباسِ زنگ پہنیں

بہار آنے تلک پیڑوں کی صورت
چلو ہم بھی خزاں کے رنگ پہنیں

ردائے زخم ہو یا چادرِ گُل
جو پہنیں ہم سبھی کے سنگ پہنیں

فراز اس شہر میں طوق و سلاسل
سبھی یارانِ خوش آہنگ پہنیں

۷۷

یہ وقت بھی آنا تھا ہمیں غم طلبوں پر
اب تجھ سے بچھڑنے کی دُعائیں ہیں لبوں پر

چرچے تری معصُوم نگاہی کے بہُت تھے
اِلزام تو آنا تھا ہمیں بے اَدبوں پر

پیراہنِ گُل زینتِ شمشاد قداں ہے
یہ خلعتِ زیبا نہ سجا کم نَسبوں پر

میں بندۂ گمُنام و تہی کاسہ و بے در
الطاف ترے خواجہ و سلطاں لقبوں پر

کب اتنے تسلسل سے ترا نام لیا تھا
شاذؔ کہ مِری جان مری جاں ہے لبوں پر

دیوارِ گریہ

وہ کیسا شعبدہ گر تھا
جو مصنوعی ستاروں
اور نقلی سورجوں کی
اِک جھلک دکھلا کے
میرے سادہ دل لوگوں
کی آنکھوں کے دیئے
ہونٹوں کے جگنو
لے گیا۔

اور اب یہ عالم ہے
کہ میرے شہر کا
ہر اک مکاں
اک غار کی مانند
محرومِ نوا ہے
اور ہنستا بولتا ہر شخص
اِک دیوارِ گریہ ہے

○

دشتِ نامرادی میں ساتھ کون تھا کس کے
مرثیے سُناتی ہے شہر کی ہَوا کس کے

ہم تو کل نہیں ہوں گے دیکھنا کہ محفل میں
اب سخن سناتا ہے یارِ بے وفا کس کے

عہدِ ہجر میں یارو سب کے حوصلے معلوم
دل پہ ہاتھ تھا کس کا لب پہ تھی دعا کس کے

کل صلیب گر جو تھا کل صلیب پر جو تھا
آج نام لیوا ہیں لوگ جا بجا کس کے

اب فرازؔ تجھ پر بھی اعتبار کیا کیجیے
انتظار تھا کس کا ساتھ چل پڑا کس کے

○

چراغِ شامِ وفا میں جلے نہ تھے ایسے
کہ دل زدوں ہیں کبھی من چلے نہ تھے ایسے

ہجوم ایسا کہ مقتل میں جا نہیں ملتی
یہ جاں نثار سروں سے ٹلے نہ تھے ایسے

جو اہلِ دل تھے وہ جاں سے گزر گئے کہ نہیں
فراقِ یار ترے مرحلے نہ تھے ایسے

جہاں کی وضع کو دیکھو تو ہم سے پیار کرو
چلو یہ مان لیا ہم بھلے نہ تھے ایسے

فرازؔ اب کے عجب آگ سی وجود میں ہے
کہ دل پہ زخم تو تھے آبلے نہ تھے ایسے

○

مرا ہی رنگ پریدہ ہر اک نظر میں رہا
وگرنہ درد کا موسم تو شہر بھر میں رہا

کسی کو گھر سے نکلتے ہی مل گئی منزل
کوئی ہماری طرح عمر بھر سفر میں رہا

بہت سے لوگ تھے گھُل مل کے سب سے باتیں کیں
وہ جس کو میں نے نہ دیکھا مری نظر میں رہا

کچھ اس طرح سے گزاری ہے زندگی جیسے
تمام عمر کسی دوسرے کے گھر میں رہا

وداعِ یار کا منظر فراز یاد نہیں
بس ایک ڈوبتا سوُرج مری نظر میں رہا

میں زِندہ ہُوں

میں ابھی زندہ ہُوں
تُم نے سنگباری کی
مرے پیکر کو دیواروں کے قالب میں چُنا
ناگوں سے ڈسوایا
صلیبوں پر چڑھایا
زہر پلوایا
جلایا
پھر بھی میں سچ کی طرح پائندہ ہُوں
میں زندہ ہُوں
میرا چہرہ میری آنکھیں میرے بازُو
میرے لب
زندہ ہیں سب
میں شہابِ شب

ہزاروں بار ٹوٹا
اور بکھرا
پھر بھی میں رخشندہ ہوں
میری طاقت میرے بالوں میں
نہ میرے ناخنوں میں تھی نہاں
میں حصاروں میں چھپا تھا
اور نہ تیغوں کی پناہوں میں چلا
میری طاقت میری قوّت
حرف تھا
سلسبیلِ حرف سے میں نے پیا
آبِ بقا
حرف جو سچائیوں کی ابتداء اور انتہا
وجدان کی شمع نوا
سب کا خُدا
تم نے کالے سورجوں کو

اپنے ہاتھوں پر دھرا
مصنوعی مہتابوں کو
ماتھوں پر چپنا
کافور کی شمعوں سے طاقِ ذات کو
روشن کیا
تم نے چاہا تھا
کہ خال و خد تمہارے بھی
کہیں چمکیں
تمھیں بھی لوگ پہچانیں
تمھیں بھی دیوتا مانیں
مگر تم شکل سے عاری تھے
صورت گر بھی کیا کرتے
تمہارے جسم بے توقیر و بے جاں
اور تمہارے تاج طاقوں پر دھرے ہیں
اور تمہارے پیرہن

تابوت کا استر بنے
خاکستری ڈھانچوں کو ڈھانپے
اب عجائب گھر کے تہہ خانوں میں سڑتے ہیں
تُمھارے استخواں نوواردوں کی چاپ سنے
یوں کانپ اُٹھتے ہیں
کہ جیسے صُبحِ محشر کا بلاوا ہو
سُنو اے کجکلاہو
سنو! اے خُداوندو
اب تم فقط ماضی ہو
میں آئِندہ ہُوں
میں نہ اپنے دوش سے نادم نہ اپنے حال سے شرمندہ ہُوں
میں زندہ ہُوں
تابندہ ہُوں
رقصندہ ہُوں
پائندہ ہُوں

○

جن کے نغموں کو ہیں پیکان عزیز
اُن پرندوں کو کہاں جان عزیز

وہ مری چاک قبائی دیکھیں
ہے جنہیں خلعتِ سلطان عزیز

اب تو ناموسِ جنوں کے بدلے
وحشیوں کو ہیں گریبان عزیز

اُن کی دہلیز پہ سائل ہیں جنہیں
دردمندوں سے ہیں دربان عزیز

فیصلہ تیر فگن چاہتا ہے
جان پیاری ہے کہ پیکان عزیز

پندِ ناصح سے زیادہ ہم کو
ابروئے یار کے فرمان عزیز

○

خوں بہا دو کہ نہ دو جان ہے نذر
اب ہمیں نفع نہ نقصان عزیز

کشتیٔ نوح کو مژدہ ہو کہ اب
شہر والوں کو ہے طوفان عزیز

یوں تو ہیں اور صحیفے بھی فرازؔ
ہم کو غالبؔ کا ہے دیوان عزیز

○

نامرادی کا یہ عالم بھی تو اے دل نہ رہے
ہم تو اب ترکِ تعلّق کے بھی قابل نہ رہے

بزمِ مقتل جو سجے کل تو یہ امکان بھی ہے
ہم سے بسمل تو رہیں آپ سا قاتل نہ رہے

یوں تو ہر شخص ہے اندیشۂ رہزن کا اسیر
کارواں نیّتِ رہبر سے بھی غافل نہ رہے

آج اس نے شرفِ ہمسفری بخشا تھا
اس طرح سے کہ مجھے خواہشِ منزل نہ رہے

سامنے تُو ہو تو سو خواہشیں جاگ اُٹھتی ہیں
کاش اب کے میری آنکھوں میں مرادل نہ رہے

جو بھی ہو صاحبِ محفل وہی کہتا ہے فرازؔ
کہ وہ اُٹھ جائے جو محفل سے تو محفل نہ رہے

○

اِک خوابِ زندگی کے سبھی خواب لے گیا
اس خواب کو بھی نیند کا سیلاب لے گیا

آیا تو ساتھ ہجر کی راتیں لیے ہُوئے
رخصت ہُوا تو انجم و مہتاب لے گیا

رہرو بھی خود، رفیق بھی خود، راہزن بھی خود
اک میرِ قافلہ سبھی القاب لے گیا

کیا پیرِ میکدہ ہے کہ مسند کی حرص میں
میخانۂ وفا کے سب آداب لے گیا

دیکھا یہ سانحہ بھی کہ کشتی کو ناخدا
جب ڈوبنے لگا تو تہِ آب لے گیا

اے مستِ خواب ناز قیامت گذر گئی
"مژگاں تو کھول شہر کو سیلاب لے گیا"

سب اپنے اپنے خواب لیے اس کے در پہ تھے
میں بھی فرازؔ دیدۂ بے خواب لے گیا

○

یہ شہر سحر زدہ ہے صدا کسی کی نہیں
یہاں خود اپنے لیے بھی دُعا کسی کی نہیں

خزاں میں چاک گریباں تھا میں، بہار میں تُو
مگر یہ فصلِ ستم آشنا کسی کی نہیں

سب اپنے اپنے فسانے سناتے جاتے ہیں
نگاہِ یار مگر ہم نوا کسی کی نہیں

میں آج زد پہ اگر ہُوں تو خوش گمان نہ ہو
چراغ سب کے بُجھیں گے ہوا کسی کی نہیں

فراز اپنی جگر کاویوں پہ ناز نہ کر
کہ یہ متاعِ ہنر بھی سدا کسی کی نہیں

ہم اپنے خواب کیوں بیچیں

فقیرانہ روش رکھتے تھے
لیکن اس قدر نادار بھی کب تھے
کہ اپنے خواب بیچیں
ہم اپنے زخم آنکھوں میں لئے پھرتے تھے
لیکن رُوکشِ بازار ہم کب تھے
ہمارے ہاتھ خالی تھے
مگر ایسا نہیں پھر بھی
کہ ہم اپنی دریدہ دامنی
الفاظ کے جگنو
لئے گلیوں میں آوازہ لگاتے
"خواب لے لو خواب"
لوگو
اتنے کم پندار ہم کب تھے

ہم اپنے خواب کیوں بیچیں
کہ جن کو دیکھنے کی آرزو میں
ہم نے آنکھیں تک گنوا دی تھیں
کہ جن کی عاشقی میں
اور ہوا خواہی میں
ہر ترغیب کی شمعیں بجھا دی تھیں
چلو ہم بے نوا
محرومِ سقف و بام و در ٹھہرے
چلو ہم بد مقدّر بے ہُنر ٹھہرے
پر اپنے آسماں کی داستانیں
اور زمیں کے انجم و مہتاب کیوں بیچیں
خریدارو!
تم اپنے کاغذی انبار لائے ہو
ہوس کی منڈیوں سے درہم و دینار لائے ہو
تم ایسے دام تو ہر بار لائے ہو

مگر تُم پر ہم اپنے حرف کے طاؤس
اپنے خُون کے سرخاب کیُوں بیچیں
ہمارے خواب بے وُقعت سہی
تعبیر سے عاری سہی
پر دل زدوں کے خواب ہی تو ہیں
نہ یہ خوابِ زُلیخا ہیں
کہ اپنی خواہشوں کے یُوسفوں پر تہمتیں دھرتے
نہ یہ خوابِ عزیزِ مصر ہیں
تعبیر جن کی اُس کے زندانی بیاں کرتے
نہ یہ اُن آمروں کے خواب
جو بے آسرا خلقِ خُدا کو دار پر لائیں
نہ یہ غارت گروں کے خواب
جو اوروں کے خوابوں کو تہہِ شمشیر کر جائیں
ہمارے خواب تو اہلِ صفا کے خواب ہیں
حرف و نوا کے خواب ہیں

مہجور دروازوں کے خواب
محصور آوازوں کے خواب
اور ہم یہ دولتِ نایاب کیوں نہ بیچیں
ہم اپنے خواب کیوں نہ بیچیں؟

○

زندگی کی اب نئی رسمیں بنا دی جائیں گی
جسم ڈھ جائیں گے دیواریں اُٹھا دی جائیں گی

اب مکانوں میں مکیں ہوں گے نہ آوازوں کے پھول
صرف دیواروں پہ تصویریں لگا دی جائیں گی

ایک لمحے کے لیے صدیوں کا خوں ہو جائے گا
ایک خواہش کے لیے عمریں گنوا دی جائیں گی

لفظ تڑپیں گے مگر اذنِ سخن چھن جائے گا
روشنی ہو گی مگر آنکھیں بجھا دی جائیں گی

خود کو ڈھونڈو گے بسانِ نقشِ پائے رفتگاں
بستیوں کی بستیاں صحرا بنا دی جائیں گی

کل کا سورج حشر در آغوش نکلے گا فرازؔ
چاند جیسی صورتیں ایندھن بنا دی جائیں گی

لبِ گویا

اک شاعرِ درویش و قدح خوار خدا مست
میں کون، جو لکھوں، تری عظمت کے قصیدے

جبرئیل کے پر ہوں تو وہاں تک نہ پہنچ پاؤں،
آوازِ جہاں سے ترا سازِ ابدی دے

تو وہ ہے کہ الہام ترے حرف کو ترسے
میں وہ کہ مجھے طعن مری بے ہنری دے

تو جبر شہی میں بھی علمدارِ جنوں تھا
میں نالہ بہ دل ہوں کہ کوئی ہونٹ نہ سی دے

دہلیز نشیں ہوں میں ترے کاخِ سخن کا
میں کون، مگر تُو شرفِ ہم سخنی دے

دے اِذن کہ میں تجھ کو بتاؤں کہ ترے بعد
جو حال ہُوا ہے ترے خوابوں کے چمن کا

اغیار کے ہر وار کو ہم جھیل گئے تھے
ہر چند کہ چرچا تھا بہت دار و رسن کا

تو برّشِ شمشیرِ حریفاں سے تھا بسمل
ہم کو ہے گِلہ دشنۂ اربابِ وطن کا

"ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات"
شیوہ ہے وہی گردشِ افلاکِ کہن کا

ناوک ہی رہا قسمتِ ہر دیدۂ بینا
نیزہ ہی مقدّر رہا بے باک دہن کا

اے ہاتفِ اسرارِ بشر سُن کے ترے بعد
کس طرح ترے درس کی توہین ہوئی ہے

معنوں سے تہی کر کے ترے حرفِ خودی کو
شعروں سے فقط وعظ کی تزئین ہوئی ہے

تھی فقر و توکّل کی مغنّی تری ہستی
یاں کذب و تصوّف ہی کی تلقین ہوئی ہے

جو مشقِ ستم مشغلۂ اہلِ جفا تھا
وہ رسمِ ستم شہر کا آئین ہوئی ہے

دربار سے وہ رشتہ رہا مُفتیٔ دیں کا
ممبر سے ہر ارشاد پہ آمین ہوئی ہے

ہیں اب بھی وہی بندۂ مزدور کے اوقات
گو دولتِ اربابِ امارت ہوئی دہ چند

ہے اوج پہ سرمایہ پرستی کا نصیبہ
دریوزہ گرِ نانِ شبینہ ہے ہنرمند

پیغامِ مساوات کہ دنیا کے لیئے تھا
واعظ نے کیا کوزہ و تسبیح کا پابند

مسجد میں تو محتاج و غنی ایک ہیں لیکن
مُنعم کی قبا میں ہے مرے جسم کا پیوند

شاہد ہیں منگورہ کی چٹانیں کہ ہے بڑھ کر
خُونِ رگِ انساں سے زمرّد کا گلوبند

یہ مہتر و نوآب و خوانین و موالی
ہر جا پہ قدامت کے صنم اب بھی وہی ہیں

ہے رزقِ زمیں آج بھی دہقاں کا پسینہ
اندازِ قدح خواریٔ جمؔ اب بھی وہی ہیں

اک تُو ہی نہ تھا جس پہ لگی کفر کی تہمت
ہم جیسے شہیدانِ ستم اَب بھی وہی ہیں

اب بھی ہیں وہی اہلِ ہوس صاحبِ محفل
ہم دل زدگانِ شبِ غم اب بھی وہی ہیں

یہ فتویٰ فروش و تہی آغوش و عبا پوش
پیران و فقیہانِ حرم اب بھی وہی ہیں

جو حرفِ جنوں تو نے سکھایا وہ کہوں گا
اے حق کی علامت، مجھے توفیقِ نوا دے

دے بازوئے فرہاد کو وہ تابِ جسارت
جو طرّۂ دستارِ رقیباں کو جھکا دے

اب قافلۂ شوق نئی دھن سے رواں ہے
اب پیشِ نظر ہے نئی منزل نئے جادے

اب کجکلہی سر بگریباں نظر آئے
اب چاک ہوں ذرّوں سے ستاروں کے لبادے

ہر عہد کا نخچیر رہا ہے لبِ گویا
یہ عہد بھی منصور کو سُولی پر چڑھا دے

پس انداز موسم

پس انداز موسم

احمد فراز

ماورا پبلشرز۔ ۳ بہاولپور روڈ۔ لاہور

۱۰۳۱

باذوق لوگوں کے لیے
ھماری کتابیں
خوبصورت کتابیں
تزئین واہتمام اشاعت

خالد شریف

ضابطہ

ناشر : خالد شریف
خوشنویس : عبدالمتین
مطبع : امپریس لاہور
بار اوّل : ۱۹۹۰ء

ترتیب

۱۰۳۷

۱۰۳۸

قربِ جاناں کا نہ میخانے کا موسم آیا
پھر سے بے صرفہ اُجڑ جانے کا موسم آیا

کنجِ غربت میں کبھی گوشۂ زنداں میں تھے ہم
جانِ جاں جب بھی ترے آنے کا موسم آیا

اب لہو رونے کی خواہش نہ لہو ہونے کی
دلِ زندہ ترے مر جانے کا موسم آیا

کوچۂ یار سے ہر فصل میں گزرے ہیں مگر
شاید اب جاں سے گزر جانے کا موسم آیا

کوئی زنجیر، کوئی حرفِ خرد لے آیا
فصلِ گُل آئی کہ دیوانے کا موسم آیا

سیلِ خوں شہر کی گلیوں میں در آیا ہے فرازؔ
اور تُو خوش ہے کہ گھر جانے کا موسم آیا

○

میں تو مقتل میں بھی قسمت کا سکندر نکلا
قرعۂ فال مرے نام کا اکثر نکلا

تھا جنہیں زعم وہ دریا بھی مجھی میں ڈوبے
میں کہ صحرا نظر آتا تھا سمندر نکلا

میں نے اس جانِ بہاراں کو بہت یاد کیا
جب کوئی پھول مری شاخِ ہُنر پر نکلا

شہر والوں کی محبّت کا میں قائل ہوں مگر
میں نے جس ہاتھ کو چوما وہی خنجر نکلا

تو یہیں ہار گیا ہے مرے بزدل دشمن
مجھ سے تنہا کے مقابل ترا لشکر نکلا

میں کہ صحرائے محبّت کا مسافر تھا فرازؔ
ایک جھونکا تھا کہ خوشبو کے سفر پر نکلا

○

وہی عشق جو تھا کبھی جنوں اُسے روزگار بنا دیا
کہیں زخم بیچ کے آ گئے کہیں شعر کوئی سنا دیا

وہی ہم کہ جن کو عزیز تھی درِ آبرو کی چمک دمک
یہی ہم کہ روزِ سیاہ میں زرِ داغِ دل بھی لٹا دیا

کبھی یوں بھی تھا کہ ہزار تیر جگر میں تھے تو دکھی نہ تھے
مگر اب یہ ہے کہ کسی مہرباں کے تپاک نے بھی رُلا دیا

کبھی خود کو ٹوٹتے پھوٹتے بھی جو دیکھتے تو حزیں نہ تھے
مگر آج خود پہ نظر پڑی تو شکستِ جاں نے ہلا دیا

کوئی نامہ دلبرِ شہر کا کہ غزل گری کا بہانہ ہو
وہی حرفِ دل جسے مدتوں سے ہم اہلِ دل نے بھلا دیا

○

گیسوئے شام میں ایک ستارہ ایک خیال
دل میں لیے پھرتے ہیں تمھارا ایک خیال

بامِ فلک پر سورج چاند ستارے بھی تھے
ہم نے بیاضِ دل پہ اتارا ایک خیال

کبھی تو ان کو بھی دیکھو کہ جن لوگوں نے
عمر گنوائی اور سنوارا ایک خیال

یاد کے شہر کے شور سے کالے کوسوں دُور
دشتِ فراموشی سے پکارا ایک خیال

یوں بھی ہوا ہے دل کے مقابل دُنیا تھی
پھر بھی نہ ہارا پھر بھی نہ ہارا ایک خیال

مجھ پر ضرب پڑی تھی تو خلقت نے دیکھا
میری بجائے پارا پارا ایک خیال

ایک مسافت ایک اُداسی ایک فرازؔ
ایک تمنّا ایک شرارہ ایک خیال

رونے سے ملال گھٹ گیا ہے
بادل تھا برس کے چھٹ گیا ہے

اب دوش پہ سر نہیں تو گویا
اک بوجھ سا دل سے ہٹ گیا ہے

یہ خلوتِ جاں میں کون آیا
ہر چیز اُلٹ پلٹ گیا ہے

کیا مالِ غنیم تھا میرا شہر
کیوں لشکریوں میں بٹ گیا ہے

اب دل میں فراز کون آئے
دنیا سے یہ شہر کٹ گیا ہے

گئے دنوں میں محبّت مزاج اُس کا تھا
مگر کچھ اور ہی انداز آج اُس کا تھا

وہ شہریار جب اقلیمِ حرف میں آیا
تو میرا دست نگر تخت و تاج اس کا تھا

میں کیا بتاؤں کہ کیوں اس نے بیوفائی کی
مگر یہی کہ کچھ ایسا مزاج اُس کا تھا

ہمیں بھی دُکھ ہے دلِ زندہ دل کے مرنے کا
کسی کے پاس مگر کب علاج اس کا تھا

لہولہان تھا ہیں اور عدل کی میزان
جھکی تھی جانبِ قاتل کہ راج اس کا تھا

تجھے گلہ ہے کہ دنیا نے پھیر لی آنکھیں
فرازؔ یہ تو سدا سے رواج اس کا تھا

بن باس کی ایک شام ...

یہ آخری ساعت شام کی ہے
یہ شام جو ہے مہجوری کی
یہ شام اپنوں سے دُوری کی

اس شام افق کے ہونٹوں پر
جو لالی ہے زہریلی ہے
اس شام نے میری آنکھوں سے
صہبائے طرب سب پی لی ہے
یہ شام غضب تنہائی کی
پت جھڑ کی ہوا برفیلی ہے
اس شام کی رنگت پیلی ہے

اس شام فقط آواز تری
کچھ ایسے سنائی دیتی ہے
آواز دکھائی دیتی ہے

یہ آخری ساعت شام کی ہے
یہ شام بھی تیرے نام کی ہے

○

وہ شکل وہ لالے کی سی کیاری نہیں بھُولے
اگبُورؔ میں جو شام گزاری نہیں بھُولے

صوُرت تھی کہ ہم جیسے صنم ساز بھی گُم تھے
مورت تھی کہ ہم جیسے پجاری نہیں بھُولے

اب اس کا تغافل بھی گوارا کہ ابھی تک
ہم ترکِ ملاقات کی خواری نہیں بھُولے

یاروں کی خطاؤں پہ نظر ہم نے نہ رکھّی
اور یار کوئی بھول ہماری نہیں بھُولے

خلعت کے لیے حرف کا سودا نہیں کرتے
کچھ لوگ ابھی وضع ہماری نہیں بھُولے

دانے کی ہوس لا نہ سکی دام میں مجھ کو
یہ میری خطا میرے شکاری نہیں بھُولے

ہم اپنے تئیں لاکھ زِ خود رفتہ ہوں لیکن
یوں ہے کہ کوئی بات تمھاری نہیں بھُولے

اک لُعبتِ ہندی نے فرازؔ اب کے لکھا ہے
رادھا کو کبھی کرشن مراری نہیں بھُولے

مرثیہ

وہ زخم انتظار کی لذّت بھی لے گیا
اب نامہ بر کی راہ نہ دیکھا کریں گے ہم

وہ کس طرح ملا تھا جدا کیسے ہو گیا
سوچا تھا یہ سوال نہ سوچا کریں گے ہم

اے زندگی جب اس سے وفا کر سکی نہ تو
پھر تو بتا کہ تجھ سے وفا کیا کریں گے ہم

○

جہاں کے شور سے گھبرا گئے کیا
مسافر گھر کو واپس آ گئے کیا

نہ تھی اتنی کڑی تازہ مسافت
پرانے ہمسفر یاد آ گئے کیا

یہاں کچھ آشنا سی بستیاں تھیں
جزیروں کو سمندر کھا گئے کیا

مری گردن میں باہیں ڈال دی ہیں
تم اپنے آپ سے اکتا گئے کیا

نہیں آیا مرا جانِ بہاراں
درختوں پر شگوفے آ گئے کیا

جہاں میلہ لگا ہے قاتلوں کا
فرازؔ اس شہر میں تنہا گئے کیا

○

جب ملاقات بے اِرادہ تھی
اس میں آسودگی زیادہ تھی

نہ توقع نہ انتظار نہ رنج
صبحِ ہجراں نہ شامِ وعدہ تھی

نہ تکلّف نہ احتیاط نہ زعم
دوستی کی زبان سادہ تھی

جب بھی چاہا کہ گنگناؤں اسے
شاعری پیش پا فتادہ تھی

لعل سے لب چراغ سی آنکھیں
ناک ستواں جبیں کشادہ تھی

حدّتِ جاں سے رنگ تانبا سا
ساغر افروزِ موجِ بادہ تھی

زُلف کو ہمسری کا دعویٰ تھا
پھر بھی خوش قامتی زیادہ تھی

کچھ تو پیکر میں تھی بلا کی تلاش
کچھ وہ کافر تنک لبادہ تھی

اپسرا تھی نہ حور تھی نہ پری
دلبری میں مگر زیادہ تھی

جتنی بے مہر مہرباں اتنی
جتنی دشوار اتنی سادہ تھی

اک زمانہ جسے کہے قاتل
میرے شانے پہ سر نہادہ تھی

یہ غزل دین اس غزال کی ہے
جس میں ہم سے وفا زیادہ تھی

وہ بھی کیا دن تھے جب فرازؔ اس سے
عشق کم عاشقی زیادہ تھی

⊙

یہ دل جو تجھ کو بظاہر بُھلا چکا بھی ہے
کبھی کبھی ترے بارے میں سوچتا بھی ہے

گزر سکے تو گزر جا شبِ فراق کہ ہم
تھکے ہوئے بھی ہیں برسوں کا رتجگا بھی ہے

دلا ملال نہ رکھ اس سے تو کہ وہ ظالم
ندیم سارے جہاں کا سہی ترا بھی ہے

وہی ہوائیں جو کل لے گئی تھیں میری گلیم
انہی کی زد پہ ترا طرّہ و قبا بھی ہے

غنیم کو مگر اس کا نہیں ہے اندازہ
جو بے سپر تنِ تنہا ہے قافلہ بھی ہے

فرازؔ شہرِ غزل میں قدم سلوک سے رکھ
"اسی دیار میں میرِ شکستہ پا بھی ہے"

"نائیجیریا"

○

شگفتِ گل کی صدا میں رنگِ چمن میں آؤ
کوئی بھی رُت ہو بہار کے پیرہن میں آؤ

کوئی سفر ہو تمہیں کو منزل سمجھ کے جاؤں
کوئی مسافت ہو تم مری ہی لگن میں آؤ

کبھی تو ایسا بھی ہو کہ لوگوں کی بات سن کر
میری طرف تم رقابتوں کی جلن میں آؤ

وہ جس غرور اور ناز سے تم چلے گئے تھے
کبھی اسی تمکنت اسی بانکپن میں آؤ

یہ کیوں ہمیشہ مری طلب ہی تمھیں صدا دے
کبھی تو خود بھی سپردگی کی تھکن میں آؤ

ہزار مفلس سہی مگر ہم سخی بلا کے
کبھی تو تم اہلِ درد کی انجمن میں آؤ

ہم اہلِ دل ہیں ہماری اقلیم حرف کی ہے
کبھی تو جانِ سخن، دیارِ سخن میں آؤ

کبھی کبھی دوریوں سے کوئی پکارتا ہے
فراز جانی فراز پیارے وطن میں آؤ

(لندن)

○

اس در پہ ٹھکانہ کبھی اس راہ میں ڈیرا
ہم خانہ بدوشوں کا یہی شام سویرا

بے مہرئ دنیا کا گلہ ہے ترے لب پر
اب کیسے بتاؤں تجھے میں بھی نہیں تیرا

دو چار قدم ہے یہ کرن ہمسفری کی
پھر آگے وہی شہرِ جدائی کا اندھیرا

ہیں بھی جو تنک خو تو زمانے کے لیے ہیں
اے جاں کبھی ہم نے ترا فرماں نہیں پھیرا

اک مشتِ غبار اور کفِ موجِ ہوا پر
چاہا تو سمیٹا ہے نہ چاہا تو بکھیرا

مل جائے جو غربت میں فرازؔ اب وہی ہمدم
ہو جائے جہاں شام وہیں رین بسیرا

(نیویارک)

○

تھکا گیا ہے مسلسل سفر اُداسی کا
اور اب بھی ہے مرے شانے پہ سر اداسی کا

وہ کون کیمیا گر تھا کہ جو بکھیر گیا
ترے گلاب سے چہرے پہ زر اُداسی کا

مرے وجود کے خلوت کدے میں کوئی تو تھا
جو رکھ گیا ہے دیا طاق پر اُداسی کا

میں تجھ سے کیسے کہوں یارِ مہرباں میرے
کہ تو علاج نہیں میری ہر اُداسی کا

یہ اب جو آگ کا دریا مرے وجود میں ہے
یہی تو پہلے پہل تھا شرر اُداسی کا

نہ جانے آج کہاں کھو گیا ستارۂ شام
وہ میرا دوست مرا ہمسفر اُداسی کا

فرازؔ دیدہ پُر آب میں نہ ڈھونڈ اُسے
کہ دل کی تہ میں کہیں ہے گُہر اُداسی کا

جان سے عشق اور جہاں سے گریز
دوستوں نے کیا کہاں سے گریز

ابتدا کی ترے قصیدے سے
اب یہ مشکل کروں کہاں سے گریز

میں وہاں ہوں جہاں جہاں تم ہو
تم کروگے کہاں کہاں سے گریز

کر گیا میرے تیرے قصّے میں
داستاں گو یہاں وہاں سے گریز

جنگ ہاری نہ تھی ابھی کہ فراز
کر گئے دوست درمیاں سے گریز

○

غیرتِ عشق سلامت تھی انا زندہ تھی
وہ بھی دن تھے کہ رہ و رسمِ وفا زندہ تھی

قیس کو دوش نہ دو رکھیو نہ فرہاد کو نام
انھیں لوگوں سے محبّت کی ادا زندہ تھی

شہرِ بیمار کے ہر کوچہ و بام و در پر
ہم بھی مرتے تھے کہ جب خلقِ خدا زندہ تھی

بُجھ گئیں شمعیں تو دم توڑ گئے جھونکے بھی
جس طرح زہرِ رقابت سے ہوا زندہ تھی

یادِ ایّام کہ صحرائے محبّت میں فراز
جرسِ قافلۂ دل کی صدا زندہ تھی

○

وہ دشمنِ جاں، جان سے پیارا بھی کبھی تھا
اب کس سے کہیں کوئی ہمارا بھی کبھی تھا

اترا ہے رگ و پے میں تو دل کٹ سا گیا ہے
یہ زہرِ جدائی کہ گوارا بھی کبھی تھا

ہر دوست جہاں ابرِ گریزاں کی طرح ہے
یہ شہر کبھی شہر ہمارا بھی کبھی تھا

تتلی کے تعاقب میں کوئی پھول سا بچہ
ایسا ہی کوئی خواب ہمارا بھی کبھی تھا

اب اگلے زمانے کے ملیں لوگ تو پوچھیں
جو حال ہمارا ہے، تمھارا بھی کبھی تھا

ہر بزم میں ہم نے اسے افسردہ ہی دیکھا
کہتے ہیں فراز انجمن آرا بھی کبھی تھا

○

یہ جان کر بھی کہ دونوں کے راستے تھے الگ
عجیب حال تھا جب اس سے ہو رہے تھے الگ

یہ حرف و لفظ ہیں دنیا سے گفتگو کے لیے
کسی سے ہم سخنی کے مکالمے تھے الگ

خیال ان کا بھی آیا کبھی تمھیں جاناں
جو تم سے دُور بہت دُور جی رہے تھے الگ

ہمیں نہیں ہیں ہماری طرح کے اور بھی لوگ
عذاب میں تھے جو اوروں سے سوچتے تھے الگ

اکیلے پن کی اذیّت کا اب گلہ کیسا
فراز خود ہی تو اپنوں سے ہو گئے تھے الگ

ہم بھی شاعر تھے کبھی جانِ سخن یاد نہیں
تجھ کو بھولے ہیں تو دلدارئ فن یاد نہیں

دل سے کل محوِ تکلّم تھے تو معلوم ہوا
کوئی کاکل کوئی لب کوئی دہن یاد نہیں

عقل کے شہر میں آیا ہے تو یوں گم ہے جنوں
لبِ گویا کو بھی بے ساختہ پن یاد نہیں

اوّل اوّل تو نہ تھے واقفِ آدابِ قفس
اور اب رسم و رہِ اہلِ چمن یاد نہیں

ہر کوئی ناوک و ترکش کی دکاں پوچھتا ہے
کسی گاہک کو مگر اپنا بدن یاد نہیں

وقت کس دشتِ فراموشی میں لے آیا ہے
اب ترا نام بھی حاکم بدہن یاد نہیں

یہ بھی کیا کم ہے غریب الوطنی میں کہ فرازؔ
ہم کو بے مہرئ اربابِ وطن یاد نہیں

○

وحشت تھی مگر چاک لبادہ بھی نہیں تھا
یوں زخم نمائی کا ارادہ بھی نہیں تھا

خلعت کے لیے قسمتِ جاں یوں بھی بہت تھی
پھر اتنا دلآویز لبادہ بھی نہیں تھا

ہم مرحبا کہتے ترے ہر تیرِ ستم پر
سچ بات کہ دل اتنا کشادہ بھی نہیں تھا

ہم خون میں نہلائے گئے تیری گلی میں
اور تو کہ سرِ بام ستادہ بھی نہیں تھا

یارو کوئی تدبیر کرو تم کہ وہ ہم سے
ناخوش تھا مگر اتنا زیادہ بھی نہیں تھا

آخر کو تو گُل ہو گئے سُورج سے مسافر
اور ہیں تو چراغِ سرِ جادہ بھی نہیں تھا

پاگل ہو فراز آج جو رہ دیکھ رہے ہو
جب اس سے ملاقات کا وعدہ بھی نہیں تھا

ردائے زخم ہر گل پیرہن پہنے ہوئے ہے
جسے دیکھو وہی چپ کا کفن پہنے ہوئے ہے

وہی سچ بولنے والا ہمارا دوست دیکھو
گلے میں طوق پاؤں میں رسن پہنے ہوئے ہے

اندھیری اور اکیلی رات اور دل اور یادیں
یہ جنگل جگنوؤں کا پیرہن پہنے ہوئے ہے

رہا ہو بھی چکے سب ہم قفس کب کے مگر دل
یہ وحشی اب بھی زنجیرِ کہن پہنے ہوئے ہے

سُنا ہے ایک ایسا طائفہ ہے اہلِ دل کا
جو دیوانہ نہیں دیوانہ پن پہنے ہوئے ہے

فراز اس شہر میں کس کو دکھاؤں زخم اپنے
یہاں تو ہر کوئی مجھ سا بدن پہنے ہوئے ہے

○

قربت نہیں تو شدّتِ ہجراں ضرور ہو
جاناں سے کوئی سلسلۂ جاں ضرور ہو

ہم ایسے وحشیوں کی تواضع کے واسطے
ہر گھر میں اک ذرا سا بیاباں ضرور ہو

نو واردانِ مدرسۂ عشق کے لیے
درسِ وفا کا قاعدہ آساں ضرور ہو

تو ملتفت اگر ہے تو ہر درد کی دوا
یہ کیا ضرور ہے کہ مری جاں ضرور ہو

۵۶

جیسا بھی تیرا حال ہے اے دل ترے لیے
لازم نہیں کہ وہ بھی پریشاں ضرور ہو

آؤ جب اس کی بزم میں سازِ سخن لیے
مضرابِ غم کی زد پہ رگِ جاں ضرور ہو

قربت بہت عزیز ہے اس کی مگر فراز
جی چاہتا ہے صحبتِ یاراں ضرور ہو

جس طرح کوئی کہے . . . .

اور تیرے شہر سے جب رختِ سفر باندھ لیا
در و دیوار پہ حسرت کی نظر کیا کرتے
چاند کجلائی ہوئی شام کی دہلیز پہ تھا
اس گھڑی بھی تیرے مجبورِ سفر کیا کرتے
دل ٹھہر جانے کو کہتا تھا مگر کیا کرتے

ہم نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
جس طرح یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو
کچھ اسی طرح کی کیفیتِ جاں آج بھی ہے
جس طرح کوئی قیامت ہو گزر جانے کو
جس طرح کوئی کہے پھر سے پلٹ آنے کو

(واشنگٹن)

شہر نامہ

(اجڑی کیمپ کے حوالے سے)

وہ عجیب صبحِ بہار تھی
کہ سحر سے نوحہ گری رہی
مری بستیاں تھیں دھواں دھواں
مرے گھر میں آگ بھری رہی

مرے راستے تھے لہو لہو
مرا قریہ قریہ فگار تھا
یہ کفِ ہوا یہ زمین تھی
وہ فلک کہ مشتِ غبار تھا

کئی آبشار سے جسم تھے
کہ جو قطرہ قطرہ پگھل گئے
کئی خوش جمال طلسم تھے
جنھیں گردِ باد نگل گئے

کوئی خواب نوکِ سناں پہ تھا
کوئی آرزو تہِ سنگ تھی
کوئی پھول آبلہ آبلہ
کوئی شاخ مرقدِ رنگ تھی

کئی لاپتہ میری لعبتیں
جو کسی طرف کی نہ ہو سکیں
جو نہ آنے والوں کے ساتھ تھیں
جو نہ جانے والوں کو رو سکیں

کہیں تارِ ساز سے کٹ گئیں
کسی مطرِبہ کی رگِ گلو
مئے آتشیں میں وہ زہر تھا
کہ تڑخ گئے قدح و سبو

کوئی نے نواز تھا دم بخود
کہ نفس سے حدّتِ جاں گئی
کوئی سر بہ زانو تھا باربد
کہ صدائے دوست کہاں گئی

کہیں نغمگی میں وہ بین تھے
کہ سماعتوں نے سُنے نہیں
کہیں گونجتے تھے وہ مرثیے
کہ انیس نے بھی کہے نہیں

یہ جو سنگ ریزوں کے ڈھیر ہیں
یہاں موتیوں کی دکان تھی
یہ جو سائبان دھوئیں کے ہیں
یہاں بادلوں کی اڑان تھی

جہاں روشنی ہے کھنڈر کھنڈر
یہاں قمقموں سے جوان تھے
جہاں چیونٹیاں ہوئیں خیمہ زن
یہاں جگنوؤں کے مکان تھے

کہیں آبگینہ خیال کا
کہ جو کربِ ضبط سے چور تھا
کہیں آئینہ کسی یاد کا
کہ جو عکسِ یار سے دور تھا

مرے بسملوں کی قناعتیں
جو بڑھائیں ظلم کے حوصلے
مرے آہوؤں کا چکیدہ خوں
جو شکاریوں کو سراغ دے

مری عدل گاہوں کی مصلحت
مرے قاتلوں کی وکیل ہے
مرے خانقاہوں کی منزلت
مری بزدلی کی دلیل ہے

مرے اہلِ حرف و سخن سرا
جو گداگروں میں بدل گئے
مرے ہمصفیر تھے حیلہ جُو
کسی اور سمت نکل گئے

کئی فاختاؤں کی چال ہیں
مجھے کرگسوں کا چلن لگا
کئی چاند بھی تھے سیاہ رو
کئی سورجوں کو گہن لگا

کوئی تاجرِ حسب و نسب
کوئی دیں فروشِ قدیم ہے
یہاں کفش بر بھی امام ہیں
یہاں نعت خواں بھی کلیم ہے

کوئی فکر مند کلاہ کا
کوئی دعویٰ دار قبا کا ہے
وہی اہلِ دل بھی ہیں زیب تن
جو لباس اہلِ ریا کا ہے

میرے پاسباں میرے نقب زن
مرا مُلک مِلکِ یتیم ہے
مرا دیس امیرِ سپاہ کا
مرا شہر مالِ غنیم ہے

جو روش ہے صاحبِ تخت کی
سو مصاحبوں کا طریق ہے
یہاں کوتوال بھی دُزدِ شب
یہاں شیخِ دیں بھی ہے

یہاں سب کے نرخ جدا جدا
اسے مول لو اسے تول دو
جو طلب کرے کوئی خوں بہا
تو دہن خزانے کا کھول دو

وہ جو سر کشی کا ہو مرتکب
اسے قمچیوں سے زبوں کرو
جہاں خلقِ شہر ہو مشتعل
اسے گولیوں سے نگوں کرو

مگر ایسے ایسے غنی بھی تھے
اسی قحط زارِ دمشق میں
جنھیں کوئے یار عزیز تھا
جو کھڑے تھے مقتلِ عشق میں

کوئی بانکپن میں تھا کوہکن
تو جنوں میں قیس سا تھا کوئی
جو صراحیاں لیے جسم کی
مئے نابِ خوں سے بھری ہوئی

تجھے صلا بلب کہ پیو پیو
یہ سبیلِ اہلِ صفا کی ہے
بہ نشید نوشِ بدن کرو
یہ کشید تاکِ وفا کی ہے

کوئی تشنہ لب ہی نہ تھا یہاں
جو پکارتا کہ ادھر ادھر
سبھی مفت بر نئے تماش بیں
کوئی بزم میں کوئی بام پر

سبھی بے حسی کے خمار میں
سبھی اپنے حال میں مست تھے
سبھی رہروانِ رہِ عدم
مگر اپنے زعم میں ہست تھے

سو لہو کے جام انڈیل کر
مرے جانفروش چلے گئے
وہ سکوت تھا سرِ میکدہ
کہ وہ خم بدوش چلے گئے

کوئی مجلسوں میں رسن بہ پا
کوئی مقتلوں میں دریدہ تن
نہ کسی کے ہاتھ میں شاخِ نَے
نہ کسی کے لب پہ گلِ سخن

اسی عرصۂ شبِ تار میں
یونہی ایک عمر گزر گئی
کبھی روزِ وصل بھی دیکھتے
یہ جو آرزو تھی وہ مر گئی

یہاں روزِ حشر بپا ہوئے
پہ کوئی بھی روزِ جزا نہیں
یہاں زندگی بھی عذاب ہے
یہاں موت میں بھی شفا نہیں

———

کر گئے کوچ کہاں

اتنی مدّت دلِ آوارہ کہاں تھا کہ تجھے
اپنے ہی گھر کے در و بام بُھلا بیٹھے ہیں
یاد یاروں نے تو کب حرفِ محبّت رکھا
غیر بھی طعنۂ و دشنام بھلا بیٹھے ہیں

تو سمجھتا تھا کہ یہ در بدری کا عالم
دور دیسوں کی عنایت تھا سو اب ختم ہوا
تو نے جانا تھا کہ آشفتہ سری کا موسم
دشتِ غربت کی ودیعت تھا سو اب ختم ہوا

اب جو تو شہرِ نگاراں میں قدم رکھے گا
ہر طرف کھلتے چلے جائیں گے چہروں کے گلاب
دوست احباب ترے نام کے ٹکرائیں گے جام
غیر اغیار چکائیں گے رقابت کے حساب

جب بھی گائے گی کوئی غیرتِ ناہید غزل
سب کو آئے گا نظر شعلۂ آواز میں تو
جب بھی ساقی نے صراحی کو دیا اِذنِ خرام
بزم کی بزم پکارے گی کہ آغاز میں تو

مائیں رکھیں گی تیرے نام پہ اولاد کا نام
باپ بیٹوں کے لیے تیری بیاضیں لیں گے
جن پہ قدغن ہے وہ اشعار پڑھے گی خلقت
اور ٹوٹے ہوئے دل تجھ کو سلامی دیں گے

لوگ الفت کے کھلونے لیے بچوں کی طرح
کل کے روٹھے ہوئے یاروں کو منالائیں گے
لفظ کو بیچنے والے نئے بازاروں میں
غیرتِ حرف کو لاتے ہوئے شرمائیں گے

لیکن ایسا نہیں ایسا نہیں اے دل اے دل
یہ تیرا دیس یہ تیرے در و دیوار نہیں
اتنے یوسف تو نہ تھے مصر کے بازار میں بھی
جنس اس درجہ ہے وافر کہ خریدار نہیں

سر کسی کا بھی دکھائی نہیں دیتا ہے یہاں
جسم ہی جسم ہیں دستاریں ہی دستاریں ہیں
تو کسی قریۂ زنداں میں ہے شاید کہ جہاں
طوق ہی طوق ہیں دیواریں ہی دیواریں ہیں

اب نہ طفلاں کو خبر ہے کسی دیوانے کی
اور نہ آوازکہ اور چاک گریباں والے
نہ کسی ہاتھ میں پتّھر نہ کسی ہاتھ میں پھول
کر گئے کوچ کہاں کوچۂ جاناں والے

ابھی ہم خوبصورت ہیں

(احمد شمیم کی یاد میں)

ہمارے جسم اوراق خزانی ہو گئے ہیں
اور ردائے زخم سے آراستہ ہیں
پھر بھی دیکھو
ہماری خوشنمائی پر کوئی حرف
اور کشیدہ قامتی میں خم نہیں آیا
ہمارے ہونٹ زہریلی رُتوں سے کاسنی ہیں
اور چہرے رتجگوں کی شعلگی سے
آبنوسی ہو چکے ہیں
اور زخمی خواب

نادیدہ جزیروں کی زمیں پر
اس طرح بکھرے پڑے ہیں
جس طرح طوفاں زدہ کشتی کے ٹکڑوں کو
سمندر ساحلوں پر پھینک دیتا ہے

لہو کی بارشیں
یا خودکشی کی خواہشیں تھیں
اس اذیّت کے سفر میں
کون سا موسم نہیں آیا
مگر آنکھوں میں نم
لہجے میں سم
ہونٹوں پہ کوئی نغمۂ ماتم نہیں آیا
ابھی تک دل ہمارے
خندۂ طفلاں کی صورت بے کدورت ہیں

ابھی ہم خوبصورت ہیں

زمانے ہو گئے

ہم کوئے جاناں چھوڑ آئے تھے

مگر اب بھی

بہت سے آشنا نا آشنا ہمدم

اور ان کی یاد کے مانوس قاصد

اور ان کی چاہتوں کے ہجر نامے

دور دیسوں سے ہماری اور آتے ہیں

گلابی موسموں کی دھوپ

جب نو رُستہ سبزے پر قدم رکھتی ہوئی

معمورۂ تن میں در آتی ہے

تو برفانی بدن میں

جوئے خوں آہستگی سے گنگناتی ہے

اُداسی کا پرندہ

چُپ کے جنگل میں

سرِ شاخِ نہالِ غم چہکتا ہے

کوئی بھولا ہوا بسرا ہوا دُکھ

آبلہ بن کر ٹپکتا ہے

تو یوں لگتا ہے

جیسے حرف اپنے

زندہ آوازوں کی صورت ہیں

ابھی ہم خوبصورت ہیں

ہماری خوشنمائی

حرفِ حق کی رونمائی ہے

اسی خاطر تو ہم آشفتہ جاں

عشاق کی یادوں میں رہتے ہیں

کہ جو ان پر گزرتی ہے وہ کہتے ہیں

ہماری حرف سازی

اب بھی محبوبِ جہاں ہے

شاعری شوریدگانِ عشق کے وردِ زباں ہے

گلابوں کی طرح شاداب چہرے

لعل و مرجان کی طرح لب

صندلیں ہاتھوں سے

چاہت اور عقیدت کی بیاضوں پر

ہمارے نام لکھتے ہیں

سبھی درد آشنا

ایثار مشرب

ہم نفس اہلِ قفس

جب مقتلوں کی سمت جاتے ہیں

ہمارے بیت گاتے ہیں

ابھی تک ناز کرتے ہیں

سب اہلِ قافلہ

اپنے ہدی خوانوں پر آشفتہ کلاموں پر

ابھی ہم دستخط کرتے ہیں اپنے قتل ناموں پر

ابھی ہم آسمانوں کی امانت

اور زمینوں کی ضرورت ہیں

ابھی ہم خوبصورت ہیں

وہ لمحے کتنے دروغ گو تھے

تمھاری پوروں کا لمس اب تک
مری کفِ دست پر ہے
اور میں یہ سوچتا ہوں
وہ لمحے کتنے دروغ گو تھے
وہ کہہ گئے تھے
کہ اب کے جو ہاتھ تیرے ہاتھوں کو چھو گئے ہیں
تمام ہونٹوں کے سارے لفظوں سے معتبر ہیں
وہ کہہ گئے تھے
تمھاری پوریں

جو میرے ہاتھوں کو چھو رہی تھیں
وہی تو قسمت تراش ہیں
اور اپنی قسمت کو
سارے لوگوں کی قسمتوں سے بلند جانو
ہماری مانو
تو اب کسی اور ہاتھ کو ہاتھ مت لگانا
میں اس سمے سے
تمام ہاتھوں
وہ ہاتھ بھی
جن میں پھول
شاخوں سے بڑھ کے لطفِ نمو اٹھائیں
وہ ہاتھ بھی جو سدا کے محروم تھے
اور ان کی ہتھیلیاں زخم زخم تھیں

اور وہ ہاتھ بھی جو چراغ جیسے تھے
اور رستے میں سنگ فرسنگ کی طرح جا بجا گڑے تھے
وہ ہاتھ بھی
جن کے ناخنوں کے نشان
معصوم گردنوں پر مثالِ طوقِ ستم پڑے تھے
تمام نامہربان اور مہربان ہاتھوں سے
دست کش یوں رہا ہوں جیسے
یہ مٹھیاں میں نے کھول دیں تو
وہ ساری سچائیوں کے موتی
مسرّتوں کے تمام جگنو
جو بے یقینی کے جنگلوں میں
یقین کا راستہ بناتے ہیں

روشنی کی لکیر کا قافلہ بناتے ہیں
میرے ہاتھوں سے روٹھ جائیں گے

پھر نہ تازہ ہوا چلے گی
نہ کوئی شمعِ صدا جلے گی

میں ضبط اور انتظار کے اس حصار میں مدّتوں رہا ہوں
مگر جب اک شام
اور وہ پت جھڑ کی آخری شام تھی
ہوا اپنا آخری گیت گا رہی تھی
مرے بدن میں میرا لہو خشک ہو رہا تھا
تو مٹھیاں میں نے کھول دیں
اور میں نے دیکھا
کہ میرے ہاتھوں میں

کوئی جگنو

نہ کوئی موتی

ہتھیلیوں پر فقط مری نامراد آنکھیں دھری ہوئی تھیں

اور ان میں
قسمت کی سب لکیریں مری ہوئی تھیں

اے میرے وطن کے خوشنواؤ

(واشنگٹن میں پاکستانی شعراء کی آمد کے موقع پر لکھی گئی)

اک عمر کے بعد تم ملے ہو
اے میرے وطن کے خوشنواؤ
ہر ہجر کا دن تھا حشر کا دن
دوزخ تھے فراق کے الاؤ
روؤں کہ ہنسوں سمجھ نہ آئے
ہاتھوں میں ہیں پھول دل میں گھاؤ

تم آئے تو ساتھ ہی تمہارے
بچھڑے ہوئے یار یاد آئے
اک زخم پہ تم نے ہاتھ رکھا
اور مجھ کو ہزار یاد آئے
وہ سارے رفیق پابجولاں
سب کشتۂ دار یاد آئے

ہم سب کا ہے ایک ہی قبیلہ
اک دشت کے سارے ہمسفر ہیں
کچھ وہ ہیں جو دوسروں کی خاطر
آشفتہ نصیب و دربدر ہیں
کچھ وہ ہیں جو خلعت و قبا سے
ایوانِ شہی میں معتبر ہیں

سقراط و مسیح کے فسانے
تم بھی تو بہت سنا رہے تھے
منصور و حسین سے عقیدت
تم بھی تو بہت جتا رہے تھے
کہتے تھے صداقتیں امر ہیں
اوروں کو یہی بتا رہے تھے

اور اب جو ہیں جا بجا صلیبیں
تم بانسریاں بجا رہے ہو
اور اب جو ہے کربلا کا نقشہ
تم مدحِ یزید گا رہے ہو
جب سچ تہِ تیغ ہو رہا ہے
تم سچ سے نظر چرا رہے ہو

جی چاہتا ہے کہ تم سے پوچھوں
کیا راز اس اجتناب میں ہے
تم اتنے کٹھور تو نہیں تھے
یہ بے حسی کس حساب میں ہے
تم چپ ہو تو کس طرح سے چپ ہو
جب خلقِ خدا عذاب میں ہے

سوچو تو تمہیں ملا بھی کیا ہے
اِک لقمۂ تر قلم کی قیمت
غیرت کو فروخت کرنے والو
اک کاسۂ زر قلم کی قیمت
پندار کے تاجرو بتاؤ
دربان کا در قلم کی قیمت

ناداں تو نہیں ہو تم کہ سمجھوں
غفلت سے یہ زہر گھولتے ہو
تھامے ہوئے مصلحت کی میزان
ہر شعر کا وزن تولتے ہو
ایسے میں سکوتِ چشم پوشی
ایسا ہے کہ جھوٹ بولتے ہو

اک عمر سے عدل و صدق کی لاش
غاصب کی صلیب پر جڑی ہے
اس وقت بھی تم غزل سرا ہو
جب ظلم کی ہر گھڑی کڑی ہے
جنگل پہ لپک رہے ہیں شعلے
طاؤس کو رقص کی پڑی ہے

ہے سب کو عزیز کوئے جاناں
اس راہ میں سب جئے مرے ہیں
خود میری بیاضِ شعر میں بھی
بربادیٔ دل کے مرثیے ہیں
میں نے بھی کیا ہے ٹوٹ کر عشق
اور ایک نہیں کئی کیے ہیں

لیکن غمِ عاشقی نہیں ہے
ایسا جو سبک سری سکھائے
یہ غم تو وہ خوش مآل غم ہے
جو کوہ سے جوئے شیر لائے
تیشے کا ہنر جنوں کو بخشے
جو قیس کو کوہکن بنائے

اے حیلہ گرانِ شہرِ شیریں
آیا ہوں پہاڑ کاٹ کر میں
ہے بے وطنی گواہ میری
ہر چند پھرا ہوں در بدر میں
بیچا نہ غرورِ نے نوازی
ایسا بھی نہ تھا سبک ہُنر میں

تم بھی کبھی ہمنوا تھے میرے
پھر آج تمھیں یہ کیا ہوا ہے
مٹی کے وقار کو نہ بیچو
یہ عہدِ ستم جہاد کا ہے
دریوزہ گری کے مقبروں سے
زنداں کی فصیل خوشنما ہے

کب ایک ہی رُت رہی ہمیشہ...
یہ ظلم کی فصل بھی کٹے گی
جب حرف کہے گا قُم بہ اذنی
مرتی ہوئی خاک جی اُٹھے گی
لیلائے وطن کے پیرہن میں
بارود کی بو نہیں رہے گی

پھر باندھیں گے ابروؤں کے دوہے
پھر مدحِ رخ و دہن کہیں گے
ٹھہرائیں گے ان لبوں کو مطلع
جاناں کے لیے سخن کہیں گے
افسانۂ یار و قصّۂ دل
پھر انجمن انجمن کہیں گے

اے میرے سارے لوگو

اب مرے دوسرے بازو پہ وہ شمشیر ہے جو
اس سے پہلے بھی مرا نصف بدن کاٹ چکی
اسی بندوق کی نالی ہے مری سمت کہ جو
اس سے پہلے مری شہ رگ کا لہو چاٹ چکی

پھر وہی آگ در آئی ہے مری گلیوں میں
پھر مرے شہر میں بارود کی بو پھیلی ہے
پھر سے تو کون ہے میں کون ہوں آپس میں سوال
پھر وہی سوچ میان من و تو پھیلی ہے

مری بستی سے پرے بھی مرے دشمن ہوں گے
پر یہاں کب کوئی اغیار کا لشکر اُترا
آشنا ہاتھ ہی اکثر مری جانب لپکے
میرے سینے میں سدا اپنا ہی خنجر اُترا

پھر وہی خوف کی دیوار تذبذب کی فضا
پھر ہوئی عام وہی اہلِ ریا کی باتیں
نعرۂ حُبِّ وطن مالِ تجارت کی طرح
جنسِ ارزاں کی طرح دینِ خدا کی باتیں

اس سے پہلے بھی تو ایسی ہی گھڑی آئی تھی
صبحِ وحشت کی طرح شامِ غریباں کی طرح
اس سے پہلے بھی تو پیمانِ وفا ٹوٹے تھے
شیشۂ دل کی طرح آئینۂ جاں کی طرح

پھر کہاں احمریں ہونٹوں دعاؤں کے دیے
پھر کہاں شبنمیں چہروں پہ رفاقت کی ردا
صندلیں پاؤں سے مستانہ روی روٹھ گئی
مرمریں ہاتھوں پہ جل بجھ گیا انگارِ حنا

دلنشیں آنکھوں میں فرقت زدہ کاجل رویا
شاخِ بازو کے لیے زلف کا بادل رویا
مثلِ پیراہنِ گل پھر سے بدن چاک ہوئے
جیسے اپنوں کی کمانوں میں ہوں اغیار کے تیر
اس سے پہلے بھی ہوا چاند محبت کا دونیم
نوکِ دشنہ سے کھچی تھی مری دھرتی پہ لکیر

آج ایسا نہیں ایسا نہیں ہونے دینا
اے مرے سوختہ جانو مرے پیارے لوگو
اب کے گر زلزلے آئے تو قیامت ہوگی
میرے دلگیر مرے درد کے مارے لوگو
کسی غاصب کسی ظالم کسی قاتل کے لیے
خود کو تقسیم نہ کرنا مرے سارے لوگو

نامۂ جاناں

مدّتوں بعد ملا نامۂ جاناں لیکن
نہ کوئی دل کی حکایت نہ کوئی پیار کی بات
نہ کسی حرف میں محرومیٔ جاں کا قصّہ
نہ کسی لفظ میں بھولے ہوئے اقرار کی بات
نہ کسی سطر پہ بھیگے ہوئے کاجل کی لکیر
نہ کہیں ذکرِ جُدائی کا نہ دیدار کی بات

بس وہی ایک ہی مضموں ہے کہ مرے شہر کے لوگ
کیسے سہمے ہوئے رہتے ہیں گھروں میں اپنے
اتنی بدنام خموشی ہے کہ دیوانے بھی
کوئی سودا نہیں رکھتے ہیں سروں میں اپنے
اب قفس ہی کو نشیمن کا بدل جان لیا
اب کہاں طاقتِ پرواز پروں میں اپنے...

وہ جو دو چار سبوکش تھے کہ جن کے دم سے
گردشِ جام بھی تھی رونقِ میخانہ بھی تھی
وہ جو دو چار نواگر تھے کہ جن کے ہوتے
حُرمتِ نغمہ بھی تھی جُراَتِ رندانہ بھی تھی
کوئی مقتل کوئی زنداں کوئی پردیس گیا
چند ہی تھے کہ روش جن کی جُداگانہ بھی تھی

اب تو بس بردہ فروشی ہے جدھر بھی جاؤ
اب تو ہر کوچہ و کو مصر کا بازار لگے

سرِ دربار ستادہ ہیں بیاضیں لے کر
وہ جو کچھ دوست کبھی صاحبِ کردار لگے

غیرتِ عشق کہ کل مال تجارت میں نہ تھی
آج دیکھو کہ ہیں انبار کے انبار لگے

ایسا آسیب زدہ شہر کہ دیکھا نہ سُنا
ایسی دہشت ہے کہ بپھرے ہوئے سب کے بازو

در و دیوار خرابات وہی ہیں لیکن ....
نہ کہیں قلقلِ مینا ہے نہ گلبانگِ سبو

بے دلی شیوہ اربابِ محبّت ٹھہرا ....
اب کوئی آئے کہ جائے تننا ہو یا ہو

○

غرورِ جاں کو مرے یار بیچ دیتے ہیں
قبا کی حرص میں دستار بیچ دیتے ہیں

یہ لوگ کیا ہیں کہ دو چار خواہشوں کے لیے
تمام عُمر کا پندار بیچ دیتے ہیں

جنونِ زینت و آرائشِ مکاں کے لیے
کئی مکیں در و دیوار بیچ دیتے ہیں

ذرا بھی نرخ ہو بالا تو تاجرانِ حرم
گلیم و جبّہ و دستار بیچ دیتے ہیں

بس اتنا فرق ہے یوسف میں اور مجھ میں فرازؔ
کہ اس کو غیر مجھے یار بیچ دیتے ہیں

○

چاک پیراہنِ گل کو صبا جانتی ہے
مستیٔ شوق کہاں بندِ قبا جانتی ہے

ہم تو بدنامِ محبّت تھے سو رُسوا ٹھہرے
ناصحوں کو بھی مگر خلقِ خدا جانتی ہے

کون طاقوں پہ رہا کون سرِ راہگذر
شہر کے سارے چراغوں کو ہوا جانتی ہے

ہوس انعام سمجھتی ہے کرم کو تیرے
اور محبّت ہے کہ احساں کو سزا جانتی ہے

○

یوسف نہ تھے مگر سرِ بازار آ گئے
خوش فہمیاں یہ تھیں کہ خریدار آ گئے

ہم کج ادا چراغ کہ جب بھی ہوا چلی
طاقوں کو چھوڑ کر سرِ دیوار آ گئے

پھر اس طرح ہوا مجھے مقتل میں چھوڑ کر
سب چارہ ساز جانبِ دربار آ گئے

اب دل میں حوصلہ نہ سکت بازوؤں میں ہے
اب کے مقابلے پہ مرے یار آ گئے

آواز دے کے زندگی ہر بار چھپ گئی
ہم ایسے سادہ دل تھے کہ ہر بار آ گئے

سورج کی روشنی پہ جنھیں ناز تھا فرازؔ
وہ بھی تو زیرِ سایۂ دیوار آ گئے

اے دیس سے آنے والے بتا

وہ شہر جو ہم سے چھُوٹا ہے اب اس کا نظارا کیسا ہے
ہر دشمنِ جاں کس حال میں ہے ہر جان سے پیارا کیسا ہے

شب بزمِ حریفاں جمتی ہے یا شام ڈھلے سو جاتے ہیں
اب محفلِ یاراں کیسی ہے ہر انجمن آرا کیسا ہے

کیا کوئے نگاراں میں اب بھی عشاق کا میلہ لگتا ہے
دل والوں نے قاتل کے لیے مقتل کو سنوارا کیسا ہے

کیا اب بھی ہمارے گاؤں میں گھنگھرو بجیں ہوا کے پاؤں میں
یا آگ لگی ہے چھاؤں میں اب وقت کا دھارا کیسا ہے...

میخواروں کا پندار گیا میخانوں کا معیار گیا
کل تلخیٔ مے بھی کھلتی تھی اب زہر گوارا کیسا ہے

مہران لہو کی دھار ہُوا بولان بھی کیا گلنار ہُوا
کس رنگ کا ہے دریائے اٹک راوی کا کنارا کیسا ہے

سُنتے ہیں کہ سیلِ خوں آیا اور مثلِ شفق ہے رنگِ فلک
وہ سبز زمیں اب کیسی ہے وہ چاند ستارا کیسا ہے

ہر ایک کشیدہ قامت پر کیا اب بھی کمندیں پڑتی ہیں
جب سے وہ مسیحا دار ہوا ہر درد کا مارا کیسا ہے

کہتے ہیں کہ گھر اب زنداں ہیں کہتے ہیں زنداں مقتل ہیں
یہ جبر خدا کے نام پہ ہے یہ ظُلم خدارا کیسا ہے

کیا پچھلے پہر اب بھی آنکھیں بھر آتی ہیں، کرُلاتی ہیں
ہر لختِ جگر پر کیا گزری ہر آنکھ کا تارا کیسا ہے

یہ شامِ ستم کٹتی ہی نہیں یہ ظلمتِ شب گھٹتی ہی نہیں
میرے بدقسمت لوگوں کی قسمت کا ستارا کیسا ہے

پندار سلامت ہے کہ نہیں بس یہ دیکھو یہ مت پوچھو
جاں ریزہ ریزہ کتنی ہے دل پارا پارا کیسا ہے

مسندِ پیرِ مُغاں

اُڑا کے بادِ فنا لے گئی ہے شہر کا شہر
نہ بام و در رہے باقی نہ جسم و جاں میرے
کسے کسے میں پکاروں کسے کسے رووؤں
تڑپ رہے ہیں شناسا کہاں کہاں میرے

کسی کا کاسۂ سر ہے فضا میں سرگرداں
کوئی نگارِ دل آرا دو نیم ہو کے گرا
تڑخ گیا ہے کسی کا بدن صراحی سا
کسی کا شیشۂ جاں دستِ ناتواں سے گرا

دلوں میں برق گری سنگِ محتسب کی طرح
نہ کوئی رند نہ رطلِ گراں سلامت ہے
بساطِ میکدہ ویراں ہوئی تو غم کیسا
خوشا کہ مسندِ پیرِ مغاں سلامت ہے

○

زندگی سے یہی گِلہ ہے مجھے
تُو بڑی دیر سے مِلا ہے مجھے

تو محبّت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھے

دل دھڑکتا نہیں ٹپکتا ہے
کل جو خواہش تھی آبلہ ہے مجھے

ہمسفر چاہیے، ہجوم نہیں
اِک مسافر بھی قافلہ ہے مجھے

کوہکن ہو کہ قیس ہو کہ فرازؔ
سب میں اِک شخص ہی مِلا ہے مجھے

○

—

○

آشنا کوئی سرِ شہرِ ستمگر نہ ملا
اب کے آئے تو کسی ہاتھ میں پتھّر نہ ملا

سارے دشمن مری گلیوں کی کمیں گاہ میں تھے
کوئی لشکر بھی مجھے شہر کے باہر نہ ملا

ہم بھی پتھر تھے مگر کیسا مقدّر لائے
سب خدا ساز ملے کوئی صنم گر نہ ملا

نظم میخانہ کچھ ایسا ہی رہا ہے کہ ہمیں
کبھی ساقی کبھی مینا کبھی ساغر نہ ملا

ہمیں مجرم تھے ایسے کہ فقط تُو ہی نہیں
ہم جسے ڈھونڈنے نکلے وہی اکثر نہ مِلا

دیکھ پندار اِن آشفتہ سروں کا کہ جنھیں
بختِ منصور مِلا، تختِ سکندر نہ مِلا

اب جو تجدیدِ رفاقت ہے تو پھر ٹوٹ کے مِل
دل ہے آئینہ تو پھر ہاتھ جھجک کر نہ مِلا

لاکھ بے مہر سہی دوست تو رکھتے ہو فراز
ان کو دیکھو کہ جنھیں کوئی ستمگر نہ مِلا

○

شہر میں اب کوئی دیوانہ رہا ہو کہ نہ ہو
مرگِ انبوہ تو ہے جشن بپا ہو کہ نہ ہو

شورِ مستاں تو بہت ہے مگر اس فصل میں بھی
ہاتھ اُٹھیں یا نہ اُٹھیں چاک قبا ہو کہ نہ ہو

یادِ یاراں بہت آتی ہے مگر سوچتے ہیں...
اب وطن میں کوئی اپنا سا رہا ہو کہ نہ ہو

دل کو سوجھا تو ہے مضموں تیری خوش قامتی کا
ہم سے کوتاہ بیانوں سے ادا ہو کہ نہ ہو

شکر کر اے دلِ احسان فراموش کہ تُو . . .
درخورِ رنجشِ بے جا بھی رہا ہو کہ نہ ہو

آخری تیر شکاری کا میری گھات میں ہے
پھر مرے بعد کوئی نغمہ سرا ہو کہ نہ ہو

○

حیران ہوں خود کو دیکھ کر میں
ایسا تو نہیں تھا عُمر بھر میں

وہ زندہ دلی کہاں گئی ہے
ہنستا تھا جب اپنے حال پر میں

آدابِ جنونِ عاشقی سے
ایسا بھی نہیں تھا بے خبر میں

واسوخت کبھی نہ میں نے لکھی
رویا بھی کبھی جو ٹوٹ کر میں

اے بے وطنی گواہ رہنا
ہر چند پھرا ہوں در بدر میں

بیچا نہ غرورِ نے نوازی
ایسا بھی نہ تھا سُبک ہنر میں

صیّاد پرست جو بھی سمجھیں
زنداں کو سمجھ سکا نہ گھر میں

تھا میرا گریز بھی تصادم
تھا دامِ عدو سے باخبر میں

یہ میرا چلن نہ تھا کہ رہنا
لب دوختہ و فتادہ سر میں

شعلے کی طرح فصیلِ شب سے
نکلا ہوں حصار توڑ کر میں

سقراط نہ تھا پہ سچ کی خاطر
پیتا رہا زہر بیشتر میں

منصور و مسیح گو نہیں تھا
ہر عہد میں تھا صلیب پر میں

گوتم کی طرح رشی نہیں تھا
لیکن نکلا ہوں تج کے گھر میں

اے حیلہ گرانِ شہرِ شیریں
آیا ہوں پہاڑ کاٹ کر میں

جب شہر دوکانِ شیشہ گر تھا
سب سنگ بدست تھے مگر میں

اے شام کے آخری پرندے
میں بھی تیرے ساتھ ہوں ٹھہر میں

تو بھی ہے میری طرح اکیلا
تنہا سفروں کا ہمسفر میں

ٹوٹا ہوا تیر تیرے دل میں
اور اپنے لہو میں تربتر میں

تو میری طرح ہے بے نشیمن
اور تیری طرح ہوں بے شجر میں

———

O

بے نیازانہ ہمیشہ کی طرح ملتا ہے
اہلِ دل سے بھی وہ دُنیا کی طرح ملتا ہے

کوچۂ یار میں حیراں ہوں کہ کس کو دیکھوں
ہر کوئی نقشِ کفِ پا کی طرح ملتا ہے

ہم وہاں ہیں کہ جہاں چشم کشائی کا صلہ
آنکھ کو زخمِ تماشا کی طرح ملتا ہے

۱۱۴۷

ہر ستمگر کے محبّت بھرے لہجے پہ نہ جا
کبھی صحرا بھی تو دریا کی طرح ملتا ہے

اب ہمیں خواہشِ درماں جو نہیں ہے تو فرازؔ
جو بھی ملتا ہے مسیحا کی طرح ملتا ہے

○

ناخوش ہیں کبھی بُت کبھی ناراض حرم ہے
ہم دل زدگان کا نہ خدا ہے نہ صنم ہے

جو لکھ نہیں سکتا صفِ مژگاں پہ رقم ہے
گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

انصاف کہاں اب تو فقط فیصلہ ہوگا
ہیں پا بہ سلاسل کفِ دشمن میں قلم ہے

ترکش کا گماں ہوتا ہے بسمل کے بدن پر
تیر اتنے لگے جسم کماں کی طرح خم ہے

یہ کیسی رفاقت ہے نہ ملنا نہ بچھڑنا
یہ کیسی وفا ہے کہ نہ تریاق نہ سم ہے

کیا مرگِ محبّت کا ہوا رنج تجھے بھی
اے زود فراموش تری آنکھ بھی نم ہے

جھیلے ہیں جو دُکھ تو نے فرازؔ اپنی جگہ ہیں
پر تم پہ جو گزری ہے وہ اوروں سے تو کم ہے

قربت بھی نہیں دل سے اُتر بھی نہیں جاتا
وہ شخص کوئی فیصلہ کر بھی نہیں جاتا

آنکھیں ہیں کہ خالی نہیں رہتی ہیں لہو سے
اور زخمِ جدائی ہے کہ بھر بھی نہیں جاتا

وہ راحتِ جاں ہے مگر اس در بدری میں
ایسا ہے کہ اب دھیان اُدھر بھی نہیں جاتا

ہم دُوہری اذیّت کے گرفتار مسافر
پاؤں بھی ہیں شل شوقِ سفر بھی نہیں جاتا

دل کو تری چاہت پہ بھروسہ بھی بہت ہے
اور تجھ سے بچھڑ جانے کا ڈر بھی نہیں جاتا

پاگل ہوئے جاتے ہو فرازؔ اس سے ملے کیا
اتنی سی خوشی سے کوئی مر بھی نہیں جاتا

○

جہاں بھی جانا تو آنکھوں میں خواب بھر لانا
یہ کیا کہ دل کو ہمیشہ اُداس کر لانا

میں برف رُتوں میں چلا تو اُس نے کہا
پلٹ کے آنا تو کشتی میں دھوپ بھر لانا

بھلی لگی ہمیں خوش قامتی کسی کی مگر
نصیب میں کہاں اس سرو کا ثمر لانا

پیام کیسا مگر ہو سکے تو اے قاصد
کبھی کوئی خبرِ یارِ بے خبر لانا..

فراز اب کے جب آؤ دیارِ جاناں میں
بجائے تحفۂ دل ارمغانِ سر لانا

○

سپردگی شاخِ گل کی وحشتِ غزال کی ہو
جو اس طرح ہو تو دوستی پھر کمال کی ہو

ہجومِ اہلِ ستم ستادہ تھا جب وہ گزرا
مگر کسی نے جو عرضِ غم کی مجال کی ہو

کوئی تو ایسا ہو جس پر اس کا گماں گزرے
کہیں کہیں تو مشابہت خدّ و خال کی ہو

وہ چند سانسوں کے واسطے کیوں اَنا کو بیچے
کہ عمر بھر جس نے زندگی پائمال کی ہو

میری زمیں پستیوں سے مجھ کو پکارتی ہے
کوئی بشارت مرے خُدا اب زوال کی ہو

ہے کون اپنی طرح کہ جس نے غمِ جہاں کے
ستم بھی جھیلے ہوں عاشقی بھی کمال کی ہو

غزل کہی تو لہو بدن سے نچڑ گیا ہے
کہ جیسے صحرائے مرگ وادی خیال کی ہو

فرازؔ زندہ ہوں اب تلک میں تو شدّتوں سے
کہ مر نہ جاؤں جو زندگی اعتدال کی ہو

○

اوّل اوّل کی دوستی ہے ابھی
اِک غزل ہے کہ ہو رہی ہے ابھی

میں بھی شہرِ وفا میں نو وارد
وہ بھی رُک رُک کے چل رہی ہے ابھی

میں بھی ایسا کہاں کا زود شناس
وہ بھی لگتا ہے سوچتی ہے ابھی

دل کی وارفتگی ہے اپنی جگہ
پھر بھی کچھ احتیاط سی ہے ابھی

گرچہ پہلا سا اجتناب نہیں
پھر بھی کم کم سپردگی ہے ابھی

کیسا موسم ہے کچھ نہیں کھلتا
بوندا باندی بھی دھوپ بھی ہے ابھی

خود کلامی میں کب یہ نشّہ تھا
جس طرح رُوبرو کوئی ہے ابھی

قربتیں لاکھ خوبصورت ہوں
دُوریوں میں بھی دلکشی ہے ابھی

فصلِ گل میں بہار پہلا گلاب
کس کی زُلفوں میں ٹانکتی ہے ابھی

صبحِ نارنج کے شگوفوں کی
کس کو سوغات بھیجتی ہے ابھی

رات کس ماہ وش کی چاہت میں
شبنمستاں سجا رہی ہے ابھی

میں بھی کس وادیٔ خیال میں تھا
برف سی دل پہ گر رہی ہے ابھی

میں تو سمجھا تھا بھر چکے سبھی زخم
داغ شاید کوئی کوئی ہے ابھی

دُور دیسوں سے کالے کوسوں سے
کوئی آواز آ رہی ہے ابھی

زندگی کوئے نامرادی ہے
کس کو مُڑ مُڑ کے دیکھتی ہے ابھی

اس قدر کھنچ گئی ہے جاں کی کماں
ایسا لگتا ہے ٹوٹتی ہے ابھی

ایسا لگتا ہے خلوتِ جاں میں
وہ جو اک شخص تھا وہی ہے ابھی

مدّتیں ہوگئیں فراز مگر
وہ جو دیوانگی کہ تھی ہے ابھی

○

جب سب کے دلوں میں گھر کرے تو
پھر کیوں ہمیں در بدر کرے تو

یہ حال ہے شام سے تو اے دل
مشکل ہے کہ اب سحر کرے تو

آنکھوں میں نشان تک نہ چھوڑے
خوابوں کی طرح سفر کرے تو

اِتنا بھی گریز اہلِ دل سے
کوئی نہ کرے مگر کرے تو

خوشبو ہو کہ نغمہ ہو کہ تارا
ہر ایک کو نامہ بر کرے تو

جب تو نہیں اس کا آشنا تک
کیوں ظلم فرازؔ پر کرے تو

○

اندھیرا ہے تو تہمت شام پر نئیں
وہ میرا آتشیں رُخ بام پر نئیں

بہت سے ہمنوایانِ چمن نے
نظر دانے پہ رکھی دام پر نئیں

ہمیشہ سے وفا کارِ زیاں ہے
مگر اپنی نظر انجام پر نئیں

کبھی ایسی نہ تھی لیلائے فرقت
کوئی تارا قبائے شام پر نئیں

ہماری تشنگی کا حال دیکھو
نظر ساقی پہ ہے لب جام پر نئیں

محبّت زندگی بھر کا سفر ہے
کوئی منزل یہاں دو گام پر نئیں

یہ دل مائل ہے اِک سادہ ادا پر
کسی مہوش کسی گلفام پر نئیں

خدا وہ دن نہ دکھلائے کہ دیکھیں
یہ بستی اب ہمارے نام پر نئیں

دوکانِ مے فروشاں میں مقدّم
شکستِ دل شکستِ جام پر نئیں

بیادِ فیض

قلم بدست ہوں حیران ہوں کہ کیا لکھوں
میں تیری بات کہ دُنیا کا تذکرہ لکھوں

لکھوں کہ تُو نے محبّت کی روشنی لکھی
ترے سخن کو ستاروں کا قافلہ لکھوں

جہاں یزید بہت ہوں حسینؓ اکیلا ہو
تو کیوں نہ اپنی زمیں کو بھی کربلا لکھوں

ترے بغیر ہے ہر نقش "نقشِ فریادی"
تو پھول دستِ صبا پر ہے آبلہ لکھوں

مثالِ دستِ تہہِ سنگ تھی وفا ان کی
سو کس طرح انھیں یارانِ باصفا لکھوں

حدیثِ کوچۂ قاتل ہے نامۂ زنداں
سو اس کو قصّۂ تعزیرِ ناروا لکھوں

جگہ جگہ ہیں "صلیبیں مرے دریچے میں"
سو اسمِ عیسیٰ و منصور جا بجا لکھوں

گرفتہ دل ہے بہت شامِ شہرِ یاراں آج
کہاں ہے تُو کہ تجھے حالِ دلبرا لکھوں

کہاں گیا ہے "مرے دل مرے مُسافر" تو
کہ میں تجھے رہ و منزل کا ماجرا لکھوں

تُو مجھ کو چھوڑ گیا لکھ کے نسخۂ ہائے وفا
میں کس طرح تجھے اے دوست بے وفا لکھوں

"شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں"
خدانکردہ کہ میں تیرا مرثیہ لکھوں

○

اب وہ منظر نہ وہ چہرے ہی نظر آتے ہیں
مجھ کو معلوم نہ تھا خواب بھی مر جاتے ہیں

جانے کس حال میں ہم ہیں کہ ہمیں دیکھ کے سب
ایک پل کے لیے رُکتے ہیں گزر جاتے ہیں

ساقیا تو نے تو میخانے کا یہ حال کیا
رند اب محتسبِ شہر کے گُن گاتے ہیں

طعنۂ نشّہ نہ دو سب کو کہ کچھ سوختہ جاں
شدّتِ تشنہ لبی سے بھی بہک جاتے ہیں

جیسے تجدیدِ تعلّق کی بھی رُت ہو کوئی
زخم بھرتے ہیں تو غمخوار بھی آجاتے ہیں

احتیاط اہلِ محبّت کہ اسی شہر میں لوگ
گُل بدست آتے ہیں اور پابہ رَسن جاتے ہیں

سنگ دل ہے وہ تو کیوں اس کا گلہ میں نے کیا
جبکہ خود پتھر کو بُت بُت کو خدا میں نے کیا

کیسے نامانوس لفظوں کی کہانی تھا وہ شخص
اس کو کتنی مشکلوں سے ترجمہ میں نے کیا

وہ مری پہلی محبّت وہ مری پہلی شکست
پھر تو پیمانِ وفا سو مرتبہ میں نے کیا

٦١٧٠

ہوں سزاوارِ سزا کیوں جب مقدّر میں مرے
جو بھی اس جانِ جہاں نے لکھ دیا میں نے کیا

وہ ٹھہرتا کیا کہ گزرا تک نہیں جس کے لیے
گھر تو گھر ہر راستہ آراستہ میں نے کیا

مجھ پہ اپنا جرم ثابت ہو نہ ہو لیکن فرازؔ
لوگ کہتے ہیں کہ اس کو بے وفا میں نے کیا

پردیس میں جاتے سال کی آخری رات

جاتے سال کی آخری شب ہے
چہل چراغ کی روشنیوں سے
بادہ گلگوں کی رنگت سے
جگر جگر کرتے پیمانے
جیسے جاتے سال کی گھڑیاں
پون سے دیپ کی آخری قربت
جیسے دید کی آخری ساعت
جلتی بجھتی سی پھلجھڑیاں

آؤ آخری رات ہے سال کی
دل کہتا ہے شوق وصال کی
سب شمعیں ساری خوشبوئیں
تن من میں رس بس جانے دو
دیکھو آج کی رات ستارے
گُم سُم ہیں آکاش کنارے
جاگ رہے ہیں سوچ رہے ہیں
جاتے سال کی آخری شب ہے
کل کا سورج کیسا ہوگا

○

گِلہ فضول تھا عہدِ وفا کے ہوتے ہوئے
سو چُپ رہا ستمِ ناروا کے ہوتے ہوئے

یہ قُربتوں میں عجب فاصلے پڑے کہ مجھے
ہے آشنا کی طلب آشنا کے ہوتے ہوئے

وہ حیلہ گر ہیں جو مجبوریاں شمار کریں
چراغ ہم نے جلائے ہوا کے ہوتے ہوئے

نہ چاہنے پہ بھی تجھ کو خُدا سے مانگ لیا
یہ حال ہے دلِ بے مدّعا کے ہوتے ہوئے

نہ کر کسی پہ بھروسا کہ کشتیاں ڈوبیں
خُدا کے ہوتے ہوئے ناخُدا کے ہوتے ہوئے

مگر یہ اہلِ ریا کس قدر برہنہ ہیں
گلیم و دلق و عبا و قبا کے ہوتے ہوئے

کسے خبر ہے کہ کاسہ بدست پھرتے ہیں
بہت سے لوگ سروں پر ہُما کے ہوتے ہوئے

فرازؔ ایسے بھی لمحے کبھی کبھی آئے
کہ دل گرفتہ رہے دلرُبا کے ہوتے ہوئے

○

شام اور قریۂ ملال کی شام
تارا تارا ہوئی خیال کی شام

پھر وہی دردِ انتظار کی آگ
پھر وہی وعدۂ وصال کی شام

یادِ یارانِ زود رنج کے زخم
پُرسشِ حال واندمال کی شام

تُو نہ دیکھے مرے جنوں کا زوال
میں نہ دیکھوں ترے جمال کی شام

ایک تیمار دار کیا آیا
مہک اُٹھی ہے ہسپتال کی شام

اے خدا کوئی صبحِ آسودہ
اے خدا کوئی اعتدال کی شام

بھولتی ہی نہیں فراز مجھے
اس کے آنے کے احتمال کی شام

ابو جہاد

ابو جہاد میرا دل لہو لہو ہے مگر
معاف کر کہ ترے دشمنوں کے ساتھ ہیں ہم
ترا جنوں ترا ایثار محترم لیکن
جو سچ کہوں تو ترے قاتلوں کے ساتھ ہیں ہم

ہمیں تو ہیں وہ ستمگر کہ مصلحت جن کی
درازدستیٔ قاتل کا دل بڑھاتی ہے
ہم اس قبیلۂ عشاق سے نہیں کہ جنہیں
ندیمِ دوست سے خوشبوئے دوست آتی ہے

جو تیرے دل میں تپکتا تھا آبلے کی طرح
وہی تو دُکھ ہے جو چھالا مری زباں کا ہے
ہم اک سناں کے ہدف ایک تیر کے بسمل
اگر ہے فرق تو بس ہاتھ یا کماں کا ہے

تو دشتِ بے وطنی میں لہو لہان ہوا
ہم اپنے گھر میں ہی سینہ فگار پھرتے ہیں
غلام گردشِ زنداں سے صحنِ مقتل تک
ابھی رسن بہ گلو میرے یار پھرتے ہیں

وہ جس نے خوں اُچھالا ترے شہیدوں کا
اسی کی تیغ ہمارے سروں پہ چمکی ہے
وہی تو ایک ہے جلاد جس کے ہاتھوں نے
ہر اک چراغ سے چہرے کی لو قلم کی ہے

ابو جہاد ہمارا جہاد ایک سا ہے
وہ سرزمین تری ہو کہ سرزمین میری
رہِ وفا میں ترا خوں بہے کہ میرا لہو
دریدہ ہو تیرا دامن کہ آستیں میری

چلیں گے ساتھ رفاقت کے پرچموں کو لیے
جہاں جہاں سے بھی ساتھی ہمیں پکاریں گے
اگر ہے دشنہ و خنجر زبان قاتل کی
تو ہم بھی حرفِ وفا کی زرہ سنواریں گے

لگی ہے آگ پر کوئی بھی گھر نہیں
ابھی تک جلنے والوں کو خبر نہیں

عجب نقشہ ہے شہرِ بے اماں کا
کسی کا سر کسی کے دوش پر نہیں

یہ بیگانہ روی ہے ہمرہوں میں
مسافر کو مسافر کی خبر نہیں

ہَوا کی سلطنت میں کیا بھروسا
چراغِ جاں اُدھر ہے اور اِدھر نہیں

پرندوں کو رہائی مل چُکی ہے
اگر ہو جرأتِ پرواز پر نہیں

○

کوئی احسان چشمِ یار پر نہیں
ہم اس کے ہیں مگر اس کو خبر نہیں

عجب نشّہ ہے مستانہ روی میں
خیالِ منزل و زادِ سفر نہیں

محبّت اپنا اپنا تجربہ ہے
یہاں فرہاد و مجنوں معتبر نہیں

بہت سے خُوبصورت لوگ دیکھے
مگر ایسا ہے تجھ کو دیکھ کر نئیں

فرازؔ اس کی گلی سے پھر نہ آیا
وہ دیوانہ سہی پر در بدر نئیں

○

نہ سہہ سکا جب مسافتوں کے عذاب سارے
تو کر گئے کُوچ میری آنکھوں سے خواب سارے

بیاضِ دل پر غزل کی صُورت رقم کیے ہیں
ترے کرم بھی ترے ستم بھی حساب سارے

بہار آئی ہے تم بھی آؤ اِدھر سے گزرو
کہ دیکھنا چاہتے ہیں تم کو گلاب سارے

یہ سانحہ ہے کہ واعظوں سے اُلجھ پڑے ہم
یہ واقعہ ہے کہ پی رہا ہے تھے شراب سارے

بھلا ہوا ہم گنہگاروں نے ضد نہیں کی
سمیٹ کر لے گیا ہے ناصح ثواب سارے

فراز کس نے مرے مقدّر میں لکھ دیے ہیں
بس ایک دریا کی دوستی میں سراب سارے

○

اماں مانگو نہ ان سے دلفگاراں ہم نہ کہتے تھے
غنیمِ شہر ہیں چابک سواراں ہم نہ کہتے تھے

خزاں نے تو فقط ملبوس چھینے تھے درختوں سے
صلیبیں بھی تراشے گی بہاراں ہم نہ کہتے تھے

ترس جائیں گی ہم سے بے نواؤں کو تری گلیاں
ہمارے بعد اے شہرِ نگاراں ہم نہ کہتے تھے

جہاں میلہ لگا ہے ناصحوں کا غمگساروں کا
وہی ہے کوچۂ بے اعتباراں ہم نہ کہتے تھے

پسِ زنداں کوئی ہوگا سرِ مقتل کوئی ہوگا
بنے گی اس طرح تصویرِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

فرازؔ اہلِ ہوس نے شہرِ دشمن ہم کو ٹھہرایا
خطا یہ تھی کہ مدحِ شہرِ یاراں ہم نہ کہتے تھے

○

کل رات ہم سخن کوئی بت تھا خدا کہ مَیں
میں سوچ ہی رہا تھا کہ دل نے کہا کہ میں

تھا کون جو گرہ پہ گرہ ڈالتا رہا
اب یہ بتا کہ عقدہ کشا تُو ہوا کہ میں

جب سارا شہر برف کے پیراہنوں میں تھا
ان موسموں میں لوگ تھے شعلہ قبا کہ میں

جب دوست اپنے اپنے چراغوں کے غم میں تھے
تب آندھیوں کی زد پہ کوئی اور تھا کہ میں

جب فصلِ گُل میں فکرِ رفو اہلِ دل کو تھی
اس رُت میں بھی دریدہ جگر تُو رہا کہ میں

کل جب رُکے گا بازوئے قاتل تو دیکھنا
اے اہلِ شہر تم تھے شہیدِ وفا کہ میں

کل جب تھمے گی خُون کی بارش تو سوچنا
تم تھے عدو کی صف میں سرِ کربلا کہ میں

○

پیشہ ور گواہوں کی اور بھی مثالیں تھیں
مجھ کو قتل کرنے میں منصفوں کی چالیں تھیں

آدھی رات بستی میں نقب زن جب آئے تھے
جھانجھریں تھیں پاؤں میں ہاتھ میں کدالیں تھیں

سادہ دل تماشائی پھر فریب کھا بیٹھے
بھیڑیوں کے جسموں پہ ہرنیوں کی کھالیں تھیں

کچھ درخت ایسے تھے فصلِ گُل میں بھی جن پر
زرد زرد پتّے تھے خشک خشک چھالیں تھیں

اپنا دار پر کھنچنا کیوں لگا عجب سب کو
کشتگانِ شب کی تو اَن گنت مثالیں تھیں

خونِ بے گناہاں کو جب بھی بیچ کر آئے
دوستوں کے شانوں پر زرنگار شالیں تھیں

○

بہت سیرِ گل اے صبا کر چلے
یہاں تک کہ دل کو قبا کر چلے

وہ تیری گلی تھی کہ شہرِ عدو
جدھر بھی گئے سر اُٹھا کر چلے

جو احوال اپنا ہُوا سو ہُوا
عبث دوستوں کو خفا کر چلے

یہ محفل تری اہلِ محفل ترے
ہمارا تھا کیا ہم تو آکر چلے

یہ کیا آج چارہ گروں کو ہوا
دوا کی بجائے دُعا کر چلے

نوا سنج سارا قفس ہے فراز
یہاں تک تو ہم بے نوا کر چلے

○

جو حرفِ حق تھا وہی جا بجا کہا سو کہا
بلا سے شہر میں میرا لہو بہا سو بہا

ہمیں کو اہلِ جہاں سے تھا اختلاف سو ہے
ہمیں نے اہلِ جہاں کا ستم سہا سو سہا

جسے جسے نہیں چاہا اُسے اُسے چاہا
جہاں جہاں بھی مرا دل نہیں رہا سو رہا

نہ دوسروں سے ندامت نہ خود سے شرمندہ
کہ جو گیا سو گیا اور جو کہا سو کہا

یہ دیکھ تجھ سے وفا کی کہ بے وفائی کی
چلو میں اور کہیں مبتلا رہا سو رہا

تیرے نصیب اگر جا لگے کنارے سے
وگرنہ سیلِ زمانہ میں جو بہا سو بہا

شکست و فتح مرا مسئلہ نہیں ہے فرازؔ
میں زندگی سے نبرد آزما رہا سو رہا

ہیچ ہائیکو

میں کہ دو روز کا مہمان ترے شہر میں تھا
اب چلا ہوں تو کوئی فیصلہ کر بھی نہ سکوں
زندگی کی یہ گھڑی ٹوٹتا پل ہو جیسے
کہ ٹھہر بھی نہ سکوں اور گزر بھی نہ سکوں

مہرباں ہیں تری آنکھیں مگر اے مونسِ جاں
ان سے ہر زخمِ تمنّا تو نہیں بھر سکتا
ایسی بے نام مسافت ہو تو منزل کیسی
کوئی بستی ہو بسیرا ہی نہیں کر سکتا

ایک مدّت ہوئی لیلائے وطن سے بچھڑے
اب بھی رِستے ہیں مگر زخم پرانے میرے
جب سے صرصر مرے گلشن میں چلی ہے تب سے
برگِ آوارہ کی مانند ٹھکانے میرے

آج اِس شہر کل اُس شہر کا رستہ لینا
"ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے"
یہ سفر اتنا مسلسل ہے کہ تھک ہار کے بھی
"بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے"

تُو بھی ایسا ہی دل آرام شجر ہے جس نے
مجھ کو اس دشتِ قیامت سے بچائے رکھا
ایک آشفتہ سر و آبلہ پا کی خاطر
کبھی زُلفوں کبھی پلکوں کو بچھائے رکھا

دُکھ تو ہر وقت تعاقب میں رہا کرتے ہیں
یوں پناہوں میں کہاں تک کوئی رہ سکتا ہے
کب تلک ریت کی دیوار سنبھالے کوئی
وہ تھکن ہے کہ میرا جسم بھی ڈھ سکتا ہے

اجنبی لوگ نئے لوگ پرائی گلیاں
زندگی ایسے قرائن میں کٹے گی کیسے
تیری چاہت بھی مقدّس تیری قربت بھی بہشت
دیس پردیس کی تفریق گھٹے گی کیسے

ناگزیر آج ہوا جیسے بچھڑنا اپنا
کل کسی روز ملاقات بھی امکان میں ہے

میں یہ پیراہنِ جاں کیسے بدل سکتا ہوں
کہ تیرا ہاتھ مرے دل کے گریباں میں ہے

کتابخانہ / محمد ہارون موسیٰ

۱۲۰۲

۱۲۰۷